”چہارسُو“

۔۔۔ رومی کون۔؟ ۔۔۔

عبداللہ جاوید یوسف زئی (ولادت غازی آباد۔یوپی 16 دسمبر 1931) نے انگریزی،امریکی اور اردوادب میں ایم اے کرنے کے بعد ایل ایل بی کیا اور یوں وکالت اور تدریس سے وابستہ ہوئے۔ان کی قلمی زندگی اور کالم نگاری کا سلسلہ 1942۔43 سے شروع ہوا۔بیاد اقبال (1969)،تین شعری مجموعے،موج صد رنگ،خواب سماں (1969،2003اور2006) اور افسانوی مجموعہ بھاگتے لمحے (2010) میں شائع ہوئے مگر میرے اور میرے طالب علموں کے لئے ان کے رفیق مطالعہ A Companion to the study سلسلے کی چار کتابیں بہت اہم تھیں:

1۔مت سہل ہمیں جانو (آیئے میر پڑھیے۔2014)

2۔آگ کا دریا ایک مطالعہ۔2016

3۔تنہائی کے سو سال۔ایک مطالعہ 2019

4۔دی جوک ایک مطالعہ 2020

جب کہ رومی کون۔؟ وہ ترتیب دے چکے تھے جب کہ ان کی وفات ہوگئی۔ان کی دل گیر بیوہ شہناز خانم عابدی نے اسے حسب سابق حسن طباعت کے ساتھ مبین مرزا کے ادارے اکادمی بازیافت سے شائع کرایا ہے۔(شہناز خانم عابدی افسانہ نگار ہیں اور مسی ساگا اونتاریو کینیڈا میں مقیم ہیں)۔عبداللہ جاوید کی اس سلسلے کی دیگر کتب کی طرح اس کتاب میں بھی چار خوبیاں تو عیاں ہیں۔

1۔وہ پہلے ماخذات کا تعین کر کے اچھی کتابیات بناتے ہیں۔

2۔علم، ٹیکنالوجی اور اپنی خوش حالی کی بدولت مطلوبہ کتب/ ویب گاہوں تک پہنچتے ہیں۔

3۔ان کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔

4۔وہ انسانیت کو عالم گیر مذہب خیال کرتے ہیں۔

البتہ دو ایک کمزوریاں بھی ہیں۔ا) حکم لگانے یا قطعیت سے گریز کرتے ہیں ب) تھوڑے مواد کو کتاب کی صورت دینے میں تکرار کو بھی روا جانتے ہیں۔ج) عربی، فارسی، سنسکرت حتی کہ ترکی زبان سے آپ واقف بھی ہوں تو کچھ مشاورت/ رہنمائی کی عمر کے ہر مرحلے میں ضرورت ہوتی ہے۔مثال کے طور پر وہ پاکستان میں ہی مقیم ترک سکالروں یا انقرہ،قونیہ یا استنبول یونیورسٹی کے استادوں سے مشاورت کر لیتے تو وہ انہیں بتا دیتے کہ جسے وہ اس شاندار کتاب میں جگہ جگہ "ترک محقق سیہان اوکیوکو" لکھ رہے ہیں رومن میں اس نام کو cihan okycu کو پڑھ کے وہ جیہان اوکیوجو ہے کہ ترکی زبان میں c کا کلمہ ج کی آواز دیتا ہے۔تاہم عبداللہ جاوید،شہناز خانم عابدی کی رفاقت قابل رشک رہی ہے۔اس کتاب سے چند اقتباسات دینا چاہوں گا

"یونیسکو نے کثرت رائے اور قبول عام کی رو سے حضرت رومی کی ولادت 30 ستمبر 1207 قرار دی ہے"

"جس وقت 17 دسمبر 1273 کا آفتاب ڈوب رہا تھا،رومی رخصت ہوگئے،رومی کی بلی نے کھانا پینا چھوڑا،ایک ہفتے میں مرگئی اور رومی کی بیٹی نے اسے رومی کے پاس ہی دفن کر دیا"

"نادار طلبہ کی عزت نفس مجروح کئے بغیر ان کی خفیہ مدد کرتے تھے،رومی نے نچلے طبقے سے ربط کو اپنی شان کے خلاف سمجھا اور نہ ہی مقتدر طبقے کے افراد سے تعلقات پر نازاں ہوئے"

"افلاکی کے مطابق ان کی دوسری اہلیہ قرا خانم رومی کے رات دیر تک شمعیں جلا کر پڑھنے سے خوف زدہ رہتی تھی کہ مبادا جن ناراض ہو کر گھر اور گھر کے لوگوں کو کوئی گزند پہنچائیں،رومی نے ان کو اطلاع دی کہ جن مجھ سے راضی ہوگئے ہیں اور ان میں سے چند نے مریدی اختیار کر لی ہے"۔

اس کتاب میں جہاں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دیوان شمس دراصل رومی کی تصنیف ہے وہاں ان میں سے بعض غزلیات کا ترجمہ دیا گیا ہے،مثنوی کے بعض اشعار کا بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رومی پر عالمانہ انداز سے قلم اٹھانے والوں (این میری شمل،قاضی سجاد حسین،شبلی نعمانی،شمس الدین افلاکی،افضل اقبال اور دیگر اہل علم) کی کتب سے طویل اقتباسات دے دیئے گئے ہیں بلکہ رومی پر لکھے گئے احمت امیت (احمد امید) کے ناول کا تفصیلی تعارف بھی موجود ہے۔

۔۔۔ ڈاکٹر انوار احمد

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۳۳،شمارہ:مئی،جون ۲۰۲۴ء

بانی مدیراعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئین چہارسُو

○☆○

زرِسالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیرمسؤل

گلزار جاوید

○☆○

مدیرانِ معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

آمنہ علی

رابطہ: 1-537/D، گلی نمبر 18، ویسٹریج-III، راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون: 8730433-8730633-51-(92+)

موبائل: 0558618-336-(92+)

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

متاعِ چہارسو

سرِورق، پسِ ورق ـــــــ شعیب حیدر زیدی

تزئین ـــــــ عظمیٰ رشید

کمپوزنگ ـــــــ تنویرالحق

قرطاسِ اعزاز ۵

صحیفۂ ارض ـــــــ نوید صابر ۶

عکسی منظرنامہ ۷

مسلک انبیاء ـــــــ شاہد انوار ۸

براہِ راست ـــــــ گلزار جاوید ۱۲

نیزے پہ ابھرا چاند ـــــــ عطیہ سکندر علی ۱۹

میتھوں رب عبادت منگدا ـــــــ امرتا پریتم ۲۳

خود کو دیکھنے کی آرزو ـــــــ سجاد باقر ۲۴

آنکھیں، چہرہ، ہاتھ ـــــــ جیلانی کامران ۲۶

سونی راتوں سے ڈر لگتا ہے ـــــــ میرزا ادیب ۲۸

گنبدِ خوف سے بشارت ـــــــ فتح محمد ملک ۳۰

خاکِ بے نوا ـــــــ جمیل یوسف ۳۴

نذیر قیصر کی شاعری کا موسم ـــــــ منصور آفاق ۳۷

طاق شب میں چراغ ـــــــ عاصی کرنالی ۳۸

بیل بُوٹوں سے لکھی حمد ـــــــ محمد حمید شاہد ۴۰

دہلیز پہ رکھے پھول ـــــــ سعود عثمانی ۴۲

جگراتے دا بھیت ـــــــ محمد انعام الحق ۴۴

محبتوں کے گلاب ـــــــ فاری شا ۴۸

عکسی منظرنامہ ۵۲

دردکا درماں

نجیبہ عارف، نسیم سحر۔ ۵۳

افسانے

روشنی کا تعاقب ـــــــ رضیہ اسماعیل ۵۴

کوئی نام نہ دو ـــــــ مشتاق اعظمی ۵۸

ضد رہی نہ سرکشی ـــــــ تسنیم کوثر ۶۰

ایک دلت کہانی ـــــــ پرویز شہریار ۶۲

ضبطِ غم

فنا کانپوری، ولی عالم شاہین، ارشد انصاری، آفتاب مضطر، مشتاق اعظمی، سہیل اقبال، رؤف خیر، ڈاکٹر ریاض احمد، ارشد سعید، نبیل احمد نبیل۔ ۶۴

افسانے

ایک چراغ ـــــــ رینو بہل ۶۹

آنسو ـــــــ تابش خانزادہ ۷۲

گلشن کور ـــــــ دیوی ناگرانی ۷۳

یادوں کے گھاؤ ـــــــ شیخ بشیر احمد ۷۶

برگ وثمر

سلیم سرفراز، عظیم بخت، فیصل امام رضوی، کومل جوئیہ، ثاقب ہارون، عنبر، عمران راقم، انیس الرحمٰن، اسلام عظمی، اکمل شاکر، مادھو کوشک، عزیز عادل، محبوب اصغر، سبھاش گپتا شفیق، علی شاہد دلکش۔ ۷۹

ناول

خاکِ شفا ـــــــ پیرزادہ آلِ انوار ۸۴

اُفق کے اُس پار

دیارِ مصر ـــــــ رعنا کوثر ۹۳

خوشبو کا آنگن

خان حسنین عاقب، ڈاکٹر جواز جعفری، آفتاب مضطر، انیس الرحمٰن، دیبا سلام، نغمہ صبوحی، قاضی شجیع اچلپوری، حبیب بنارسی، واصف فاروقی، نوید سروش۔ ۹۸

آئینۂ فن

زہریلا انسان ـــــــ نسیم سحر ۱۰۳

نشانِ راہ

برف کا نور محمد؟ ـــــــ آغا گل ۱۰۸

ارتحال

زیست پر کیا بنی خدا جانے ـــــــ محمد اصغر یزدانی ۱۰۹

ایک صدی کا قصہ

امیتابھ بچن ـــــــ دیپک کنول ۱۱۱

بساطِ بشاشت

موبائل کا رتبہ ـــــــ خالد عرفان ۱۱۶

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین ـــــــ وجیہہ الوقار ۱۱۷

میں خاکِ بے نوا تھا مگر میرے ہاتھ نے
کھولا علم فضاؤں میں حرف وبیان کا

قرطاسِ اعزاز
نذیر قیصر
کے نام

صحیفۂ ارض
نوید صابر
(راولپنڈی)

نام:
نذیر قیصر

والد:
عزیز قیصر

پیدائش:
۵۔جنوری ۱۹۴۵ء

کتب:

۱۔ آنکھیں، چہرہ، ہاتھ	اردو شاعری	۱۹۶۸ء
۲۔ زیتون دی پتی	پنجابی شاعری	۱۹۷۸ء
۳۔ تیسری دنیا	منظوم	۱۹۷۹ء
۴۔ گنبد خوف سے بشارت	اردو شاعری	۱۹۸۴ء
۵۔ اے ہوا مو ذن ہو	مجموعہ نعت	۱۹۹۲ء
۶۔ اے شام ہم سخن ہو	اردو شاعری	۱۹۹۳ء
۷۔ ہرے کرشنا	منظوم	۱۹۹۴ء
۸۔ تمہارے شہر کا موسم	اردو شاعری	۲۰۰۵ء
۹۔ قسم فجر دے تارے دی	پنجابی شاعری	۱۹۸۴ء
۱۰۔ نائے شاد کے گیت	گیت	۱۹۸۴ء
۱۱۔ رجحانات	مضامین	۱۹۷۶ء
۱۲۔ بھٹو اور اقوام عالم	سیاسی تجزیہ	۱۹۷۶ء
۱۳۔ محبت میرا موسم ہے	اردو شاعری	۲۰۱۳ء

ایوارڈز:

۱۔ راوی سے میگھنا تک ایوارڈ برائے طویل ڈرامائی نظم	۱۹۷۱ء
۲۔ آدم جی ایوارڈ	۱۹۷۸ء
۳۔ پاکستان نیشنل کلچرل ایوارڈ	۱۹۸۴ء
۴۔ فوک لٹریچر ایوارڈ	۲۰۰۲ء
۵۔ مسعود کھدر پوش ایوارڈ	۲۰۰۵ء
۶۔ بابا گورونانک ایوارڈ	۲۰۱۴ء
۷۔ نیشنل ہیومن رائٹس ایوارڈ، حکومت پاکستان	۲۰۱۶ء
۸۔ پرائڈ آف پرفارمنس تمغۂ حسن کارکردگی (صدارتی ایوارڈ)	۲۰۲۳ء
۹۔ یورپین پیس ایوارڈ (امن ایوارڈ)	

کالم نگاری:

ہفتہ وار لعل و نہار	''سو ہے وہ بھی آدمی''
روزنامہ مساوات	''ساتواں در''
روزنامہ وقت	''پسِ غبار''
ہم سخن لندن/ لاہور	''گفتگو''
روزنامہ آفتاب، کوئٹہ	''بغیر اجازت''
ماہنامہ ''تلاش''، فیصل آباد	''نذیر قیصر'' خصوصی نمبر ۱۹۸۳ء
ماہنامہ ''نئی دنیا''	لیونگ لیجنڈ نذیر قیصر، ۱۹۹۲ء

ایم فل:

۱۔	''نذیر قیصر کی شعری جہات'' سلطانہ بتول نقوی، سرگودھا یونیورسٹی۔	۲۰۰۵ء
۲۔	''نذیر قیصر کی شاعری میں عناصر فطرت'' وقاص جمیل، منہاج یونیورسٹی۔	۲۰۱۵ء
۳۔	''نذیر قیصر فن اور شخصیت'' صالحہ صدیق، نارتھ یونیورسٹی۔	۲۰۱۷ء
۴۔	''نذیر قیصر کی شاعری پر بائبل کے اثرات'' یوحنا جان، ایف سی یونیورسٹی۔	۲۰۲۳ء

زیرِ طبع:

لیونگ لیجنڈ نذیر قیصر	مرتب۔جیم فے غوری
نذیر قیصر ''شخصیت و فن''	اسد عباس خان

اختصاص:
اُن گنت فلموں کے گیت لکھے اور دو سال فلم سنسر بورڈ کے ممبر بھی رہے۔

اضافی نمبر

طالب علمی کے زمانے میں اردو کے پرچے میں لفظ ''شدہ'' سے چار الگ الگ جملے بنانے کو کہا گیا۔ میں نے جواب میں لکھا:

''شادی شدہ، گم شدہ، ختم شدہ، تباہ شدہ''

اگلے روز استادِ محترم نے پرچے چیک کر کے واپس دیئے تو مجھے لاحقوں والے سوال میں چار میں سے آٹھ نمبر دیئے گئے۔

میں نے استاد صاحب سے اضافی نمبروں سے متعلق پوچھا تو مسکرا کر بولے:

''پتر، چار نمبر صحیح جواب کے اور چار صحیح ترتیب کے''

۔ مشتاق یوسفی ۔

PAKISTAN WOMEN
CONFERENCE 1995
Saviours

Saviours

Saviours

''مسلکِ انبیاء''

تحرک: شاہدانوار (کراچی)

صحیفہ ہے زمیں رنگ و صبا کا — کوئی مذہب نہیں میرے خدا کا
محبت آیتِ لوحِ ابد ہے — یہی مسلک رہا ہے انبیاء کا
اُترتے ہیں پرندے بادباں پر — کھلا ہے پھول پانی میں دعا کا
لپٹتی ہیں جو بیلیں بام و در سے — نوشتہ ہے کوئی ارض و سماء کا
جہاں کے ہاتھ میں آیا ہوا ہے — کوئی ٹکڑا تری رنگیں قبا کا
پلٹ جاتی ہے دستک دے کے دنیا — میں دروازہ ہوں خوابیدہ سرا کا
جدا ہونا کسی کا صبحِ رخصت — لپٹ جانا چراغوں سے ہوا کا
اشارہ ہے کسی ہجرت کا قیصر — ستارہ ہے کسی کے نقشِ پا کا

..... ○ .....

☆

پانی پڑا ہوا کہیں دانے پڑے ہوئے
مٹی کے برتنوں میں خزانے پڑے ہوئے
یہ شہر سو رہا ہے پرندوں کے شور میں
اس شہر میں ہیں خواب پرانے پڑے ہوئے
ٹھہرا ہوا ہے چاند ترے انتظار میں
کچھ پھول کھل رہے ہیں سرہانے پڑے ہوئے
خالی پڑا ہوا ہے محل سو کنال کا
ٹیبل پہ سو طرح کے ہیں کھانے پڑے ہوئے
فٹ پاتھ پر پرانی کتابیں پڑی ہوئیں
پیروں میں آنے والے زمانے پڑے ہوئے
بکھرے ہیں فاختاؤں کے پَر جلتی دُھول میں
ٹینکوں کی راکھ میں ہیں ترانے پڑے ہوئے
برسوں کے بعد ایک حویلی کے در کھلے
روشن ہوئے چراغ پرانے پڑے ہوئے
مفلس نہیں ہوا میں ابھی میری جیب میں
غزلیں پڑی ہوئی ہیں فسانے پڑے ہوئے
قیصر وہ خوش نصیب ہوں میں جس کی میز پر
غالب پڑے ہوئے ہیں لگانے پڑے ہوئے

☆

زمیں کا چاک گھماتی غبار اُڑاتی ہوئی
کشیدہ کار ہوا صورتیں بناتی ہوئی
ہمارے ساتھ چراغوں کا دل دھڑکتا ہوا
ہمارے ساتھ ستاروں کو نیند آتی ہوئی
مہکتے باغوں میں بارش کے بعد دن نکلا
درخت بھیگے ہوئے دھوپ مسکراتی ہوئی
کسی کنارے پیالہ لیے کھڑا ہوا میں
کسی کنارے وہ سورج کا منہ دھلاتی ہوئی
پھوار پڑنے لگی بانس کے درختوں پر
ہوا بھی چلنے لگی بانسری بجاتی ہوئی
ہوا میں چاند کا سکہ اچھالتا ہوا میں
وہ اپنی لہر میں دریا کا گیت گاتی ہوئی
میں اُس کی آنکھوں میں جلتا ہوا پگھلتا ہوا
وہ سو نہ جائے مجھے لوریاں سناتی ہوئی
کھڑا تھا آخری زینے پہ کوئی شہزادہ
کنیز آئی دِیے سے دیا جلاتی ہوئی
میں اک چراغ کسی غار میں بجھایا ہوا
وہ میری سمت ستاروں پہ چل کے آتی ہوئی

صبح جب سیڑھیاں اُترتی ہے
وہ مجھے پھول پیش کرتی ہے
کچے کوٹھوں کے دل دھڑکتے ہیں
ریل کھیتوں سے بھی گزرتی ہے
گرم موسم میں بارشوں کی طرح
وہ مرا انتظار کرتی ہے
ابھی نکلی ہے غار سے باہر
زندگی روشنی سے ڈرتی ہے
دن سے دن ہم کلام ہوتا ہے
رات سے رات بات کرتی ہے
دوست کے پاؤں دھو رہا ہوں میں
پاؤں دھو کر تھکن اُترتی ہے
طاقچے میں پڑی ہوئی گڑیا
چھو کے دیکھو تو بات کرتی ہے
آسماں ہے کہ سگریٹوں کا دھواں
راکھ کا ڈھیر ہے کہ دھرتی ہے

..... ○ .....

☆

سچی آنکھوں کے سپنے بھی سچے ہوتے ہیں
سچ کہتے ہیں بچے ہم سے اچھے ہوتے ہیں
ہریالی میں چاند چھلکتا پیالہ لگتا ہے
کہساروں کے چشمے ٹھنڈے میٹھے ہوتے ہیں
کوئی دیا اور کوئی ندی میں پھول بہاتا ہے
پانی پر دو نام ہوا نے لکھے ہوتے ہیں
رات کے اک چہرے پر کتنی آنکھیں ہوتی ہیں
اور جتنی آنکھیں ہیں اتنے چہرے ہوتے ہیں
کونپل کونپل رنگ و نور کی بوند ٹپکتی ہے
پچھلے پہر باغوں میں فرشتے اترے ہوتے ہیں
گھاس میں اس کے موتی جیسے پاؤں چمکتے ہیں
اور اس نے شبنم کے جوتے پہنے ہوتے ہیں
اس کو مرے کپڑوں سے اپنی خوشبو آتی ہے
اس نے سب موسم ترتیب سے رکھے ہوتے ہیں
بھیگی ہوئی کاپی میں غزلیں لکھی ہوتی ہیں
جلتی ہوئی ڈوری میں پھول پروئے ہوتے ہیں
میں نے بچوں کی آنکھوں سے دنیا دیکھی ہے
قیصر میرے جیسے شاعر بچے ہوتے ہیں

○

☆

اس نے پڑھ کر کلام پانی پر
لکھ دیا میرا نام پانی پر
یہ پرندے ہیں یا ستارے ہیں
جھلملاتی ہے شام پانی پر
میری جانب دیے بہاتے ہوئے
اس نے بھیجا سلام پانی پر
رات پچھلے پہر اُترتا ہے
کوئی ماہ تمام پانی پر
ناؤ میں سو رہی ہے شہزادی
چل رہا ہے غلام پانی پر
لکھ رہی ہے ہوا زمانوں سے
کوئی نقشِ دوام پانی پر
شاعری کی طرح اُترتی ہے
روشنی صبح و شام پانی پر
ایک آواز ساری لہروں میں
ایک چہرہ تمام پانی پر
آسماں ہے زمیں پہ ٹھہرا ہوا
اور زمیں کا قیام پانی پر

○

تارا ٹوٹا تھا کوئی رات گئے
آسماں تک شجر کے ہاتھ گئے

خاک اڑاتے ہوئے زمانوں کی
دور تک ہم ہوا کے ساتھ گئے

اپنے بچپن کو ڈھونڈنے کے لیے
ہم بھی جہلم گئے روات گئے

چاند لہروں کے ساتھ ساتھ گیا
ہم کنارے کے ساتھ ساتھ گئے

چھو کے دیکھا جو بہتے پانی کو
پہلے آنکھیں پھر اپنے ہاتھ گئے

شمعیں جلتی ہیں نیم خوابی میں
کھلنے لگتے ہیں پھول رات گئے

آخری بار وہ ملی قیصر
آخری بار ہم سوات گئے

.....○.....

☆

کسی برگد کا سایا ہو گیا ہوں
میں گوتم تھا اکیلا ہو گیا ہوں

مرے موسم بدلتے جا رہے ہیں
میں سبزہ تھا سنہرا ہو گیا ہوں

کسی شاعر کی رات اُتری ہے مجھ پر
کسی صوفی کا حجرہ ہو گیا ہوں

میرے پنجر میں پر آنے لگے ہیں
میں پنجرہ تھا پرندہ ہو گیا ہوں

زمین و آسماں اُڑتے ہیں مجھ میں
میں نقشِ پا تھا صحرا ہو گیا ہوں

کھلا ہوں مثلِ گل شاخِ صبا میں
کھلا ہوں اور ستارہ ہو گیا ہوں

چھلکتی ہے کسی کی پیاس مجھ میں
کہ میں دریا تھا پیالہ ہو گیا ہوں

غبار اندر غبار اُڑتا ہوا میں
کسی محمل کا پردہ ہو گیا ہوں

وہ میرے پاس سے ہو کر گیا تھا
میں اس کو چھو کے زندہ ہو گیا ہوں

خدا تنہا ہے قیصر آسماں پر
زمیں پر میں اکیلا ہو گیا ہوں

○

☆

دل کو دھڑکا لگا ہے چوری کا
سونے جیسا ہے پھول توری کا

گیلی مٹی کی طرح مہکا ہوا
ٹھنڈا پانی صراحی کوری کا

ایک خانہ بدوش گانے لگی
دل دھڑکنے لگا کٹوری کا

دھوپ میں دائرے بناتا ہوا
سات رنگا لباس گوری کا

سانس لیتے ہیں اس کے بندِ قبا
ریشم الجھا ہوا ہے ڈوری کا

آسماں کی لہر میں بہتا ہوا
چاند کے ساتھ پَر چکوری کا

ماں کی طرح مجھے سلاتا ہے
بارشوں میں بہاؤ لوری کا

ایک شاخِ گلاب جنت کی
ایک شعلہ ہوا میں چوری کا

کسی مزدور کا پسینہ ہے
سونا چاندی تری تجوری کا

گاڑی والے کو تو پتہ ہو گا
دور کتنا ہے گاؤں گوری کا

○

گھر کشادہ ہو اور لان کھلا چاہیے سر پہ آسماں کھلا
چاند نکلا تو رات بہنے لگی لہر آئی تو بادبان کھلا
پاؤں رکھا جو ناؤ سے باہر مجھ پہ اک دوسرا جہان کھلا
میں حصارِ یقین سے نکلا مجھ پہ آخر درِ گمان کھلا
پتھروں میں تجھے تراشا گیا تجھ سے بڑھ کر ترا نشان کھلا
بند ہو کر گلی کا دروازہ دو دریچوں کے درمیان کھلا
رنگ میں روشنی کے پھول کھلے سات رنگوں میں عطردان کھلا
اس کی مٹھی میں بھی ستارہ تھا رات مجھ پہ وہ گلہ بان کھلا
گھونسلے ہیں یہاں پرندوں کے چھوڑ کر جاؤں گا مکان کھلا
اک بچے کے ہاتھ میں قیصر ایک چھتری سا آسمان کھلا

..... ○ .....

ہمارا خواب سچا ہو رہا ہے
دیا بجھ کر ستارا ہو رہا ہے
کبوتر طاقچوں سے اُڑ رہے ہیں
شجر گنبد سے اونچا ہو رہا ہے
کہیں شاخ ستارہ جھک رہی ہے
کہیں پر چاند آدھا ہو رہا ہے
ہوا میں ٹوٹ کر پیپل کا پتہ
گرا ہے اور صحیفہ ہو رہا ہے
میں آدھی رات کا جاگا ہوا ہوں
ترے خوابوں کا پیچھا ہو رہا ہے
کھجوریں دھوپ میں پکنے لگی ہیں
ہمارا دن سنہرا ہو رہا ہے
مرے پیروں میں برسوں کی تھکن ہے
ترا قالین میلا ہو رہا ہے
مرے ہاتھوں میں مٹی کا دیا ہے
مرے اندر اجالا ہو رہا ہے
یہاں تو رات کے دو بج رہے ہیں
تری جنت میں اب کیا ہو رہا ہے
ترے بھیجے ہوئے پھولوں کو چھو کر
ترا بیمار اچھا ہو رہا ہے

○

ہر کسی کو سلام کرتی ہوئی
وہ محبت کو عام کرتی ہوئی
باغ میں ڈوبتا ہوا سورج
شام دن سے کلام کرتی ہوئی
وہی تبلیغ ترکِ دنیا کی
ساری خوشیاں حرام کرتی ہوئی
کھولتی ہے وہ میری زنجیریں
مجھ کو اپنا غلام کرتی ہوئی
صبح آیتوں میں بکھرنے لگی
ایک چہرہ تمام کرتی ہوئی
میرے ہاتھوں کو چوم لیتی ہے
وہ مرا احترام کرتی ہوئی
آدھی چھتری میں بھیگتی لڑکی
بارشیں میرے نام کرتی ہوئی
اس کو بستر سے دیکھتا ہوا میں
اور وہ گھر کے کام کرتی ہوئی
میرے شاخوں سے پھول گرتے ہوئے
اور وہ تزئینِ بام کرتی ہوئی
چل رہی ہے ہوا قیامت کی
بستیوں میں قیام کرتی ہوئی

○

براہِ راست

زیرِ نظر ''قرطاسِ اعزاز'' کی ترتیب، تدوین اور تزئین کے دوران بارہا یہ خیال نمایاں ہو کر الفاظ میں ڈھلتا رہا کہ وہ کون لوگ ہیں جو اردو ادب اور اردو شاعری کو ترقی یافتہ ممالک کے ادب اور شاعری کے مقابلے کمتر یا دوسرے درجے کی شے گردانتے ہیں۔ یا تو اُن لوگوں نے نذیر قیصر صاحب کو پڑھا نہیں یا اُن کے دل، دماغ میں کسی طرح کا احساس کمتری گھر کر گیا ہے وگرنہ اردو ادب اور شاعری میں ایک نہیں ایک نذیر قیصر بہ آواز بلند انسانی جذبات و احساسات اور معاملاتِ زندگی کو نئے رنگ اور نئے ذائقوں سے آشنا کر رہے ہیں۔ ہمارے دعویٰ کی تصدیق میں جناب نذیر قیصر کے ''قرطاسِ اعزاز'' کا مطالعہ کیجیے اور اُن تمام نام نہاد ناقدین کو دوٹوک انداز میں بتلا دیجیے کہ اردو ادب اور شاعری اگر کسی زبان و ادب کے ہم پلہ نہیں تو کسی طور اُن سے کم بھی نہیں ہے!!!

گلزار جاوید

☆ اگر ہم جہلم کے اُن ایّام اور گلی کوچوں کو آواز دیں جہاں آپ کے شعور کی آنکھ وا ہوئی تو کس طرح کا منظر اور ماحول نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے؟

☆☆ ۱۹۴۰ کا جہلم پرانے شہر کے ساتھ چھاؤنی کا منظر نامہ تھا جو انگریزی طرزِ تعمیر سے ابھرتا تھا۔ کم و بیش چار کنال کا بنگلہ چاروں طرف باغ اونچی اونچی چھتیں اور یہ چھاؤنی دریا کے کنارے تھی اور ہم بنگلہ نمبر نو میں رہا کرتے تھے جو دریا کے قریب تھا۔ دریائے جہلم ان دنوں کنارے تک بھرا ہوتا تھا۔ چاندی سا چمکتا جھلکتا پانی جس میں کشمیر سے سنوبر اور دیودار کی گیلیاں بہتی چلی آتی تھیں۔ کبھی کبھی کسی درخت کی شاخیں بھی ہوتی تھیں پھلوں سے بھری ہوئی۔۔۔ بنگلہ نمبر نو کے قریب کمپنی باغ بھی تھا میرے بچپن کی دنیا اتنی سی تھی مگر بہت پھیلی ہوئی۔ درخت، دریا، پرندے، پھل، پھول، رنگ و خوشبو اور لہروں سے بھری یہ دنیا آج بھی مجھ میں آباد ہے۔۔۔ چھاؤنی سے جڑا ہوا شہر ریلوے لائن کو عبور کرتے ہی شروع ہو جاتا تھا۔ کشادہ سڑکوں والا شہر۔۔۔ وہاں کی پرانی آبادی مشین محلّہ وغیرہ کی گلیاں بھی پرانے لاہور سے زیادہ کشادہ تھیں۔ وہاں پر میرے والد کے دوست لالا اوتار نارائن گجرال آباد تھے۔ اوتار نارائن گجرال جالندھر سے تھے میرے والد بھی جالندھری تھے۔ وہیں سے دونوں کے درمیان دوستی چلی آ رہی تھی۔ پیدائش کے چند دنوں بعد ہی میری والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ میری ابتدائی پرورش گجرال صاحب کی بیوی نے اپنی خوشی بلکہ میرے والد کے انکار کے باوجود زبردستی اپنے ذمے لے لی تھی۔۔۔ ۱۹۹۷ء میں جب میں انڈیا ایک ادبی کانفرنس میں گیا تو مجھے پتہ چلا کہ انڈیا کے وزیرِ اعظم اندر کمار گجرال اوتار نارائن گجرال کے بیٹے ہیں۔ میری کتاب ''اے شامِ ہم سخن'' کی تقریبِ رونمائی ان کے ہاتھوں مولانا ابوالکلام ہال میں ہوئی۔ ستیہ پال جی نے ان کے جانے کے بعد مجھے بتایا کہ یہ گجرال صاحب کے بیٹے ہیں جن کے گھر آپ نے پرورش پائی تھی۔ کیا آپ ان سے ملنا چاہتے ہیں؟ میں نے حیرت کا اظہار کیا اور کہا اگر ملاقات ہو سکتی ہے تو ضرور ملنا چاہوں گا۔ ستیہ پال جی نے ملاقات کا اہتمام کر دیا اور پھر ملاقات ہو گئی۔ بہت سے سوالات کے بعد جب انہیں یقین آ گیا کہ میری پرورش ان کی ماتا جی نے کی ہے تو وہ مجھ سے لپٹ گئے اور ان کی عینک کے شیشوں میں دریائے جہلم کے چند قطرے جھپک پڑے۔

پھر ستیش گجرال کا ذکر جن کے مصورانہ شاہکار کمرے کی دیواروں پر آویزاں تھے۔ ستیش گجرال اندر کمار گجرال کے بھائی تھے جن کا بچپن میرے ساتھ گزرا تھا۔ اندر کمار گجرال نے بتایا کہ وہ تو اس زمانے میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں کراچی چلے گئے تھے جو بچہ آپ کے ساتھ کھیلتا تھا وہ ستیش گجرال تھا جو آج کل ایک عالمی شہرت رکھنے والا مصور بن چکا ہے۔ جہلم کی یادوں کے ساتھ بلکہ پس منظر میں بہت سی یادیں جو مجھے آوازیں دیتی ہیں اور کئی بھولی ہوئی باتوں کو نئے سرے سے روشن کر دیتی ہیں۔ کبھی کبھی جب کسی مشاعرے کے سلسلے میں جہلم جاتا ہوں تو اپنے زمانے کے دریا وہ باغ وہ سڑکیں گلی کوچے تلاش کرتا ہوں مگر وہ سب کچھ نہیں رہا۔ دریا سوکھ کر صحرا بن چکا ہے۔ بڑے بڑے بنگلے چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں بن گئی ہیں، شہر کی کشادہ گلیاں ہجوم کا منظر نامہ ہے مگر مجھے لگتا ہے ایک بچہ آج بھی پرانے جہلم میں ہنستا کھیلتا گھوم رہا ہے اور نئے جہلم کے ساتھ پرانا جہلم بھی اس کے باطن میں آباد ہے۔ اندر کمار گجرال نے جذباتی ہو کر مجھے انڈین شہریت کی بھرپور اور گرم جوش آفر بھی کی مگر میں اپنے اندر سے جہلم اور اپنا ملک نہیں نکال سکا۔ میں نے کہا ہم تو وہ لوگ ہیں کہ کرائے کے گھر میں بھی رہیں تو اس کی دیواروں سے عشق ہو جاتا ہے۔ کسی سڑک سے گزریں تو اس کے درختوں سے محبت ہو جاتی ہے۔ کسی جانور کو پال لیں تو اسے جدا نہیں کر سکتے۔ پاکستان تو پورا ایک ملک ہے۔ اس کے شہر، گلی کوچے ان میں آباد دوست اور پھر اپنے باغ اور دریا ان کو میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ ستیہ پال جی اور امریتا پریتم نے قائل کرنے کی مجھے بہت کوشش کی مگر دل نہیں مانا۔۔۔ دماغ سے میں نے پوچھا ہی نہیں۔

میری صورت گری لاہور کو آباد رکھے گی
در و دیوار میں شکلیں پرانی چھوڑ جاؤں گا
کسی دن ڈھونڈ لیں گی جاگتی آنکھیں مجھے قیصر
میں ایک شاعر کی خوابیدہ کہانی چھوڑ جاؤں گا

☆ اُس لمحے کی بابت اپنے تاثرات بتلایئے جب پہلی بار جولانیٔ سخن نے آپ کے دل، دماغ اور احساسات کو اپنی گرفت میں لیا؟

☆☆ جولانیٔ سخن کا پہلا لمحہ کسی نامعلوم لہر کی طرح زندگی میں آیا ہوگا جب میں باغوں، درختوں، پرندوں سے باتیں کیا کرتا تھا اور دریا کے کنارے بیٹھ کر کچھ گنگناتا تھا۔ کسی نے پوچھا تھا آپ نے پہلا شعر کب کہا تھا؟ میں نے جواب دیا جب پہلا پھول کھلا تھا جب پہلی صبح ہوئی تھی۔

جس دن پہلا پھول کھلا تھا
میں نے پہلا شعر کہا تھا
گھر میں پہلی رات اتری تھی
طاق میں پہلا دیا جلا تھا

☆ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۶۰ء پندرہ سال کی عمر میں پہلا مشاعرہ وہ بھی جوش، جگر، فیض، عدم، ناصر، ندیم اور جالب جیسے دیوقامت شعرا کی موجودگی میں پڑھنے کا تجربہ بیان فرمایئے؟

☆☆ چھوٹے چھوٹے مشاعرے تو بہت پڑھے تھے مگر پہلا بڑا مشاعرہ جوش، جگر، فیض اور ناصر کاظمی کے ساتھ پڑھنے کا تجربہ خاصہ کٹھن تھا۔ پوسٹر پر میرا نام آخری لائن میں چھاپ دیا گیا تھا۔ میں قاسم باغ پرانے قلعہ ملتان کے پنڈال میں پہنچ گیا تھا مگر مشاعرہ سننا چاہتا تھا پڑھنا نہیں مگر عبدالستار غفوری جو مشاعرے کے منتظمین میں سے تھے مجھے زبردستی سٹیج پر لے گئے۔ ان دنوں فرشی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ میں آلتی پالتی مار کے ناصر کاظمی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ناصر کاظمی سے تھوڑی بہت پہلے سے آشنائی تھی۔ مشاعرہ شروع ہوا تو چند نوجوانوں کے بعد میرا نام پکارا گیا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ بیٹھے بیٹھے ہی ٹانگیں کانپنے لگ گئیں۔ ویسے بھی میں بہت شرمیلا ہوا کرتا تھا۔ مجھے نہیں خبر کہ کب مجھے ناصر کاظمی نے پکڑ کر مائک کے سامنے لا کھڑا کیا۔۔۔ اور میں نے غزل پڑھنا شروع کی۔

رنگ خوشبو شجر آواز ہوا کچھ بھی نہیں
اب جہاں میں ہوں وہاں میرے سوا کچھ بھی نہیں

مجھے لگا کہ اسٹیج سے لے کر نیچے پنڈال تک داد سے گونج اٹھا اور جب میں نے کہا:

دیکھتا ہوں تو سبھی کچھ ہے سلامت گھر میں
سوچتا ہوں تو ترے بعد رہا کچھ بھی نہیں

پھر تو داد کا سیلاب آ گیا۔ چند شاعر تو سٹیج پر اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور عدم نے لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کر میرے ہاتھ چوم لیے۔ ناصر کاظمی نے کمر پر زوردار تھپکی دی۔ اس مشاعرے نے مجھ میں بے پناہ خود اعتمادی پیدا کی اور تقریباً تمام نامور شاعر میرے دوست بن گئے۔ پھر ۱۹۶۰ء میں مجھے لاہور رہائش پذیر ہونا پڑا جہاں صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، جمیلہ ہاشمی، کشور ناہید، ناصر کاظمی، اعجاز بٹالوی، ڈاکٹر نظیر احمد، منیر نیازی، شہزاد احمد اور حنیف رامے نے مجھے بہت حوصلہ دیا اور لاہور میں پاؤں جمانے کے لیے میری مدد بھی کی۔

☆ آپ کے ہاں دریچہ، طاق، دیا، بارش، خواب، جسم اور وصل وغیرہ سے گہرا ربط بلکہ جمادات و نباتات کا استعمال بھی کثرت سے کیا جاتا ہے؟

☆☆ طاق، دریچہ، ہوا، بارش، خواب، رات پیالہ وغیرہ جمادات و نباتات میری شاعری میں شاید اس لیے زیادہ ہیں کہ میرا بچپن اور اس سے آگے کی زندگی بھی کنج تنہائی میں زیادہ بسر ہوئی ہے۔ بہن بھائی کا اور والدہ کا نہ ہونا اور پھر طبیعت میں شرمیلا پن ان سب نے مجھے فطرت دوست زیادہ بنا دیا اور پھر شروع ہی سے مجھے فطرت کے مناظر نے حیرت زدہ رکھا ہے مگر اس حیرت میں خوف نہیں مسرت اور محبت کا احساس ہے اور بہت حد تک روحانی کیفیت بھی۔

زندگی کو خوبصورت کیجئے
شعر لکھیے اور محبت کیجئے
صبح سے پہلے دریچہ کھول کر
پہلی کرنوں کی تلاوت کیجئے

☆ آپ کے ہاں تحیر پر بڑا زور دیا جاتا ہے اور آپ اُس شاعری کو بڑا مانتے ہیں جسے پڑھ یا سن کر قاری چونک جائے؟

☆☆ میری شاعری میں حیرت چونکا دینے کے لیے نہیں ہوتی کچھ سوچنے کے لیے ہوتی ہے۔ خدا سے بڑھ کر حیرت کس اسم یا خیال میں ہو سکتی ہے۔ ہم صدیوں سے اس اسم کے سامنے حیرت زدہ کھڑے ہیں۔ ایک اچھے اور بڑے شعر میں حیرت اور مسرت کا امتزاج ہوتا ہے۔ میرا ایک پرانا شعر ہے۔

یوں کھڑا ہوں گنبد شام و سحر کے سامنے
جیسے کوئی نقش حیرت نقش گھر کے سامنے

خدا کے بعد پیغمبر، اولیاء اور صوفیا بھی اپنی باتوں، معجزات اور کرامات سے حیران کر دیا کرتے تھے اور یہی وصف بڑی شاعری میں بھی ہوتا ہے۔

☆ اس تاثر میں کہاں تک حقیقت ہے کہ آپ چیزوں کو دوسروں کی آنکھ سے دیکھنا پسند کرتے ہیں؟

☆☆ میں چیزوں کو دوسروں کی آنکھوں سے نہیں دیکھتا خود کو چیزوں کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ درختوں، بادلوں، پرندوں کی آنکھیں مجھے دیکھتی ہیں تو میں ان میں سما کر خود کو دیکھتا ہوں۔ میں اداس ہو کر یہ نہیں کہتا کہ میں اداس ہوں میں کہتا ہوں درخت اداس ہے۔ درخت مجھے دیکھ رہا ہوتا ہے۔۔۔ میری اداسی کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔

''چہارسُو''

☆ کچھ لوگ آپ کو منظم معاشرے کا غیر منظم شاعر کیوں گردانتے ہیں؟

☆☆ میں منظم معاشرے کا غیر منظم شاعر نہیں بلکہ غیر منظم معاشرے کا منظم فرد ہوں۔ میں نے اپنی شاعری میں ایک منظم معاشرہ تشکیل دیا ہے جس میں محبت ہے، امید ہے، خوبصورتی ہے، سچائی اور سب سے بڑھ کر آنے والے دنوں کے خوبصورت خواب ہیں۔

☆ پرانی زبان سے نئے تناسبات اور تلازمات بنانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

☆☆ میں نے پرانی شاعری کی زبان پہ اپنا دروازہ بند کر دیا ہے۔ میری شاعری میں وفا، جفا، ستمگر، رقیب، میخانہ عدو، ساقی، کوچہ، قاتل وغیرہ داخل نہیں ہو سکتے۔ لاہور میں داتا صاحب کے پیچھے بلال گنج ہے جہاں گاڑیوں کے پرانے پرزے سیکنڈ ہینڈ پرزوں کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ ہم نے شاعری میں بھی بلال گنج کھول رکھا ہے۔ پرانے گھسے پٹے زنگ آلود لفظوں سے ہم کیا نکالنا چاہتے ہیں۔ ہر لفظ اور پرزے کی ایک عمر ہوتی ہے۔ منیر نیازی نے کہا تھا ''نذیر قیصر مردہ لفظوں کو چھو کر انہیں زندہ کر دیتا ہے'' میں نے کہا ''بہت سے شاعر زندہ لفظوں کو چھو کر انہیں مار ڈالتے ہیں'' ایک خیال یہ بھی ہے کہ لفظ پرانے نئے نہیں ہوتے ہمارے خیالات نئے یا پرانے ہوتے ہیں مگر لفظ کیا ہوتا ہے۔۔۔؟ لفظ خود بھی ایک خیال ہوتا ہے۔ ہجر کیا ہے۔۔۔؟ رقیب کیا ہے۔۔۔؟ ساقی کیا ہے۔۔۔؟ یہ سب لفظ اپنے ایک خیال کے ساتھ ہمارے پاس آتے ہیں۔ ہم ان کو کتنے شیڈ دے سکتے ہیں؟ کتنے معنی دے سکتے ہیں؟ فیض صاحب نے ترقی پسندی کے پس منظر میں ان لفظوں کو سیاسی شیڈ دے اور پھر فراز فہمیدہ ریاض وغیرہ نے بھی۔ اب وہ شیڈ بھی پرانے ہو چکے ہیں۔ اب نئی علامتیں اور استعارے بھی اپنی گرہیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔

نئی شاعری نئے شاعر کے ساتھ نئی زبان بھی مانگتی ہے۔ ہمارے پانی کی طرح ہماری زبان اور خیالات بھی پراگندہ ہو چکے ہیں یا تو انہیں فلٹر کرنا پڑے گا یا پھر نئے چشموں کی تلاش کرنی پڑے گی۔ باہر بھی دریا اسی کو نظر آتا ہے جس کے اندر دریا ہوتا ہے۔ سو نیا ہونا نئی زبان اور نئے خیال میں خود کو تراشنا یہ نقش گری، خدا، فطرت اور انسان کے درمیان ایک نئے رشتے کا دروازہ کھلنے سے ہوگی اور وہ دروازہ اجتماعی انسانی اقدار ایک آفاقی انسانی کلچر اور آرٹس کی طرف کھلے گا۔ جب ہم کسی باغ میں داخل ہوتے ہیں تو وہ باغ بھی ہم میں داخل ہونے لگتا ہے۔ اس باغ کو خود میں داخل ہونے دیجئے، باغ کی طرح اپنا پھاٹک بھی کھول دیجئے، دروازے، دریچے، کھولنے سے ہی آسمان دکھائی دیتا ہے۔

☆ بحر میں صیغہ تانیث کا استعمال کیوں ضروری گردانا گیا اور اس سے کیا نتائج حاصل کرنا مقصود ہیں؟

☆☆ صیغہ تانیث استعمال کرنے کا میں کوئی خاص اہتمام نہیں کرتا جہاں اس کا جی چاہے آ جاتا ہے۔ میری شاعری اور زندگی دونوں ایک جیسے ہیں دونوں جہاں بھی۔ عورت کی خوبصورتی بے ساختی بہاؤ کے ساتھ آ جاتی ہے میں اسے آنے دیتا ہوں۔ خدا، فطرت اور عورت خوبصورت ہے۔

☆ آپ کے خیال میں وہ کون سے شعراء ہیں جن کی زرّہ بکتر مردہ لفظوں سے عبارت تھی یا ہے؟

☆☆ ہر برا شاعر پرانے لفظوں کے ذرا بکتر میں چھپا ہوتا ہے اور وہ یہ نہیں جانتا کہ بری شاعری کرنے والے کو شاعری بھی سزا دیتی ہے اور یہ سزا بری شاعری کی شکل میں ہوتی ہے

☆ آپ کو وجودیت پرستوں کی صف کا اہم آدمی شمار کرنے والے اس کا جواز بتلانے سے قاصر کیوں ہیں؟

☆☆ مجھے لوگ وجودیت کے صف کا اہم آدمی مانتے ہیں؟ مجھے نہیں معلوم مگر ہمارے مغرب سے آنے والے اکثر نظریات اس وقت رائج ہونے لگتے ہیں جب وہ مغرب میں وفات پا چکتے ہیں۔۔۔ وجودیت سے بڑھ کر میں شاید ''وحدت الوجود'' کا آدمی ہوں۔

☆ آپ کے اشعار میں بائبل کی آیات کا تاثر بتلانے والے کس امر کی نشان دہی کے خواہش مند ہیں؟

☆☆ میری شاعری میں بائبل کی گیات کی نشاندہی کرنے والے ہوں گے۔۔۔؟ ابھی حال ہی میں ایف سی یونیورسٹی سے مجھ پر ایم فل کی ڈگری دی گئی ہے جس کا عنوان تھا ''نظیر قیصر کی شاعری پہ بائبل کے اثرات'' میری شاعری پہ تو قران مجید کے اثرات بھی ہیں، بدھا کے لکچر، گیتا اور وید گرانت کا اثر بھی موجود ہے۔ ایک دن جیلانی کامران، انتظار حسین، شہزاد میرے گھر آئے بہت سی باتوں کے دوران انتظار حسین نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا ایک شعر ہے۔

آدمی ہوں مٹی کا
ذائقہ ہوں پانی کا

میں نے جواب دیا یہ پانی کا ذائقہ گیتا سے آیا ہے اور میرے ہاں قران مجید کا بھی بہت اثر ہے۔

سانس لیتی ہوئی صبح کی قسم

اور

ایک خدا ہوتا ہے ایک زمانہ ہوتا ہے
روز نیا ہوتا ہے روز پرانا ہوتا ہے

علامہ اقبال نے اسرار خودی کے دیباچے میں گیتا میں فلسفہ کرما کے بیان کی بہت تعریف کی۔ اسی طرح انہوں نے رام اور گرونانک پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ انسانی اقدار کا ایک اجتماعی تصور پینٹ کرتی ہیں۔ میری شاعری کی بنیادی فلاسفی میرے ان دو شعروں میں ہے۔

دنیا اچھی لگتی ہے رب اچھا لگتا ہے
اچھی آنکھوں والوں کو سب اچھا لگتا ہے

ساری کتابیں سارے صحیفے مجھ پر اترے ہیں
مجھ کو دنیا کا ہر مذہب اچھا لگتا ہے

☆ آپ کی شاعری میں اُٹھائے گئے سوالات کے بطن سے کس طرح کے خدشات نمایاں ہوئے اور آپ کو کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا؟

☆☆ میری شاعری کے بطن سے جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان سے بہت سی دشواریاں بھی پیدا ہوتی رہی ہیں مگر اب شاید معاشرے میں بہت سے بھونچال آنے کی وجہ سے لوگ خود کو سنبھالنے کی پوزیشن میں چلے گئے اور وہ سوچنے لگے ہیں کہ محبت اور انسانیت کے عالمگیر تصور کے بغیر اب اکیلے زندہ رہنا ممکن نہیں رہا۔

میرا مذہب ہے محبت کرنا
اے خدا میری حفاظت کرنا

محبت کرنے والے بڑے غیر محفوظ ہوتے ہیں۔ بس یہی دشواری مجھے پیش آتی رہی ہے کہ میں نے بلا امتیاز رنگ و نسل اور عقیدے سب سے محبت کی ہے۔

☆ کائنات کی سمفنی سننا، دیوتاؤں کو اُن کے نام سے پکارنا اور دیوتاؤں کے عالمِ وجود میں آنے کی بات کرنا کس رویہ کا غماز ہے؟

☆☆ حرف کون سے کائنات وجود میں آئی اور اسی طرح کلمہ کے وجود سے عالم کی تشکیل ہونا یہ روحانی مراحل ہیں۔ پکارے جانے سے چیزیں وجود میں آ جاتی ہیں۔ کبھی کسی کو بڑی شدت سے یاد کروں تو وہ آپ کے دروازے پر موجود ہوتا ہے۔ میرا تجربہ اور میرے قریب بھی دوست جانتے ہیں کہ میں موسموں کو پکارتا ہوں تو میری آواز سنتے ہیں۔ کبھی کبھی بارش کو بلاؤں تو آ جاتی ہے۔ آپ بھی فطرت سے سچی دوستی کریں وہ آپ کی آواز بھی سنے گی اور جواب بھی دے گی۔

☆ بہشت میں دیکھے گئے وہ کون سے خواب ہیں جن کی تعبیر صرف آپ کے ہاں دستیاب ہے؟

☆☆ بہشت میں دیکھے گئے خوابوں کی تعبیریں صرف میرے پاس ہی نہیں ہیں ہر اس شخص یا شاعر کے پاس ہیں جو جیتے جی اس زمین کو بھی بہشت بنانا چاہتے ہیں۔ ہم جنت کی تلاش میں اپنے اندر بہت سے دوزخ پیدا کر لیتے ہیں پہلے تو ہمیں ان دوزخوں کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی ضرورت ہے۔

بہشت کا بھی عجب حال ہے بنایا ہوا
درخت ٹوٹا ہوا آدھا سیب کھایا ہوا
تیرے بہشت کی آسائشیں بجا لیکن
زمیں کا رزق زمین پہ کھانا پڑتا ہے

پہلے تو ہمیں بہشت کے روایتی تصور کو درست کرنا پڑے گا۔ حضرت رابعہ بصری نے جنت کے لالچ اور دوزخ کے خوف سے کی جانے والی عبادت کو بیکار کہا ہے۔

☆ آپ کے تصورِ عشق کو Stateless سوسائٹی کے فرد کا عشق بتلانے والے، اصل میں کہنا کیا چاہتے ہیں۔

☆☆ تصورِ عشق Stateless یا ہوسٹیٹ کا پابند دونوں صورتوں میں بغاوت کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔ عشق فرد کا ہو یا صوفی کا حسین بن منصور حلاج سے مولانا روم تک اور لیلیٰ مجنوں سے شیریں فرہاد تک کوئی معاشرہ اور حکومت اسے قبول نہیں کرتی ہے۔ ہیر رانجھا سنتے ہوئے یا فلم دیکھتے ہوئے ہم ہیر کے ہمدرد ہوتے مگر اپنے خاندان میں کوئی ہیر پیدا ہو جائے تو ہم کیدو بن جاتے ہیں۔

☆ کچھ لوگ آپ کی صوفیانہ واردات کے ذکر میں بابا گرونانک اور بھگت کبیر کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کرنا کیوں ضروری خیال کرتے ہیں؟

☆☆ میرے ساتھ کسی بھی پیغمبر، ولی، صوفی اور شاعر کا ذکر کیا جا سکتا ہے میں سب کا احترام کرتا ہوں۔

☆ کچھ لوگ غالب اور اقبال کے بعد آپ کو خاک اور ہوا کا شاعر گردان کر کیا تاثر دینا چاہ رہے ہیں؟

☆☆ مجھے غالب اور اقبال کے بعد خاک و ہوا کا شاعر کہنے والے مجھے بہت بڑا رتبہ دیتے ہیں ان کا شکریہ۔ بات خاک و ہوا تک یہ خدا، کائنات اور فطرت سے مکالمے کی بات ہے۔ غالب اور اقبال نے خدا، کائنات اور فرشتوں سے مکالمہ کیا ہے اور زندگی اور کائنات کے رشتے کو تلاش کرنے کی کوشش میں نے بھی کی۔ کہیں کہیں ایسا کیا ہے مگر میں نے زیادہ تر فطرت سے سرگوشی کی ہے۔

☆ جو لوگ آپ کی شعری متھ کی تنکنائی کا ذکر تکرار کے ساتھ کرتے ہیں ،اُن کا منشا و مقصود غزل کو نشانہ بنانا تو نہیں؟

☆☆ میں نے اپنی شعری متھ خود تخلیق کی ہے۔ میری زبان، میرا اسلوب، میرا لہجہ یہ سب میں نے پرانی شعری متھ کو مسمار کر کے بنایا ہے۔ ایسا کرنے میں مجھے ساٹھ برس لگے ہیں۔ یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ یہ پرانی شعری متھ سے رشتہ توڑ کر براہ راست فطرت سے ایک نیا رشتہ قائم کرنا تھا جہاں درختوں اور ان کی شاخوں میں انسانی چہرہ، آنکھیں، ہاتھ اور بازو لہراتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا منظر دیکھنے اور تخلیق کرنے کے لیے نئی آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے اور نئی آنکھیں بچے کے پاس ہوتی ہیں۔

میں نے بچوں کی آنکھوں سے دنیا دیکھی ہے
قیصر میرے جیسے شاعر بچے ہوتے ہیں

بچے بن جایئے آسمان بھی آپ کے چھوٹے چھوٹے بازوؤں میں سما جائے گا، چاند آپ کے ہاتھوں میں کھلونا بن جائے گا، انسان فطرت سے نیا رشتہ قائم کر کے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔

☆ ذات اور کائنات کے وہ کون سے عوامل ہیں جو آپ کو پنجابی ادب کی جانب مائل کرنے کا سبب بنے؟

☆☆ میرے والد صوفی منش شخص تھے۔ انہیں صوفیاء کا کلام زبانی یاد تھا۔ بلھے شاہ، سلطان باہو، شاہ حسین اور بابا فرید کے اکثر شعر وہ مجھے سنایا کرتے تھے۔

صوفیا کا کلام ہمیشہ سے میرے لیے باعث کشش رہا ہے۔ بس یہی شعری اور روحانی تجربہ مجھے پنجابی شاعری کی طرف لے آیا۔ میرے نزدیک دنیا کی تمام بڑی شاعری روحانی ہوتی ہے اور پھر پنجابی شاعری تو روحانیت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

☆ آج کی نشست میں مثال دے کر بتلایئے کہ وہ کون سے شاعر ہیں جنہوں نے محبت کی شاعری کو مشکل بنا دیا ہے؟

☆☆ محبت کی شاعری کو ان شاعروں نے مشکل بنا دیا ہے بلکہ دھندلا دیا ہے جنہیں محبت کا تجربہ نہیں ہوا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ریاض خیر آبادی نے تمام عمر شرابی شاعری کی اور کبھی شراب نہیں پی مگر اس سے قطع نظر اصل بات یہ کہ ہمارے شاعروں نے عورت کو اپنی شاعری میں مصور کیسے کیا ہے؟ اس کی تصویر کشی کیسے کی ہے؟ بے وفا، ستم گر، قاتل، رقیب کے ساتھ جانے والی، وعدہ خلاف۔ میر اور غالب کو تو ثقافتی رعایتی نمبر دیے جا سکتے ہیں کہ اس ثقافت میں محبوبہ سات پردوں میں قید تھی جو محبوبہ میسر تھی وہ کوٹھے پر تھی جہاں غالب کے کو توال شہر اور دس نواب اور بیٹھے گا نا سن رہے ہوتے تھے۔ اس محبوبہ نے سب کا دل بہلانا ہوتا تھا مگر ہمارے عہد کے شاعر کس محبوبہ سے محبت کرتے ہیں کہ تمام شاعری شکوہ شکایت اور طنز سے بھری ہوتی ہے۔ محبت احترام کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے اور پھر آج بھی اس بات پہ اصرار کرنا کہ غزل عورت سے گفتگو کرنے کا نام ہے؟ حیرت ہے اور پھر اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے تو ہمارے شاعروں نے ابھی تک عورت سے بات کرنا بھی نہیں سیکھا۔ میری شاعری میں تو ساری کائنات عورت بن جاتی ہے۔ ساری کائنات محبت اور گفتگو کیوں نہیں کی جا سکتی؟

☆ روشنی کی سرگوشیوں کی تعلیم کو رواج دینا اور خطیبانہ شعری ماحول کو پروان چڑھانے کی بابت بھی وضاحت ضروری ہے؟

☆☆ ڈاکٹر وحید احمد نے کہا تھا کہ شاعری میں نذیر قیصر نے خطابیہ شاعری کی جگہ سرگوشیوں کی تعلیم کو رواج دیا ہے اور آخر ہمیں اس تعلیم کو اپنانا پڑے گا۔ عام زندگی میں بھی اگر کوئی اونچا بولے یا رعب دار آواز میں گرج کر بولے تو ہمیں برا لگتا ہے۔ شاعری جیسی نازک اور خوبصورت صنف سخن میں ہم خطاب کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ ویسے یہ مزاج طبیعت اور آپ کی فطرت پہ بھی ہے کہ آپ کا لہجہ کیسا ہے؟ میٹھا شیریں دھیما، خوشگوار یا کرخت چیخ کر بولنے والا؟ معاشرے کو متوازن اور خوشگوار ہونا چاہیے جس سے ایک دوسرے کو سننے اور برداشت کرنے کا کلچر پیدا ہوتا ہے۔

☆ آپ کے خیال میں خطاب کرنا اور خطاب سننا ہماری سائیکی کا حصہ بن چکا ہے جس کے سبب ہم Loudness پسند ہو گئے ہیں۔ آج کی گفتگو میں آپ ہمیں ادب اور شاعری کے ساتھ ادیب اور شاعر پر اس کے اثرات اور اُن سے بچاؤ کے طریقے بتلایئے؟

☆☆ مجھے اکثر مشاعروں کی صدارت کرنی ہوتی اور پھر آخر میں رسمی خطاب بھی۔ پھر میں نے سوچا کہ اگر گفتگو ضروری ہے تو پھر اس میں کوئی نہ کوئی کام کی بات بھی ہونی چاہیے۔ سو اب میں گفتگو میں شاعری، زندگی اور دیگر موضوعات پر کوئی نئی بات کہنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔

☆ ایک تخلیق کار کے لیے زندگی کا کون سا حصہ اور کون سا دور بار آور ہوا کرتا ہے نیز اُن دنوں کی بابت خصوصیت سے روشنی ڈالیے جب آپ کو بے کسی اور تنہائی کا سامنا تھا؟

☆☆ کچھ فنکار چھوٹی سانس کے ہوتے ہیں جلد تھک جاتے ہیں۔ کسی فنکار کا سفر طویل ہوتا ہے وہ لمبی سانس بھر سکتا ہے۔ فیض ۱۹۸۴ء میں جب بیروت سے لاہور آئے تو ملاقات کے دوران میں نے پوچھا۔ فیض صاحب کچھ نیا بھی لکھا یا نہیں؟ کہنے لگے بھئی اب ہمیں کچھ نیا سوجھتا نہیں تو ہم نیا کیا لکھیں گے؟ یہ فیض صاحب ہی کہہ سکتے ہیں ہمارے اکثر شعراء تو کچھ نیا کہنے کو ہو یا نہ ہو لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو دہراتے جاتے ہیں۔ بہت سے شاعروں کی کلیات دیکھ کر لگتا ہے یہ آٹھ دس کتابوں کو جمع کر کے کائنات بنانے کی کیا ضرورت تھی یہ تو بس ایک یا دو کتابوں کا شاعر ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ مجھ میں تخلیقی جوش نمو با کثرت ہے۔ میں نے ہر عہد میں اور ہر صورتحال میں لکھا ہے اور اپنی پہلی کتاب ''آنکھیں، چہرہ، ہاتھ'' سے ''محبت میرا موسم ہے'' تک کبھی تھکن کا احساس نہیں ہوا۔ میں ہر نئی کتاب ترتیب دیتے ہوئے اپنے پہلے کام کی طرف مڑ کر ضرور دیکھتا ہوں کہ کہیں میں خود کو دہرا تو نہیں رہا۔ اگر مجھے کسی بھی نظم غزل میں ایسا تاثر ملتا ہے تو میں اسے قلم زد کر دیتا ہوں چاہے وہ کتنی ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو۔ چند بنیادی لفظ استعارے اور علامت ہر شاعر کے ہوتی ہیں وہ میرے ساتھ بھی ہیں لیکن میں انہیں کبھی کبھی پرانے لباس یا جسم میں استعمال نہیں کرتا۔ پیالہ، ستارہ، ہوا، دریچہ، آسمان، رات، خواب، پرندہ بادبان، لہر یا موج، ہاتھ، چہرہ، آنکھیں میرے بنیادی لفظ ہیں مگر ان کا استعمال میں غیر بنیادی سطح پہ کرتا ہوں۔ میں نے اپنی بے کسی اور تنہائی کو بھی جشن زندگی کے رنگ و نور سے آراستہ نہیں کیا ہے۔

☆ فیض صاحب نے آپ کے ہاں جس اجتماعی شعور کی بات کی ہے، آج کے دور میں اُس کی اہمیت و افادیت سوالیہ نشان نہیں بن جاتی؟

☆☆ فیض صاحب کلاسیک شاعر ہونے کے باوجود ایک نظریاتی نقطہ نظر کے حامل تھے۔ ''اجتماعی شعور'' کی اصطلاح انہوں نے اسی پس منظر میں استعمال کی ہے۔ میرا مجموعہ کلام ''گنبد خوف سے بشارت تک'' کے فلیپ میں انہوں نے یہ بات لکھی ہے۔ میرے اس مجموعے میں فلسطین پر کچھ نظمیں تھیں اور فیض صاحب نے ان نظموں کے لیے ایک فلسطینی مصور کے کچھ سکیچ بھی مجھے بھجوائے تھے جو اس مجموعے میں نظموں کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔

☆ اعجاز بٹالوی صاحب نے آپ کے ہاں برتی گئی علامات کو کن معنوں میں پُراسرار بتلایا ہے؟

☆☆ اعجاز حسین بٹالوی بیرسٹر تھے اور علمی ادبی شخصیت بھی۔ حلقہ ارباب

ذوق کی تعمیر وترقی میں بھی ان کا بڑا کردار رہا ہے۔''آنکھیں، چہرہ، ہاتھ'' کی شاعری کو وہ علامتوں کا سیلِ رواں کہتے ہیں اور اس کتاب کا ماحول انہیں پراسرار لگتا ہے شاید ان جیسے شعروں کی وجہ سے:

آنکھیں کس کا کھوج لگاتی رہتی ہیں
شکلیں اپنا آپ چھپاتی رہتی ہیں
موسم کی روداد رقم کرنے کے لیے
شاخیں اپنے ہاتھ کٹاتی رہتی ہیں
کون ہوائیں ہیں جو لوحِ عالم پر
آنکھیں چہرہ ہاتھ بناتی رہتی ہیں
مٹی کیوں رنگوں کو ظاہر کرتی ہے
خوشبوئیں کیوں خاک اڑاتی رہتی ہیں
ساری رات گلی کی خالی نکڑ پر
تیز ہوائیں لیمپ ہلاتی رہتی ہیں

یہ شاعری پچاس برس سے بھی پرانی ہے اور آج بھی تر و تازہ اور پُراسرار ہے۔''آنکھیں، چہرہ، ہاتھ'' ایسے اشعار سے بھری ہوئی ہے۔

بکھرے ہوئے چہروں میں کھڑا سوچ رہا ہوں
آنکھیں نہ رہیں گی کہ تماشا نہ رہے گا

۱۹۶۸ء میں اس کتاب کے چھپتے ہی تمام نئے پرانے شاعروں میں اس کا چرچا ہونے لگا اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پہلا ایڈیشن چھپا اور ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۰ء تک ''آنکھیں، چہرہ، ہاتھ'' چار ایڈیشن چھپے لائبریری ایڈیشن اس کے علاوہ تھا۔اس عہد کے ابھرتے ہوئے نوخیز شاعروں نے مجھے طویل خط لکھے جن میں پروین شاکر، ثروت حسین، جمال احسانی اور نعیم درانی (جدید سیپ کراچی) بھی شامل تھے۔پھر ان میں سے اکثر شاعر مجھے ملنے لاہور بھی آئے اور خصوصاً پروین شاکر اور ثروت حسین اور پھر ثروت حسین تو ہر دوسرے مہینے آنے لگے۔ایک بار میں لاہور سے ذرا باہر قصور کے راستے میں مصطفیٰ آباد قصبے میں تھا وہاں رات بارہ بجے پہنچ گئے مجھے تلاش کرنے کے لیے۔انہوں نے غلام حسین ساجد اور محمد خالد کی رہنمائی حاصل کر رکھی تھی۔ان دنوں ثروت حسین کا یہ جملہ بڑا مشہور ہوا کہ ''میں لاہور میں داتا صاحب اور نذیر قیصر سے ملنے آتا ہوں'' اعجاز حسین بٹالوی نہ صرف میری شاعری بلکہ میرے بارے میں بھی کہا کرتے تھے کہ نظیر قیصر ایک طلسماتی شخصیت ہے۔

☆ ظفر اقبال صاحب نے شاعری کا منظر نامہ بدلنے کا جو کریڈیٹ آپ کو دیا تھا اُس سے اردو شاعری اور شاعروں بلخصوص نوجوان شعراء کو کیا حاصل ہوا؟

☆☆ ظفر اقبال نے شاعری کا منظر نامہ بدلنے کا جو کریڈٹ مجھے دیا ہے ان کا شکریہ انہوں نے خود بھی شاعری کا بہت کچھ بدل دیا ہے۔میری خوش قسمتی ہے کہ ۱۹۶۸ء کی طرح آج کی نوجوان نسل بھی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے اور ان میں سے اکثریت میری فلاسفی کو اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔ایک تو میں نے خطابیہ اسلوب کی جگہ گفتگو اور گفتگو سے آگے بڑھ کر جو سرگوشی کے لہجے کو رواج دیا ہے وہ سنجیدہ لکھنے والوں میں رواج پا رہا ہے۔دوسرے موضوعات میں جو مایوسی نا امیدی کی فضا تھی وہ کم ہوئی ہے۔شکوہ، شکایت، طنزیہ رویہ، بے چراغ گلیاں، کوچے، خزاں آثار، ویران شہر اس منظر نامے کو شاعری کے کینوس سے ہٹانے یا مٹانے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔

☆ احمد ندیم قاسمی صاحب آپ کو نہ صرف شدت احساس کا شاعر گردان رہے ہیں بلکہ اُس کی شدت سے نسیں پھٹنے کے خدشے کا اظہار بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں؟

☆☆ احمد ندیم قاسمی مجھے غیر معمولی شدت احساس کا شاعر کہتے ہیں۔ قاضی جاوید مجھے ایشیا کا وین گارڈ شاعر سمجھتے ہیں اور منصور آفاق مجھے جدید تر شاعری کے معماروں میں شمار کرنے کے ساتھ تازہ خیالی کا تاج بھی میرے سر پر رکھتے ہیں۔ یہ تینوں سوال میری تعریف و توصیف میں جاتے ہیں اور تینوں سوالوں کے مناسب جواب تو یہی تینوں صاحب دے سکتے ہیں۔ میں تو ان کی باتیں دہرانے پر آپ کا شکریہ ادا کر سکتا ہوں اور ان تینوں کا بھی۔

☆ خلیق احمد خلیق صاحب آپ کے شعری نسخے ''آنکھیں چہرہ، ہاتھ'' کو کس حوالے سے پُر فریب گردان رہے ہیں؟

☆☆ خلیق احمد خلیق نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ ''آنکھیں، چہرہ، ہاتھ'' دیوان غالب کی طرح ایک پر فریب کتاب ہے اسے جب بھی کھولیے اور جہاں بھی کھولیے یہ آپ کو اپنے اسرار میں جکڑ لیتی ہے۔

☆ ڈاکٹر عرفان الحق صاحب کے خیال کے مطابق اگر آپ کو نفسِ مطمئنہ کا شاعر تسلیم کر لیا جائے تو آپ کی تمام تر جدوجہد اور تخلیقی جستجو بے ثمر نہیں ہو جاتی؟

☆☆ ڈاکٹر عرفان نے مجھے نفس مطمئنہ کا شاعر کہہ کر میری جستجو کو کم یا بے ثمر نہیں کیا بلکہ میری جستجو کو بے کراں کر دیا ہے۔نفس مطمئنہ کی اپنی دنیا ہوتی ہے، اپنا سفر ہوتا ہے بلکہ اس کا سفر تو اب شروع ہوتا ہے۔تمام چشمے تمام دریا شور کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے سمندر میں جا گرتے ہیں اور جہاں ان کا شور پرسکون خاموشی میں ڈھل جاتا ہے۔سکوت صدف میں گرتی ہوئی بوند موتی بن جاتی ہے۔ ہم نے سمندر کا شور سنا ہے اس کی خاموشی کبھی نہیں سنی۔میرا ایک شعر ہے۔

ایک بوند چھلکانی ہے ایک چھاگل بھرنی ہے
میں نے سمندر کی خاموشی واپس کرنی ہے

گفتگو کی معراج یہی ہے کہ جب آپ کو کسی کی خاموشی بھی سنائی دینے لگے نفس مطمئنہ کا سفر گفتگو سے سرگوشی اور پھر سرگوشی سے خاموشی تک کا سفر ہے۔

☆ کچھ معلومات فلمی تجربات اور گیت نگاری کی بابت بیان فرمایئے، ساتھ ہی یہ بھی بتلایئے کہ یہ سلسلہ جاری کیوں نہ رہ سکا؟

☆☆ میں نے کچھ عرصہ پہلے فلمی صحافت اپنے زمانے کے معروف رسائل ماہنامہ ڈائریکٹر شمع، پکچر کا ایڈیٹر رہا۔ پھر چند برس فلمی گیت میرے زمانے میں فلم انڈسٹری میں بہت اچھے لوگ تھے مسعود پرویز، خورشید انور، رشید عطرے، ریاض شاہد، ڈبلیو زیڈ احمد، انور کمال پاشا، حسن طارق، حسن عسکری اور کچھ لوگ بھی بہت اچھی فلمیں بنتی تھیں۔ ہماری فلمیں انڈین فلموں کے مقابلے میں ریلیز ہو کر اچھا بزنس بھی کرتی تھیں پھر ہماری فلم ایک خاص راستے پر چل پڑی جو پنجابی گلیمر کے نام پہ تشدد اور قتل و غارت گری اور فحاشت کو فروغ دینے لگی جس سے ہماری انڈسٹری زوال کا شکار ہوتی گئی۔ اس صورتحال میں مجھے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑی۔ چند برس فلم سینسر بورڈ کا ممبر بھی رہا اس کا تجربہ بھی اچھا نہیں رہا سنسر کیے ہوئے سین بھی سینما گھروں میں چلتے رہتے تھے۔ میں سینسر بورڈ سے بھی مستعفی ہو گیا۔ خواجہ خورشید انور نے مجھے اپنی فلم چنگاری میں شمیم آرا کے ساتھ ہیرو آنے کی بھی پیشکش کی تھی اپنے شرمیلے پن کی وجہ سے میں نے منظور نہیں کی۔

☆ پرنٹ میڈیا سے اہل قلم کی لاتعلقی اور سوشل میڈیا کے بے جا عمل دخل سے اردو زبان و ادب کو کس قسم کے خطرات کا سامنا ہے اور اُن کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

☆☆ پرنٹ میڈیا سے لاتعلقی تو نہیں ہے کتابیں اور رسائل آج بھی شائع ہو رہے ہیں۔ اخبارات میں بھی ادبی صفحات موجود ہوتے ہیں البتہ سوشل میڈیا اور کمرشلزم نے شاعروں کی توجہ اپنی طرف زیادہ کھینچ لی ہے کیونکہ اس میں مالی مفادات بھی شامل ہیں۔ یونیورسٹیوں اور سرکاری اداروں کے مشاعروں کا شمار بھی اسی میں ہوتا ہے۔ یہ سب ہونا بھی چاہیے مگر ہمارے اکثر بڑے مشاعرے بھی اب اس وجہ سے زوال پذیر ہیں کہ ان میں شاعروں کی بجائے مشاعرہ باز شاعروں کی کثرت ہوتی ہے جو عامیانہ سطحی رومان اور جگت بازی کا سامان فراہم کر کے شاعری جیسی اعلیٰ ترین صنف ادب کو تفریح کا ذریعہ بنا رہے ہیں اور اس پر مزاحیہ شاعر تو ہمارے سوقیانہ تھیٹر کے فحش مکالموں جیسے شعر سنانے سے بھی باز نہیں آتے۔ کم از کم ہماری تعلیمی درسگاہوں کو اس کا سد باب ضرور کرنا چاہیے کیونکہ ادب ہماری تعلیم کا بنیادی جز و اور شاعری ادب کا اعلیٰ ترین شعبہ بھی ہے۔

- بقیہ -

سُونی راتوں سے ڈر لگتا ہے

اب پھر آیئے، اس تنہا بچے کی طرف۔

گھر میں کوئی نہیں ہے وہ اکیلا ہے۔ وہ جو در یچہ بھی کھولتا ہے تو اجاڑ گلیوں کے منظر اس کی آنکھوں کے سامن آ جاتے ہیں۔ اس کے لئے زندہ رہنے کا سہارا کیسا ہے اپنی ذات کو ذرا خود سے الگ کر کے محسوس کرنا۔۔۔ میں یہاں ہوں، اس گھر میں۔ تنہا ہوں۔ نہیں۔ یہ آنکھیں ہیں، یہ چہرہ، یہ ہاتھ ہیں۔۔۔ یہ سب کچھ میری ذات سے الگ ہے، یہ میرا سرمایہ ہے، میرے لئے وسیلہ حیات ہے، مجھے ان سے ایسی وابستگی ہے کبھی ٹوٹ نہیں سکتی۔

ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں ہاتھ اور چہروں کے حرف دیکھتی رہتی ہیں آنکھیں، سوچتا رہتا ہوں، میں!!!

یہ آنکھیں، چہرہ، ہاتھ اس کے ہم جلیس بھی ہیں اور انکشاف ذات کا ذریعہ بھی ہے، یہ نقشہ اس کے اپنے گھر میں ہے اور جب گھر سے باہر نکلتا تو یہی آنکھیں، چہرہ، ہاتھ۔۔۔ بہت سی آنکھوں، چہروں اور ہاتھوں میں پھیل جاتے ہیں۔

نذیر قیصر پر تنہا گھر کس طرح اثر انداز ہوا ہے۔ یہ ان سطروں میں دیکھئے جو اس نے مجموعے کے شروع میں درج کی ہیں۔

چراغ جلا کر پیمانے کے نیچے نہیں
بلکہ چراغ دان پر رکھتے ہیں تو اس سے
گھر کے سب لوگوں کو روشنی پہنچتی ہے

مجھے معلوم نہیں، یہ الفاظ کس کے ہیں اور کہاں سے لئے گئے ہیں مگر دیکھنے والی بات یہ ہے کہ گھر نذیر قیصر پر اس طرح اثر ڈال رہا ہے کہ اس نے سورج اور چاند کی طرف توجہ نہیں کی۔ چراغ کا انتخاب کیا ہے جو گھر میں ہوتا ہے اور جس کی روشنی بالعموم گھر کی چار دیواری تک محدود رہتی ہے۔

دوران بینی، اُردو غزل کی سب سے بڑی اور بنیادی روایت ہے نذیر قیصر نے اپنی ذات ہی کے حوالے سے کائنات کو دیکھا ہے۔

میر تقی میر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فکر سخن کے دوران پائیں باغ والی کھڑکی بند رکھتا تھا۔ مگر نذیر قیصر موجودہ دور کا شاعر ہے وہ دریچہ کھول دیتا ہے تاکہ تازہ ہوا اندر آئے۔ یہ ہوا خارجی دنیا کی علامت ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ دریچے کھلنے پر اُجاڑ گلیوں ہی کے منظر سامنے آئیں، جہاں تک اپنی ذات کے حوالے سے انکشاف ذات و کائنات کا تعلق ہے، مجھے نذیر قیصر موجودہ شاعروں میں سب سے الگ تھلگ، سب سے منفرد نظر آتا ہے۔

''نیزے پہ اُبھرا چاند''

۔ جستجو ۔
عطیہ سکندر علی
(سکھر)

دعا

میرے رب مجھ کو تخلیق کر
میں جہاں ہوں، مجھے
اپنے ہاتھوں سے چھو
روشنی، رنگ، خوشبو، ہوا
سب کو غائب سے
ظاہر میں لا
ابر پر پاؤں رکھ
اور کہہ
خاک سبزہ اُگائے
ہرے آئینوں میں
گلابوں کی مشعل جلے
ہوا میں مہک آئے
دریا میں پانی بہے
روشنی تیرگی سے جدا ہو
اور یہ سب
تری آنکھ میں خوشنما ہو

○

بدن ہارے ہوئے لوگو

بدن ہارے ہوئے لوگو!
کہو! کس کے لیے جیتے ہو
دھرتی کے لیے
دھرتی تو قبروں پر فقط کتبے اُگاتی ہے
بدن ہارے ہوئے لوگو!
کہو لفظوں کی گرتی پتیوں سے
کِس گئے موسم کا فسانہ
صدا کے بے نشاں صفحوں میں لکھتے ہو
کہ لفظوں میں تو سارے ذائقے
سب صورتیں۔۔۔سب دن
ہوا کی کم نما قسمت میں جیتے ہیں
بدن ہارے ہوئے لوگو!
کہو! نیزے پہ اُبھرا چاند
کس دن کی شہادت ہے
فیصلوں سے اُبھرتے ہاتھ، کس کا معجزہ ہیں
ٹہنیوں پر خون میں بھیگتے ستارے
کس سفر کی یادگاریں ہیں
بدن ہارے ہوئے لوگو!
کہو کس کھیت میں
کٹ کر گرے ہاتھوں کی مہندی
خوشۂ گندم میں ہنستی ہے
مشقت کا پسینہ، کس تجوری میں چمکتا ہے
دھنک کس کے لہو سے
آسمانوں میں بکھرتی ہے
زمیں کا ذائقہ
کس شجرِ ممنوعہ کی ٹہنی پر
مثالِ زخم کھلتا ہے
بدن ہارے ہوئے لوگو!
بدن ہارے ہوئے لوگو۔۔۔!

○

Peace میموریل میوزیم

(ہیروشیما)

اسے دیکھو
عجائب گھر ہے یہ، دیکھو اسے
جہاں بہتا لہو بہتا نہیں
دھوئیں اور راکھ میں تبدیل ہوتا ہے
جہاں انسان اپنے جسم میں مرتا نہیں
پرچھائیں میں تحلیل ہوتا ہے
اسے دیکھو!
عجائب گھر ہے، یہ دیکھو اسے
جہاں ماؤں کی سوکھی چھاتیوں میں
لہو ریتی سا اڑتا ہے
دعا اور لوریاں
ہاتھوں میں
اور ہونٹوں میں
مرجھائی ہوئی شاخوں کی طرح ٹوٹتی ہیں
عجب تصویر خانہ ہے
جہاں بچوں کی جانب بڑھتی بانہیں رُک گئی ہیں
پرندے اڑنے کی کوشش میں ساکت ہیں
جہاں بہتی ہوائیں منظروں میں رک گئی ہیں
جہاں شیشوں میں چہرے اپنی آنکھیں کھو چکے ہیں
جہاں معصوم ہونٹوں پر صدائیں رُک گئی ہیں
کتابوں سے بھرے بستے
جلی لاشوں کے پیروں میں پڑے ہیں
چنبیلی جیسی آنکھوں میں
ہوا کے ٹوٹتے نیزے گڑے ہیں
جہاں بچوں کے ہاتھوں میں
کنول کے پھول
جل کی بوند
تتلی کی دھنک
گندم کی خوشبو
چاند کا ہالہ
بکھرتی راکھ ہیں
اس راکھ سے
دن اپنی آنکھیں چُن رہے ہیں
عجب تصویر خانہ
جہاں بارود کی بارش
فرشتوں کے بکھرتے ٹوٹتے جلتے پروں پر تھم گئی ہے
پگھلتے آسماں کی چاندنی
خوابوں کی پیاسی جھیل کے نیلے لبوں پر جم گئی ہے
قسم ہے صبح کی
زیتون کی
اور امن والے شہر کی
لاہور سے اب ہیروشیما تک
کراچی سے اوڑیسا تک
میں دنیا بھر کا شہری ہوں
دیئے جلنے سے بجھنے تک
یہ سارے جشن میرے ہیں
یہ سارے سوگ میرے ہیں
یہ سارے لوگ میرے ہیں۔۔۔!

○

خالی پن

لمبی قطار تھی
سب سے پیچھے رات کھڑی تھی
سب سے آگے
رنگوں روشنیوں سے چھلکتا
اک درپن تھا
جس میں بہتا
اجلے دن کا خالی پن تھا
رات کھڑی تھی دن بہتا تھا
رات اور دن کے باغیچے میں
سائے اُگے تھے
سایوں کے ہاتھوں میں چمکتی
اک تلوار تھی
اور تلوار پہ ٹنگا ہوا
اک ہار تھا جس میں
پھول کھلے تھے

○

دن کا لباس

کس نے تن سے رات اتاری
اور دن پہن لیا
سورج کے گرداب میں
آنکھیں پگھل گئیں
دو ہاتھوں کی اوک سے
دریا چھلک گیا
دھوپ کی مچھلی
جال میں آ کے نکل گئی
سایوں کے ساحل پر آ کے
ننگے پاؤں ہار گئے
کون لوگ تھے
جو آنکھوں سے پار گئے
شام کنارے
اجلی دھوپ میں
دن کا لباس اتار گئے

○

میں اپنی قبر کی مٹّی لیے پھرتا ہوں

میں اپنی قبر کی مٹّی لیے پھرتا ہوں
میرے سامنے
آنے والی زندگی کے وہم کی زنجیر میں
جکڑے ہوئے شام و سحر کے دائرے میں
میرے قدموں سے زمیں لپٹی ہوئی ہے
میرے سر پر آسماں ننگا پڑا ہے
میں ہوا کے ساتھ چلنے کی کشش میں قید ہوں
میری آنکھوں میں
سفر کے روز و شب ٹھہرے ہوئے ہیں
میری گردن میں ہوس کا طوق ہے
میں خود اپنے قتل کی سازش میں شامل ہوں
زمیں کا ذائقہ میری سزا ہے
ستارے توڑنے کی آرزو کب تک۔۔۔؟
ہوا بے رنگ ہے
دُوری کے نوحے سلسلہ در سلسلہ پھیلے ہوئے ہیں
میں اندھیری رات کے پاتال میں
دم توڑنے کی کشمکش کا راز ہوں
میں تری آواز ہوں

○

زمین کے جاگنے کے دن ہیں

زمین کے جاگنے کے دن ہیں
گئے دنوں کی اُداس خوشبو کا
ماجرا لکھنے والی شاخیں
ہوائیں پہنے، بُریدہ سر ہیں
برہنہ پا ہیں
حیات کی سجدہ گاہ میں
آخری دعا ہیں
فلک کے نیچے
جلی سیہ خاک کے لبوں پر
کرن کرن بیج ڈالتے
صبحوں کے پرندے
ڈھلی ہوئی شب کے دائروں سے
گزر رہے ہیں
سمندروں میں گلاب کھلنے کا ذکر سن کر
مسافروں کا لباس پہنے
ہوائیں خوشبو کی جستجو میں نکل پڑی ہیں
ستارے رنگوں کے دھندلے پانی میں
ٹوٹ کر گر رہے ہیں
لہروں میں مشعلیں تھرتھرا رہی ہیں
فضا کے مٹیالے آئینے سے
ابھرتے چہروں میں سبز آنکھیں کھُلی ہوئی ہیں
صحیفے مٹی سے اُگ رہے ہیں
زمین جاگنے کے دن ہیں

○

میں اُن کے ساتھ ہوں

میں اُن کے ساتھ ہوں
جو سولیوں پر ڈولتے سایوں کا ماتم ہیں
میں اُن کے ساتھ ہوں
جو تیغ کی دہلیز پر لفظوں کا موسم ہیں
میں اُن کے ساتھ ہوں
جو آنگنوں میں دن کا سایا،
کشتیوں میں جال،
اور کھیتوں میں بارش چھوڑ کر بے گھر ہوئے ہیں
میں اُن کے ساتھ ہوں
جو زینہ زینہ لڑکھڑاتی رات کے ہاتھوں میں
خوابوں کا پیالہ ہیں
سلگتے رتجگوں میں آتی صبحوں کا حوالہ ہیں
میں اُن کے ساتھ ہوں

○

اداس موسم میں ایک نظم

کون روک سکتا ہے
خوشبوؤں کی راہوں کو
خاردار تاروں سے
کون کاٹ سکتا ہے
آنے والی کرنوں کی
اُنگلیاں کٹاروں سے
صبح چھپ نہیں سکتی
اَبر کے حصاروں سے
زخم زخم شاخوں میں
پھول کھلنے والے ہیں
خامشی کے چہرے پر
ہونٹ ہلنے والے ہیں

○

میتھوں رب عبادت منگدا

امرتا پریتم

(●)

مان لیا کہ پہلا حرف خدا کا نام ہے اور دوسرا مدت کی پرچھائیں کا مگر میری مبارک باد تیسرے حرف یعنی نذیر قیصر کو ہے جسکی ذات کا چراغ ہر جگہ روشن ہے۔

ہماری دنیا کی گلیاں جن حقیقتوں سے آباد ہیں یعنی برباد ہیں شاعر ان گلیوں سے گزرتا ہے۔

انج لگدا اے گھراں دے اندر جیویں لوکی مر گئے نیں
ہر بوٹے تے جا کے وانے ہوکا بھرنا پیدا اے

اور ایسے لگتا ہے کہ یہاں سماج اور سیاست کی آنکھیں گہری نیند سو رہی ہیں یہاں صرف شاعر کی اداسی جاگتی ہے۔

اساں لایا سی ون دا بوٹا
ویڑے وچ بندوق اگ پکی

یہ سب کیوں ہوا اور کیسے ہوا یہ جاننے کے لئے تیسرے حرف کی چیتنا (شعور) پہلے حرف کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔

میریا ربا
میریا ربا
توں مینوں کیوں چھڑدتا اے؟
میرے ہتھاں تے پیراں وچ
کلیاں کیوں نیں؟
میری کنڈ تے سولی کیوں اے؟
میرے آسے پاسے
روندے لوکاں دے پرچھاویں کیوں نیں؟

اُشو نے کہا تھا کہ مجھے کرائیسٹ اور کرشن دونوں ایک ہی لگتے ہیں دونوں کے ناموں کی صوت بھی ایک سی ہے۔ نذیر قیصر کی ذات میں وراٹ روپ کی طرح بہت سی آوازیں شکلیں بہت سے رنگ بہتی روشنیاں اور خوشبویں مجسم ہوگئی ہیں یہی چترکار کی رچنا بھی ہے اور تمنا بھی۔۔۔

شاعر یسوع نہیں ہوتے مگر یسوع کی قسمت بسر کرتے ہیں انہوں نے سوال بھی خود تخلیق کرنا ہوتا ہے اور اس سوال کا جواب بھی خود ہی تلاش کرنا ہوتا ہے۔ یہی Reahzation ان کی قربانی ہوتی ہے۔

میتھوں رب عبادت منگدا
اب توں رحمت منگاں میں
دوہاں دے ہتھاں وچ کاسہ
کیہڑے پاسوں لنگاں میں
سوچ رئیا ہاں کیڑا کاسہ
کیہڑی سولی، ٹنگاں میں
آخر اپنا خالی کاسہ
اپنے ہور وچ رنگاں میں

یہی اپنے لہو میں بھیگے ہوئے خواب دنیا کی بڑی شاعری بناتے ہیں شاعر حرف و معانی کی رات جیسی کالی گٹھڑی اپنے سر اُٹھائے ہوئے رات ہوا اور پر چھائیوں کے پیچھے ڈوبے ہوئے سورج سے سوال کرتا ہے کہ ہماری دنیا کی تاریخ کا دن ہر روز چڑھتا اور ڈوبتا ہے مگر انسان کے مستقبل کا دن کب طلوع ہوگا؟

امن محبت اور خوبصورتی والا دن کب رات کے دروازے پر دستک دیگا؟

اور امن کا سفید کبوتر اپنی چونچ میں زیتون کی پتی لے کر کب اڑتا ہوا آئے گا؟ بس یہی امید اور خوبصورت خواب نذیر قیصر کی شاعری کا معجزہ ہے اسی لئے میری مبارک تیسرے حرف یعنی نذیر قیصر کو ہے کہ اس رات میں بھی اسکا چراغ روشن ہے۔

نذیر قیصر کا ایک شعر ہے:

طاق وچ جگدی اکھ ورگا میں
شیشاں وچ نقاب ورگا توں

وہ نقاب جیسی سیاہ رات کے طاق جاگتی آنکھ جیسا دیا جس کے لیے دعا مانگتی ہوں۔

وے میں بتیاں وٹا رکھدی
دیوا بلے ساری رات

آلۂ قتل

قلم دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے، تلوار، بندوق اور ایٹم بم سے زیادہ خطرناک۔۔۔لیکن اب قلم کرایہ پر چلنے لگے ہیں۔قلم کی خرید و فروخت ہونے لگی ہے۔قلم کی خصوصیات رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی ہیں۔ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب قلم محض ایک آلۂ قتل بن کر رہ جائے گا جس سے لوگ تہذیب و تمدن کا دامنِ عفت تار تار کرنے کے ساتھ انسانیت کی تکا بوٹی کیا کریں گے۔

نریش کمار شاد

خودکودیکھنے کی آرزو

سجاد باقر

(●)

نذیر قیصر کا یہ شعری مجموعہ اس عہد کے طرزِ احساس کی ایک اہم دستاویز ہے۔اس کی اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ نذیر قیصر نے پرانی زبان سے نئے تناسبات و تلازمات بنائے ہیں۔اور یوں اپنی شعری زبان وضع کی ہے۔اس نے نئے جذبات کی تلاش نہیں کی ہے بلکہ لافانی انسانی احساسات سے شعری ہیئتیں اور وضعیں بنائی ہیں وہ نہ احمد ندیم قاسمی اور ناصر کاظمی سے شرمندہ ہے اور نہ غالب اور اقبال سے وہ اپنے ہمعصروں سے بھی ہمکلام ہے اور ماضی کے عظیم فنکاروں سے بھی،اس کے یہاں عصری شاعری کی گونج بھی ہے اور ماضی کے اساتذہ کی بھی،مگر یہ گونج ہے متتبع نہیں۔

آئینے گرد و ہم ہیں شکلیں قیاس ہیں
ہیں خواب میں،ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

نذیر قیصر کی شاعری کے بنیادی احساسات، حیرت، حسن سے مسحور ہونے کی کیفیت، تنہائی، خوف، خود کو سمیٹنے کی خواہش اور خود شناسی کی کوشش ہیں، وہ کسی منظّم معاشرے کا منظّم فرد نہیں ہے۔خدا اور بکھری پھیلی ہوئی کائنات میں ایک تنہا ذات، اسی باعث نذیر قیصر کی شاعری میں ایک آشوب کی سی کیفیت ملتی ہے۔وہ اپنے آشوبِ ذات کے ساتھ پوری کائنات میں اپنے معانی کا متلاشی ہے اسے سہارا ہے تو محض حسن کا اور احساسِ حسن و جمال ہی اس کی ٹوٹتی بکھرتی ہوئی ذات کا تنظیمی اصول ہے۔

چونکہ نذیر قیصر منظّم معاشرے کا منظّم شاعر نہیں ہے اس لئے وہ محض اپنی ذات کے حوالے سے کائنات کی ہر شے کے ساتھ رشتہ استوار کرنا چاہتا ہے۔انسانی رشتے، معاشرتی اقدار اور روحانی ضابطوں کی شکست کے باعث اس کی تنہا ذات پوری کائنات کے تلازموں اور تناسبات کو از سرِ نو مرتب کر رہی ہے۔اور یوں خود اپنے معانی متعین کرنے کی کوشش میں ہے۔اس کاوش کا حاصل احساسِ تنہائی اور خوف ہے جس کا اظہار اس کی شاعری میں جگہ جگہ ملتا ہے۔

بکھرے ہوئے چہروں میں کھڑا سوچ رہا ہوں
آنکھیں نہ رہیں گی کہ تماشا نہ رہے گا!

دستکیں دیتے ہیں دائم روز و شب کے سلسلے
خامشی باب کہتی ہے کوئی گھر میں نہیں

اِسی احساسِ تنہائی اور خود اپنے اور اپنے لئے کائنات کے معانی متعین نہ ہونے کے باعث نذیر قیصر کبھی حیرت اور کبھی بے بسی سے چیخ اُٹھتا ہے۔

میں کیا ہوں آئینہ لوحِ آب و گِل کیا ہے
کیا ہے کس نے مجھے آشکار کس کے لیے

مہ و نجوم کی شمعیں ہیں کس کے ہاتھوں میں
ہوئی ہے شام سفر زرنگار کس کے لیے

اے ماورائے فکر، اب آواز، دے کہ ہم
خود سے بچھڑ گئے ہیں، تجھے ڈھونڈتے ہوئے

دل کی تختی سرِ بازار لئے پھرتا ہوں
کاش اس پر تری تصویر بنا دے کوئی

نذیر قیصر کی شاعری کے بنیادی استعارے آئینہ، صدا، ہوا، مشعل، خوشبو، نغمہ، بادل، سورج، سایہ، آنکھ، ہونٹ، ہاتھ، چہرہ حرف کتاب ہیں۔گویا یا تو اپنی ذات ہے، یا فطرت کی قوتیں اور ان قوتوں میں گھرا ہوا شاعر اپنے حسن و جمال کا متلاشی اپنے لفظوں کی مدد سے خودآگہی کی منزلوں کی طرف گامزن ہے۔اسے نہ معاشرے کا احساس ہے اور نہ معاشرتی اقدار کا سہارا۔بس ایک تنہا سفر ہے۔ایک طویل روحانی سفر جس پر شاعر گامزن ہے۔

بکھر گیا میرا چہرہ پگھل گئیں آنکھیں
اب اس حجاب سے باہر نکل خدا کیلئے

ہر ایک چہرے پہ آنکھیں پگھلنے لگتی ہیں
یہ شہر ہے کسی گم گشتہ آشنا کی طرح

سسکتا رہتا ہوں الفاظ کے ہیولوں میں
کوئی لباس نہیں پیکر صدا کے لیے

اگر شاعری کے پاس لے دے کر اپنی ذات ہی رہ جائے تو دنیا کے معانی بھی اسی حوالے سے متعین ہوں گے تاہم پہلی منزل خود شناسی کی ہوگی اور نذیر قیصر اپنی جستجو میں ہے:

پوچھتا پھرتا ہوں اپنی چاپ سے اپنا پتہ
ماسوا اس کے کوئی سودا مرے سر میں نہیں

رات دن رہی ہے خود کو دیکھنے کی آرزو
اور یہ بھی جانتا ہوں آئینہ گھر میں نہیں

جدا کرتی نہیں مجھ سے مجھے بہتی ہوئی لہریں
میں اپنا عکس پانی میں بہا کر دیکھ لیتا ہوں

اور پھر کائنات کامفہوم اپنی ذات کے حوالے سے:

مجھ میں لرزاں ہیں بدلتے موسموں کی صورتیں
آئینہ ہوں اور ہوا کے سامنے رہتا ہوں میں

آوارہ موسموں کے بگولوں کے ساتھ ساتھ
پھرتا ہے کوئی مجھ کو ہوا در ہوالیے!

خوشنما لگتے ہیں مجھ کو رت جگے برسات کے
گھومتا پھرتا ہوں تنہا جگنوؤں کے ساتھ ساتھ

اس کے باوجود اندھی طاقتوں کے درمیان گھرا ہوا شاعر احساسِ جمال کی روشنی میں شعری سفر طے کرتا ہے:

خوشبو کی طرح تھام کے چلیئے ہوا کا ہاتھ
مثلِ غبار بوجھ فضا پر نہ ڈالیے

مگر یہ روشنی شاعر کے ساتھ مستقل طور پر نہیں رہتی۔ اس کے احساساتی سفر میں چند جگنو ہیں جو کبھی کبھی چمک جاتے ہیں باقی محرومیوں کا اندھیرا اور تنہائی کا خوف ایک Fantasy کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ہلتے ہیں کشتیوں کی طرح گھر ہوا کے ساتھ
یہ شہر پانیوں میں کہیں تیرتا نہ ہو!

یوں ڈر رہا ہوں شام کے خالی مکان میں
جیسے زمین پر کوئی میرے سوا نہ ہو!

یہ شہرِ طلسمات ہے آئینہ بہ دیوار
آئینوں میں ٹھہری ہوئی شکلوں سے گزر جا

اس کے باوجود نذیر قیصر کی غزلوں میں محض محرومی اور نا اُمیدی نہیں ہے۔ احساسِ جمال اس کو اس کی ذات کے حصار سے باہر بھی نکال لاتا ہے۔ اور اس طرح اس کی شاعری میں اُمید کی ہلکی سی کرن نظر آتی ہے گو جہاں تک اس کتاب کا تعلق ہے یہ روشنی مدہم ہے تاہم نذیر قیصر کی شاعری کی ایک سمت سمیت یہ بھی نظر آتی ہے۔

یہ کس مقام پر لے آئی آشنائی تری
اب آئینہ بھی مجھے اجنبی سا لگتا ہے

کبھی کبھی تنہائی میں یوں لگتا ہے
جیسے کسی کا ہاتھ ہے میرے شانوں پر!

دل میں صاف نظر آتے ہیں نقشِ قدم
کوئی اس سنسان کھنڈر میں رہتا ہے

میں تو سچ مچ پاگل سا ہو جاتا ہوں
جانے کیسا دکھ ہے اس کی آنکھوں میں

میں بھی تھا رہگزر خاک و ہوا میں لیکن
مجھ کو ایک دستِ حنائی نے بکھرنے نہ دیا

یوں نذیر قیصر کی شاعری میں اس کی اپنی ذات کے علاوہ ایک اور ذات چپکے سے داخل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے عشق کہہ لیں۔ مگر اس کتاب میں اس کی کوئی واضح شکل نہیں ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جذبہ عشق شاعر کو معاشرتی زندگی کی طرف لے جائے گا اور اس جذبہ کے حوالے سے نذیر قیصر کو معاشرتی احساس کے ساتھ ہم آہنگ کر سکے گا مگر ابھی یہ محض ایک سمت ہے۔

غریبوں کو جگا دو

جب واپڈا والوں سے کہا جا کے کسی نے
یہ کس نے کہا ہے ہمیں راتوں کو سزا دو
بولے ہمیں اقبال کا پیغام ملا تھا
اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
اور اُٹھتے ہوئے باس نے یہ اور کہا تھا
کاخِ اُمراء کے در و دیوار سجا دو
کاخِ امرا کے کہیں فانوس نہ بُجھ جائیں
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
جس زون سے ورکر کو میسر نہ ہو روزی
اس زون میں گنڈوں کا چلن اور بڑھا دو
جو بندۂ مومن نہ ہو سَیٹنگ پہ راضی
دو لاکھ کا بل ہاتھ میں تم اِس کے تھما دو

پروفیسر عنایت علی خان

آنکھیں، چہرہ، ہاتھ

جیلانی کامران

(●)

اس زمانے میں جب روایت کو ماننے اور توڑنے کی باتیں ہو رہی ہیں اور شاعری کا مسئلہ غیر شعری خیالات میں گھر چکا ہے، غزل پر گفتگو کرنا در حقیقت فکری خامیوں اور روایت کی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے کے برابر ہے۔ نئی نظم کو شعری تخلیق کا محور بنانے والے اس سچائی پر مصر ہیں کہ غزل ختم ہو چکی ہے اور زمانے کی پیچیدہ اُفتادِ طبع کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ غزل کی تقدیس کا خیال رکھنے والے ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور ثبوت میں نئی غزل پیش کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ غزل اب بھی لکھی جا رہی ہے اور نئے نئے مضامین اب بھی اس کے مافی الضمیر میں پہلے ہی کی طرح موجود ہیں۔ تاہم سوال یہ ہے کہ جسے نئی غزل کا نام دیا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ اور اس کے مضامین کون سے ہیں جن کو پڑھ کر معلوم کیا جا سکے کہ پرانی غزل کے مقابلے میں یہ غزل نئی ہے!

آج سے دو تین برس پہلے میرا تعارف نذیر قیصر کی غزلوں سے ہوا۔ اُس وقت نئی غزل کا تصور بہت دھندلا تھا۔ غزل اپنے مروجہ درسی مفہوم میں بُری طرح گرفتار تھی اور اس صنفِ سخن پر گفتگو کرتے ہوئے عموماً معاملاتِ عشق کو مرکزی اہمیت دی جاتی تھی۔ بعض کا خیال تھا کہ میر تقی میر کو اس زمانے میں از سرِ نو متعارف کرنا نئی غزل لکھنے ہی کی صورت ہے۔ جو لوگ بات کو نہیں مانتے تھے وہ کہتے تھے کہ مذہب اور تصوف کی اشاراتی زبان کو غزل کی روایت میں سمو کر وہ مقصد پورا ہو سکتا ہے جو نئی غزل کے ساتھ وابستہ ہے۔

مجھے اس امر سے اختلاف نہیں کہ اردو غزل میں تجربے اور واردات کو جذب کرنے کی بڑی صلاحیت ہے۔ اس صلاحیت کی تائید میں اردو غزل کی تاریخ کو پیش کیا جا سکتا ہے مگر مجھے اس امر سے اتفاق نہیں ہے کہ اردو غزل صرف ایک ہی مخصوص واردات کو بیان کرنے کی مجاز ہے یعنی غزل صرف انہی سچائیوں کی شاعری ہے جو چھن چکی ہیں۔ محبوب جو بچھڑ چکا ہے۔ جوانی جو جا چکی ہے اور بستیاں جو اُجڑ چکی ہیں۔ غزل کی دنیا خزاں کی نفسیات سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور عمر خیام اور میر کی، درد کی دنیاؤں میں ناپید ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے ایسے تجربے کی کوئی قیمت ہو اور بعض لوگ اسے انسانی زندگی کا بنیادی تذکرہ بھی کہیں، لیکن حقیقت یہ ہے۔ الفاظ کی طرح ذکرِ محبوب کے تذکرے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ اور جس قسم کا تذکرہ غزل کا مافی الضمیر بن چکا ہے اس کی بنا پر یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ غزل کی روایت نے نہ صرف نفی کا ذکر کرتے ہوئے مرگِ محبوب کا تصور پیدا کیا ہے بلکہ انسانی زندگی کو تمیزِ نور و ظلمت سے بھی محروم کر دیا ہے۔

تمیزِ نور و ظلمت سے محرومی اس غزل کا مرکزی مزاج ہے جو آزادی کے بعد لکھی گئی ہے اور بدستور لکھی جا رہی ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ جب اُجالے اور اندھیرے کا فرق باقی نہیں رہتا اس وقت جھوٹی صبح کی سی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ غزل لکھنے والے اس صبحِ کاذب میں اٹھتے بیٹھتے، روتے اور ہنستے ہیں۔ اور یوں لگتا ہے جیسے دیوانگی رات اور دن کے سنگم پر ہر شے کا مذاق اڑا رہی ہے۔ زندگی کا سفر بے معنی ہے اور انسان دھوکے میں بدل چکا ہے۔ یہ تاثر کچھ اتنا شدید ہے کہ دیکھنے والا اسے سچائی سمجھ لیتا ہے مگر صبحِ کاذب کی روشنی کے مانند یہ سچائی بھی فریب اور جھوٹ بن جاتی ہے۔

میں نے جس صبحِ کاذب کا ذکر کیا ہے اس کا ذکر اس زمانے کی غزل میں عام ہے میں لکھنے والوں کا نام نہیں لوں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ غزل لکھنے والوں نے جس نئے جذباتی جغرافیے کو پیدا کیا ہے اس میں تپتی دوپہر، سنسان گلیاں، ویران مکان، ریت کے ٹیلے، بند دروازے، ٹوٹے ہوئے در و بام اور مکینوں کے بغیر محل اور چوبارے شامل ہیں۔ ایسے مناظر پر شام اُترتی ہے اور پھر رات آتی ہے اور رات کے ساتھ نہ تو کوئی کھڑکی کھلتی ہے اور نہ کوئی لڑکی روشنی کی کرن بن کر جگمگانے لگتی ہے۔ رات کے پرندے آتے اور گزر جاتے ہیں۔ اور ہر لمحہ اپنے ماضی کی پوشاک پہن کر پہلے ماضی بنتا ہے اور پھر آنے والا زمانہ بن کر دنیا پر چھا جاتا ہے۔ ایسا جذباتی جغرافیہ ہر اعتبار سے دشتِ وحشت کا جغرافیہ ہے!

اگر شاعر سے پوچھا جائے کہ یہ دشتِ وحشت کہاں ہے؟ تو وہ جواب میں کہتا ہے یہ دشت ہر جگہ ہے، قائم اور موجود ہے۔ اسے تلاش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ ہے اور ''ہے'' کو ثابت نہیں کیا جا سکتا، اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اور محسوس کرنے کے بعد اس دشتِ وحشت کو ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ لوگ اس دشتِ وحشت کو پہچاننے سے خوف کھاتے ہیں اور جہاں اس دشت کی سرحد کھلتی ہے اسے نام دینے سے گھبراتے ہیں کیونکہ اس دشتِ وحشت کا حلیہ باطنی ہے اور اس کا ظاہر شہروں، قصبوں اور انسانوں کا تھکا ہوا جلوس ہے۔

ادبی تنقید اس دشتِ وحشت کو کس نام سے پکارتی ہے؟ کیا یہ دشتِ وحشت کسی نفسیاتی مرض کا اظہار ہے؟ یا اسے سچائیوں کی کوئی منفرد شکل کہا جا سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دشتِ وحشت غزل کے فلسفے ہی کا ایک حصہ ہے۔ ایک ایسا ادبی فلسفہ جس کی بنیاد ہجر و جدائی پر قائم ہو، دشتِ وحشت کو برآمد کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ جب زمانہ نہیں رک سکتا تو محبوب اور شاعر دونوں، زمانے کی رفتار سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ اس لیے محبوب چلی جاتی ہے۔ مکان ویران ہو جاتے ہیں اور شاعر اپنی جوانی کے کفن پر ابجد تحریر کرنے لگتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے لکھے ہوئے ابجد انسانوں کی زندگی پر کیا اثر ڈالتے ہیں۔ ہر نسل اپنے لیے نیا محبوب، نیا مکان اور نیا اظہارِ عشق دریافت کرتی ہے۔ اس لیے ہر شاعر کا تجربہ فوری طور پر متروک ہو جاتا ہے اور ویران مکانوں کی جگہ نئے شہر آباد ہو جاتے ہیں!

دہشتِ وحشت محض ایک دھوکا ہے!

لیکن دھوکے سے آزاد ہونا بھی کسی طرح آسان نہیں ہے۔غزل کے ساتھ سب سے بڑی دقت یہی ہے کہ اسے دھوکے اور سچائی کے مابین فرق دکھائی نہیں دیا۔اس لیے ہر لکھنے والے نے غزل کو قبول کرتے وقت دشتِ وحشت کو قبول کیا ہے۔اور تجربے کو غلط انداز میں ڈھال کر زندگی کو رد کرنے کی سعی کی ہے۔

(۲)

نئی نظم کی مخالفت کرنے والے شاعری کی نئی تحریک کو بُرا بھلا کہتے وقت یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ نئی نظم نے اپنے ہمراہ نئے خیالات کی تحریک کو بھی پیدا کیا ہے۔نئی نظم نے فلسفۂ ظہور کی از سرِ نو تشریح کی ہے۔ظہور حقیقتِ کُلّی ہے۔اور اس کا مرکز ہر مقام پر ہے۔شاعر، شہر اور کائنات تینوں اس حقیقت کے تابع ہیں اور اس کا جزو ہیں۔اس لیے جب یہ مان لیا جائے کہ ظہور مستقل ہے تو یہ تسلیم کرنا بھی فرض ہے کہ ہر نیا ظہور ترتیب لاتا ہے۔اور نئی ترتیب اُسی طرح پائیدار ہے جس طرح ظہور مستقل اور پائیدار ہے۔ظہور کے فلسفے کو ماننے کے بعد ماضی کی وابستگی غلط ثابت ہوتی ہے کیونکہ ظہور کے دونوں نقطے دو علیحدہ سچائیاں بیان کرتے ہیں۔اس لیے ماضی اور حال الگ نہیں ہوتے بلکہ ظہورِ کل کا جزو بن کر ایک جامع تجربہ پیدا کرتے ہیں۔ایسی صورت میں دشتِ وحشت ظاہر نہیں ہوتا۔انسان ہر لمحے کے ساتھ ایک نئی حیرت سے آشنا اور آگاہ ہوتا ہے۔جس غزل کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ظہور کے فلسفے کو قبول نہیں کرتی بلکہ تغیر کے فلسفے کو قبول کرتی ہے۔تغیر دراصل ظہور کے تابع ہے اور اس کا اپنا کوئی بھی نام نہیں ہے جسے موت کہتے ہیں وہ بھی ایک طرح کا ظہورِ آخرت ہے!

نذیر قیصر کی غزلوں میں سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ ان کی دنیا دشتِ وحشت کی دنیا نہیں ہے۔یہ صفت بے حد مقدس اور قیمتی ہے کیونکہ غزل کی دشتِ وحشت سے رہائی دلانا آسان کام نہیں تھا۔فکری جمود خواہ کسی بھی نوعیت کا کیوں نہ ہو۔تجربے کے جمود کو ضرور پیدا کرتا ہے اور میرے خیال میں جس دشتِ وحشت میں ہمارے غزل گو (اور ایک حد تک نئی نظم کے پرستار) ہوئے ہیں وہ تجربے کے جمود کا ہی نتیجہ ہے۔نذیر قیصر کی شعری دنیا میں تجربے کا جمود ٹوٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور پہلی بار انسان اپنے آپ کو کائنات کی بارگاہ میں جاگتا ہوا محسوس کرتا ہے۔جو سوالات نذیر قیصر نے پوچھے ہیں۔اور جن تجربوں سے اس کا سابقہ پڑا ہے ایسے ہیں جو ہر اعتبار سے نئے ہیں۔اور ان کے نئے ہونے کا انعام اُن فکری تحریکوں کے حصے میں بھی آتا ہے جو اس زمانے میں ادب و فکر میں ظاہر ہو رہی ہیں۔

میں نذیر قیصر کے بارے میں اپنی طرف سے باتیں کر کے وہ حق چھیننا نہیں چاہتا جو قاری ہونے کی حیثیت سے صرف آپ کا حق ہے۔میں آپ کی رائے کو بے وجہ متاثر کرنا نہیں چاہتا۔مگر اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ نذیر قیصر کی غزلوں میں ایک نیا انسان ظاہر ہو رہا ہے اور ایک نئی دنیا واضح ہو رہی ہے۔درختوں، پھولوں، خوشبوؤں، موسموں اور شاخوں میں جھانکتا ہوا انسانی چہرہ ایک نئی صداقت ہے۔اور یہ صداقت ہمارے دور کی غالباً سب سے بڑی سچائی ہے۔

اسے زمین کے ساتھ ایک نیا تعلق کہہ کر بھی پکارا جا سکتا ہے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک لمبے عرصے کے بعد ہمارا شعری روایت میں انسان نے خود کو کائنات میں جھانک کر پہچاننے کی صرف اسی زمانے میں کوشش کی ہے۔اس اعتبار سے یہ غزلیں فلسفۂ ظہور کی پیروی کرتی ہیں اور دشتِ وحشت کی بجائے وادیٔ حیرت کی خبر دیتی ہیں!

کائنات کے ساتھ ایک نیا رشتہ قائم کر کے انسان کبھی مایوس نہیں ہوتا۔نذیر قیصر کی غزلوں میں مایوسی نظر نہیں آتی بلکہ ظاہر اور غیر موجود کا شعری جغرافیہ دکھائی دیتی ہے۔اس دنیا کا ایک مزاج ہے جسے صرف خاموشی بیان کرتی ہے۔اور دیکھنے والے اور تلاش کرنے والے انسان کا نام دے کر پکارتی ہے۔یہ نام جامد نہیں بلکہ ہر لمحے کے ساتھ بدلتا ہے اور ہر لمحے کے ساتھ کائنات اس نام کو اپنا محرم بنا کر اپنی دنیا میں داخل ہونے کی اجازت دیتی ہے۔کائنات جابر نہیں دوست ہے۔اور اسی رشتے کی بنا پر اشیا کبھی آشکار ہوتی ہیں۔شاعر کی آنکھیں ان کے کھوج میں نئے رازوں سے واقف ہوتی ہے اور شاعر کو موسموں کی رُوداد کا علم ہوتا ہے۔یہ رُوداد کیا ہے؟ میں کون ہوں؟ کیوں زندہ ہوں؟ کیوں سوچتا ہوں؟ یہ سوالات لوحِ عالم پر رونما ہوتی ہوئی صورتوں کی موجودگی میں گونجتا ہے۔یہ صورتیں کیا ہے؟ یہ چہرہ کس کا ہے؟ اور یہ پھیلی ہوئی آنکھیں کیا ہیں؟ شاعر اس نئے عالم میں ایک نئے تجربے میں سے گزرتا ہے اور یہ تجربہ نئی غزل کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے!

زندگی کا ایک نئے محسوساتی مرکز سے سمجھنے اور چیزوں کو ایک نئے نام سے پکارنے کے لیے وادیٔ حیرت کا سفر ضروری ہے۔نذیر قیصر کی شعری دنیا میں اس سفر کی کہانی زندگی کا ایک نیا احساس بن کر ظاہر ہوتی ہے۔نذیر قیصر کی غزلیں اقرار کی غزلیں ہیں اور جینے کا سب سے بڑا اقرار زندگی کو مقدس سمجھنے کا اقرار ہے، ورنہ کون ہے جو نہیں جانتا کہ فنا کا لہو زندگی بھر کڑواہٹ دیتا ہے۔اور اس کڑواہٹ کو صرف زیست کے اس موسم سے دُور کیا جا سکتا ہے جسے شاعر جوانی کہتے ہیں مگر نذیر قیصر کی زبان میں وہ سچائیوں کا ایک نیا کشف بن کر ظاہر ہوتا ہے۔

دل یا جگر

ایک برطانوی تحقیقی ادارے نے اٹھارہ سے پینسٹھ سال کی تین ہزار خواتین کے مشاہداتی مطالعہ کی روشنی میں بتلایا ہے کہ خواتین کوئی بھی راز سینتالیس گھنٹے سے زیادہ خود تک محدود نہیں رکھ سکتیں۔تحقیق کے مطابق سینتالیس گھنٹے گزرنے کے بعد خواتین کے دل اور دماغ میں خاص طرح کی بے چینی اور بے کلی عود کر آتی ہے جس کا صدباب وہ دل میں چھپے راز کو دوسری خواتین سے شیئر کر کے کیا کرتی ہیں۔

فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا جگر

سُونی راتوں سے ڈر لگتا ہے

میرزا ادیب

(۰)

''آنکھیں، چہرہ، ہاتھ نذیر قیصر کے اولین شعری مجموعے کا نام ہے۔نذیر قیصر ہمارے شاعروں کی جدید ہی نہیں جدید ترنسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ان سے روایت شکنی کی توقع رکھنا کوئی غیر متوقعانہ امر نہیں ہے۔تاہم اپنی غزلیات کے لئے'' آنکھیں، چہرہ، ہاتھ'' کا نام تجویز کرنا ایک ایسے طبعی رجحان کی طرف واضح اشارہ کرنا ہے جسے فلسفیانہ اصطلاح میں ذہنی اُلجھن کہتے ہیں۔اور کہہ سکتے ہیں! میں نے مطالعے کے لئے جب اس کتاب کو ہاتھ میں لیا تو سب سے پہلا سوال میرے دل میں اُبھر کر نذیر قیصر کی قلبی کیفیت کیا ہے جو اس عجیب وغریب نام کے پسِ پردہ برسرِ عمل ہے اور اس کے کلام میں ا س کیفیت کی نشان دہی کس طرح اور کس کس انداز میں ہوتی ہے۔

محترم احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں۔

'جذبہ واحساس کی اتنی نزاکت اور شدت کے موثر اور کامل اظہار کے لئے بعض علامتیں ناگزیر ہو جاتی ہیں، مگر علامتوں کا انتخاب بہت کڑا مرحلہ ہے۔ بہت کم نوجوان شعراء اس مرحلے کو کامیابی سے طے کر پاتے ہیں۔ نذیر قیصر کو علامتوں کی تلاش میں بہت تکلیف نہیں کرنا پڑا۔اس نے آنکھوں، چہروں اور ہاتھوں سے وہ سب کام لئے جو دوسرے شعرا، غیر مرئی اور غیر زمینی علامتوں سے لیتے ہیں۔''

اور پروفیسر جیلانی کامران، پیش لفظ میں فرماتے ہیں۔

نذیر قیصر کی غزلوں میں ایک نیا انسان ظاہر ہو رہا ہے اور ایک نئی دنیا واضح ہو رہی ہے درختوں، پھولوں، خشبوؤں، موسموں اور شاخوں میں جھانکتا ہوا انسانی چہرہ ایک نئی صداقت ہے اور یہ صداقت ہمارے دور کی غالباً سب سے بڑی سچائی ہے اسے زمین کے ساتھ ایک تعلق کہہ کر بھی پکارا جا سکتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک لمبے عرصے کے بعد ہماری شعری روایت میں انسان نے خود کو کائنات میں جھانک کر پہچاننے کی صرف اسی ہی زمانے میں کوشش کی ہے۔اس اعتبار سے یہ غزلیں، ''فلسفہ ظہور'' کی پیروی کرتی ہیں اور دشتِ وحشت کی بجائے وادیٔ حیرت کی خبر دیتی ہے''

اُردو ادب کی ان دو قابلِ احترام شخصیتوں نے جو کچھ کہا ہے بالکل درست ہے مگر میرا سوال اب بھی اپنی جگہ موجود ہے نذیر قیصر نے شعری یا تخلیقی اظہار کے لئے آنکھیں، چہرہ، ہاتھ' کی ترکیب کیوں استعمال کی ہے۔یہ بات کلیتاً صحیح ہے کہ نذیر قیصر نے دوسرے شعراء کے برخلاف اپنے شعروں میں آنکھیں، چہرہ اور ہاتھ کے حوالے سے مرئی اور زمینی علامتوں کو مرکزِ توجہ بنایا ہے اور اس معاملے میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ نذیر قیصر کی غزلیں فلسفہ ظہور کی پیروی کرتی ہیں اور دشت وحشت کی بجائے وادیٔ حیرت کی خبر دیتی ہیں۔مگر سوال تو یہی ہے کہ ایسا کیوں ہے۔۔۔میں اسی سوال پر غور کر رہا تھا کہ چند روز پیشتر'' آنکھیں، چہرہ، ہاتھ'' کے مصنف سے ملاقات ہوگئی۔گفتگو کے دوران انہوں نے بتایا۔

میری زندگی کی ابتدائی اور درمیانی حصہ شدید بے کسی اور تنہائی میں گزرا ہے۔میری والدہ زندگی کی پہلی منزل پر ہی مجھ سے ہمیشہ کے لئے منہ موڑ گئی تھی۔والد نے میری پرورش اور تعلیم وتربیت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اسطرح اٹھا لیا کہ دوسری شادی پر بھی رضامند نہیں ہوئے ان کی ایثار پیشگی قابل قدر مگر بدنصیبی یہ ہوئی کہ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ قمارخانے میں گزارنے لگے گھر کی تمام ذمہ داریوں سے الگ تھلگ ہو گئے اور اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ میں دن رات اپنی چار دیواری میں تنہا رہ گیا بعض اوقات پورا پورا دن فاقے میں گزر جاتا تھا۔کبھی کبھی ایک نیک دل ہمسائی کو میرا حال معلوم ہوتا تو مجھے روٹی کھلا دیتی تھی ورنہ روتے روتے سو جاتا تھا، یہ الفاظ نذیر قیصر کے نہیں ہیں لیکن ان کا مفہوم وہی ہے جس کا ذکر انہوں نے مجھ سے کیا اس سلسلے میں دو تین باتیں قابل غور ہیں۔

شاعر اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔مادرانہ وپدرانہ شفقت سے محرومی آغاز سفر میں ہی اس کا مقدر بن گئی اور یوں محرومی، تنہائی بے کسی و بے چارگی کا شدید جذبہ شروع ہی سے اس کے قلب ونظر پر چھا گیا۔اس دور کے احساسات اس کے ساتھ ساتھ رواں دواں رہے ہیں۔بعد میں اس نے اظہارِ ذات کے لئے شعرا کہنا شروع کیا تو یہی احساسات تھے جن کی آنچ میں تپ کر اس کی شاعری نکھرتی چلی گئی۔یہ شعر وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے اپنی زندگی کا نازک ترین حصہ بیچارگی وتنہائی کے شدید، گہرے، تاریک اور بوجھل سایوں تلے گزارا ہو اور جس کے شعری تجربات پوری طرح اس دور حیات کے محسوسات سے ہم آہنگ ہوں۔

سارا محلّہ خوش تھا لیکن!
میں تنہا گھر میں روتا تھا!

صدائیں دیتے ہیں منظر اُجاڑ گلیوں کے
میں کھولتا ہوں دریچہ اگر ہوا کے لئے!

چاند میں ایک بے جان سا پتھر لگتا ہے
مجھ کو سونی راتوں سے ڈر لگتا ہے!!

شہر لگتا ہے مری میت مجھے
شام کو سڑکوں پہ خلقت دیکھ کر

غیر آباد مناظر دیکھ کے حیراں ہوں
شہر میں لوگوں کا دل کیونکر لگا ہے

چند لمحوں کے لئے اپنی آنکھوں کے سامنے اس کمسن لڑکے کا نقشہ لائیے جو اپنے کمرے میں بند پڑا ہے، اردگرد کوئی نہیں جس سے وہ باتیں کر کے دل بہلا سکے ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے، تنہائی کا زہر مسلسل اسکی رگوں میں اترتا چلا جا رہا ہے اس زہر نے مایوسی کے ہمہ گیر احساس کو جنم دیا ہے۔ یہاں تک کہ:

جس کے کھو جانے کا اب غم بھی بہت ہے مجھ کو
سوچتا ہوں کہ وہ مل جاتا تو پھر کیا کہتا

اس شعر کو تجربے کی اوپری سطح پر پرکھا جائے تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کا محبوب جدا ہو گیا ہے اور اب تک وہ فرقت کے لمحوں کی گرفت میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ احساس کر کے اپنے دل کو تسلی دیتا ہے کہ ''محبوب'' اگر مل بھی جاتا تو پھر کیا ہوتا؟ مگر میں اس تاویل سے مطمئن نہیں ہوا مجھے وہ بچہ یاد آ جاتا ہے جس کی ماں اسے جنم دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ تنہائی میں اسے اپنی جدا ہونے والی ماں یاد آتی ہے۔ یہ کرب ناک احساس اس کی معصوم شخصیت پر چھا جاتا ہے مگر پھر آہستہ آہستہ وہ اس دوزخ احساس سے فرار کی راہ تلاش کر لیتا ہے، ماں کا مہربان وجود بھی مل جاتا تو پھر کیا ہوتا۔۔۔ کیا باپ قمار بازی سے باز آ جاتا ۔۔۔ کیا ہوتا۔۔۔ بے رونق گھر میں میرے وجود کے ساتھ مادر مہربان کا وجود بھی تنہائی کا زخم خوردہ ہوتا؟ مصرع ثانی میں ان لفظوں پر غور کریں۔ سوچتا ہوں۔ ''تو پھر کیا ہوتا''۔ سوچتا ہوں، اصل میں ایسا ہے نہیں، میں سوچنے پر مجبور ہوں اور اس بے کراں تنہائی میں، میں سوچنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔۔۔ تو پھر کیا ہوتا لہجے کی آہستہ روی پر غور کیجیے:

کون ہوتا ہے حرف مے مرد افگن عشق
اے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

لہجوں کا تفاوت کون ہوتا ہے؟ کون ہوتا ہے؟

اور نذیر قیصر کے لہجے کی غالب کے لہجے کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

تو پھر کیا ہوتا؟
تو پھر کیا ہوتا؟

شاعر استفہامیہ لہجے کو یہ تغیر صورت جب بیانیہ انداز میں منتقل کر دیا جاتا ہے تو یاس و حرماں کی ایک دنیا ہمارے سامنے آ جاتی ہے اب ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں۔

مرے ندیم! مری بے کسی پر غور نہ کر
سکون قلب ترے پاس بھی کہاں ہے ابھی

یہاں نذیر قیصر کا وہ بیان یاد کیجیے جس میں اس نے ایک نیک دل ہمسائی کا ذکر کیا ہے۔ وہ کبھی کبھی آ کر روٹی کھلا دیا کرتی تھی۔ کیا شاعر غیر شعوری طور پر اس ہمسائی کی طرف اشارہ تو نہیں کر رہا۔

مرے ندیم! مری بے کسی پر غور نہ کر
سکون قلب ترے پاس بھی کہاں ہے ابھی

بے کس بچے کو اپنی بے کسی کا کس قدر اذیت ناک احساس ہے۔ ندیم سے مراد ہمسائی فرض کر لیں۔ تو اب اس کا مطلب یوں سمجھا جا سکتا ہے اپنی ہمسائی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ مجھے روٹی تو نے کھلا دی۔۔۔ مگر مری بے کسی کا یہ احساس تو دور نہیں کر سکتی۔ بھلا تو باپ کی شفقت اور ماں کا پیار کہاں سے لا سکتی ہے؟

نذیر قیصر کے جتنے شعر میں نے لکھے ہیں ان میں صیغہ متکلم یا اپنی ذات، بہت واضح ہے۔

میں کھولتا ہوں دریچہ اگر ہوا کے لیے

شہر لگتا ہے مری میت مجھے

مجھ کو سونی راتوں سے ڈر لگتا ہے

غیر آباد مناظر دیکھ کے حیراں ہوں

سوچتا ہوں کہ وہ مل جاتا تو پھر کیا ہوتا

مرے ندیم مری بے کسی پر غور نہ کر

میں تنہا گھر میں روتا ہوں

ملاحظہ فرمایا آپ نے صیغہ واحد متکلم اور اپنی ذات سے نا قابل انقطاع وابستگی، اور میں سمجھتا ہوں جس ماحول میں نذیر قیصر نے بچپن اور بے شباب کا زمانہ کاٹا ہے اس میں اپنی ذات میں ڈوب جانے کا اندازِ فکر ناگزیر تھا۔ وہ اپنی ذات سے ہٹ کر باہر نکلا ہے اور اب کہ وہ دور کافی پیچھے رہ گیا ہے پھر بھی صورتِ حال یہ ہے۔

چند بوندیں پھینک کر جلتے مکانوں کی طرف
بادلوں نے قافلے موڑے چٹانوں کی طرف

بادلوں نے قافلے چٹانوں کی طرف موڑے ہیں۔ بادل مسرت کے پیغامبر ہیں اور یہ مسرت کے پیغامبر بھی چٹانوں کی طرف منہ پھیر رہے ہیں اور دیواریں جنہوں نے اس حساس بچے کو جکڑ رکھا تھا چٹانیں ہی تو تھیں اور پھر چٹانوں کے ساتھ ان معنوی تلازمات پر غور کریں جو اس لفظ کے ساتھ ہی ذہن میں جاگ اُٹھتے ہیں سنگینی، بلندی، ہمہ گیری اور بیکراں سناٹا۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ ''آنکھیں، چہرہ، ہاتھ'' کی علامتوں کا مقصد کیا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے یہ شاعر کی اپنی ذات کی علامتیں ہیں یہ اس کی اپنی ذات ہے۔

کچھ اور کہنے سے پیشتر میں اقبال کا ایک فارسی شعر پیش کرتا ہوں۔

بہ آب جو نگرم، خویش را نظارہ کنم
بایں بہانہ مگر روئے دیگر ہنم

باقی صفحہ نمبر ۱۸ پر ملاحظہ کیجیے

گنبدِ خوف سے بشارت

فتح محمد ملک
(اسلام آباد)

نذیر قیصر اب سے ربع صدی پہلے ہماری ادبی دنیا میں ایک نئے جہانِ حیرت کے ساتھ وارد ہُوا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ اس دنیائے حیرت کے ساتھ اس کا رشتہ ہنوز قائم ہے اور تخلیقی شان کے ساتھ قائم ہے۔ اس کے پہلے مجموعہ کلام ''آنکھیں، چہرہ، ہاتھ''۔۔۔ کا زمانہ تخلیق ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک پھیلا ہُوا ہے۔ اس وقفۂ زماں کی ابتداء اور انتہا ہمارے یہاں ایوب آمریت کے طلوع و غروب کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اپنی قومی تاریخ کے یہ دو سنگ ہائے میل شاید مجھے اس سبب سے یاد آئے ہیں کہ ماورائی احساس اور باقی تجسس نذیر قیصر کے ہاں سیاسی شعور اور انقلابی آرزومندی کی دھار کو کند کرنے کی بجائے اور زیادہ تیز کرنے کا وسیلہ ہیں۔ اس کی فنی انفرادیت کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ آغازِ کا رہی سے وہ عصری شاعری کے دو مختلف دھاروں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو لینے کی بجائے ہر دو دھاروں کو اپنے قلب و ذہن میں جذب کرنے میں کوشاں نظر آتا ہے۔ نذیر قیصر کے مشقِ سخن کے دور میں ترقی پسند تحریک ہماری ادبی دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ اس تحریک کے ہنگاموں سے ذرا الگ بیٹھ کر ناصر کاظمی ایک نئے طرزِ احساس کو پروان چڑھانے میں مصروف تھے۔ دستِ صبا، شعلۂ گل اور برگ نے، اس دور کی اہم ترین شعری دستاویزات ہیں ترقی پسند نظریۂ ادب کی تخلیقی زرخیزی اور ناصر کاظمی کے نئے طرزِ احساس کی کرشمہ سازی نے نذیر کی شعری شخصیت تشکیل میں یکساں کردار سرانجام دیا ہے۔ اوّل اوّل یہ اثرات الگ الگ پہچانے جاسکتے ہیں:

کہیں تو پرچم خورشید ہاتھ آئے گا
کچھ اور دیر ابھی شب کی وادیوں میں پھرو

پھول کھلا کر شاخ کا ہاتھ لہُو میں بھر گیا
صبح ہوئی کہ کٹ گیا تیغِ افق پر آفتاب

اور:

شام کی دھندلی پگڈنڈی پر
سورج کا رتھ ڈول رہا تھا

کچھ پوچھتی ہیں پیڑوں کی سرسبز ٹہنیاں
کچھ کہہ رہے ہیں راہ میں پتے گرے ہوئے

مگر بہت جلد اثرات کی یہ الگ پہچان گم ہو جاتی ہے اور ایک نئی شعری فضا نمودار ہوتی ہے جس میں ظاہر کی آنکھ سے نظر آنے والی گرد و پیش کی دُنیا اور چشمِ دل پر بے حجاب ہونے والی دنیائے حیرت کی سرحدیں ٹوٹتی اور آپس میں گھلتی ملتی نظر آتی ہیں۔ جیلانی کامران کے لفظوں میں:

''نذیر قیصر کی شعری دُنیا میں تجربے کا جو ٹوٹتا ہُوا دکھائی دیتا ہے اور پہلی بار انسان اپنے آپ کو کائنات کی بارگاہ میں جاگتا ہُوا محسوس کرتا ہے جو سوالات نذیر قیصر نے پوچھے ہیں اور جن تجربوں سے اس کا سابقہ پڑا ہے ایسے ہیں جو ہر اعتبار سے نئے ہیں اور ان کے نئے ہونے کا انعام ان فکری تحریکوں کے حصے میں بھی آتا ہے جو اس زمانے میں ادب و فکر میں ظاہر ہو رہی ہیں۔ نذیر قیصر کی غزلوں میں ایک نیا انسان ظاہر ہو رہا ہے اور ایک نئی دنیا واضح ہو رہی ہے۔ درختوں، پھولوں، خوشبوؤں، موسموں اور شاخوں میں جھانکتا ہوا انسانی چہرہ ایک نئی صداقت ہے اور صداقت ہمارے دُور کی غالباً سب سے بڑی سچائی ہے۔ اسے زمین کے ساتھ ایک تعلق کہہ کر پکارا جا سکتا ہے۔ غزلیں فلسفۂ ظہُور کی پیروی کرتی ہیں اور دشت و حشت کی بجائے وادیٔ حیرت کی خبر دیتی ہیں۔ کائنات جابر نہیں دوست ہے اور اسی رشتے کی بناء پر اشیا کبھی چھپتی ہیں اور کبھی آشکار ہوتی ہیں۔ شاعر کی آنکھیں ان کے کھوج میں نئے رازوں سے واقف ہوتی ہیں۔ شاعر اس نئے عالم میں ایک نئے تجربے سے گزرتا ہے اور یہ تجربہ نئی غزل کا سب سے قیمتی تجربہ ہے۔''

جس طرح آنکھیں، چہرہ، ہاتھ ایک شخص کے اعضاء ہوتے ہوئے بھی اپنی الگ شخصیت اور منفرد پہچان رکھتے ہیں اُسی طرح اس پراسرار اور حیرت زا کائنات میں انسان اپنی تخلیقی یکتائی کے ساتھ ایک مکمل اکائی بھی ہے اور کسی عظیم تر اور وسیع تر کُل کا جزو بھی ہے۔ یہ احساس نذیر قیصر کے تجربات و مشاہدات کو نیا مفہوم بخشتا ہے:

رات جب بارش سے جل تھل ہوگئی
وہ بھی میرے ساتھ پاگل ہو گئی

چوم کر اُس کا دہکتا پیرہن
روح کی پوشاک صندل ہو گئی

جاگتا جسم لیے تو مجھ سے
میری بانہوں کی طرح لپٹا تھا

میں بھی اس رات نہ تھا میں جیسے
تو بھی کچھ اور نظر آتا تھا

آنکھیں اُگ آئی تھیں دیواروں میں
وہ تجھے ہاتھ لگانا اپنا

آغازِ شباب کے اوّلین تجربات کی اس دُنیا میں نذیر قیصر من وتُو کے حجابات میں الجھ کر رہ جانے کی بجائے ایک تیسرے نادیدہ وجود کی ہمہ وقت رفاقت کے احساس سے غافل نہیں ہوتا من وتُو کی تنہائی میں تیسرا ٹی ایس ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ کا تیسرا نہیں ہے بلکہ وہ حسنِ گُل کے ساتھ نذیر قیصر ایک اٹوٹ عضویاتی رشتہ محسوس کرتا ہے:

اڑتا پھرتا ہُوں غبار و باد میں
میں ابد کی شاخ سے ٹوٹا ہوا

کون پوشیدہ ہے میری روح میں
کس نے میرا جسم ہے پہنا ہُوا

عجب نہیں کہ کوئی اور بھی ہو تجھ میں مکیں
ہوا ہے وہم تو اب خُود کو آنکھ بھر کے دیکھ

نہ اجنبی نہ شناسا دکھائی دیتا ہے
یہ کون ہے جو مرے ساتھ ساتھ رہتا ہے

قیصر یوں لگتا ہے جیسے اپنے ساتھ
اور بھی کوئی ذات لئے پھرتا ہُوں میں

یوں محتاط ہُوں ہر اک چیز سے میں، جیسے
گھر میں کوئی میرے سوا بھی رہتا ہے

روز و شب، دشت فنا کے سامنے رہتا ہوں میں
ایک اَن دیکھی صدا کے سامنے رہتا ہوں میں

اپنی ذات میں کسی اور کے مکیں ہونے کا یہ احساس حصارِ ذات سے نکل کر بیکراں ہونے کی تمنا پیدا کرتا ہے:

دل تنگ ہُوں مکان کے اندر پڑا ہُوا
باہر ابد کا قُفل ہے دَر پر پڑا ہُوا

اِک جہانِ بے نشاں کا راز ہے میرا وجُود
وسعت کون و مکاں میں قید سا رہتا ہوں میں

حدودِ عرصۂ امکان سے گزر کے دیکھ
چمن کا رنگ، ہوا کی طرح بکھر کے دیکھ

چشم کو خاک سے رہائی دے
مجھ سے باہر مجھے دکھائی دے
یا تو خود آب وگُل سے باہر آ
یا مرے فکر کو رسائی دے

اپنی ذات سے باہر خود کو پہچاننے کی تمنا صحیفۂ کائنات کی ورق گردانی پر مجبور کرتی ہے:

کون ہوائیں ہیں جو لوحِ عالم پر
آنکھیں، چہرہ، ہاتھ بناتی رہتی ہیں

کس کے ہاتھوں نے بکھیرے ہیں فضاؤں میں یہ حرف
کس کے ہاتھوں میں ہوا کی سرسراتی ڈور ہے

کچھ پوچھتی ہیں پیڑوں کی سرسبز ٹہنیاں
کچھ کہہ رہے ہیں راہ میں پتے گرے ہوئے

زمیں ہے خاک و ہوا کا دیار کس کے لیے
کھنچا ہوا ہے فلک کا حصاف کس کے لیے
مہ و نجوم کی شمعیں ہیں کس کے ہاتھوں میں
ہوئی ہے شامِ سفر زرنگار کس کے لیے
نہ آئینہ ہے نہ چہرہ نہ آنکھ ہے کوئی
غبار سا ہے سرِ راہ گزار کس کے لیے

کس نے صبا کی لوح پر اوس کے حرف لکھ دیئے
چادرِ خاکِل زرد میں کس نے کھلا دیئے گلاب

ہر طرف بکھرے ہوئے ہاتھ اور چہروں کے حرف
دیکھتی رہتی ہیں آنکھیں سوچتا رہتا ہوں میں

آیاتِ فطرت پر یہ غور و فکر جس نکتۂ عرفان کو جنم دیتا ہے وہ اس مسلسل غزل میں جلوہ گر ہے:

مراد جُود بھی میں مجھ سے ماورا بھی مَیں
اسیرِ خاک بھی مَیں، خاک سے رہا بھی مَیں
سرِدِ یار طلب میری جستجو بھی مجھے
اسی مقام میں خود سے گریز پا بھی مَیں
حیات و موت کی پُرخار راہگزاروں میں
مجھے ہی حکم سفر اور برہنہ پا بھی مَیں

کِسے تلاش کروں خاکدانِ عالم میں
کہ ابتداء بھی یہاں مَیں ہوں اِنتہا بھی مَیں

ذات اور کائنات کے رشتوں کا یہ بہ یک وقت حقیقی اور ماورائی احساس نذیر قیصر کو پنجابی ادبی روایت کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ نذیر قیصر کا پنجابی شعری مجموعہ نظم ''قسم فجر دے تارے دی'' سے شروع ہوتا ہے اور نظم ایلی ایلی لما شبقتنی ! پر ختم ہوتا ہے۔ اب نذیر قیصر قرانِ حکیم اور انجیل مقدس کی آیات کو آیۃ کائنات کی روشنی میں تفسیر کرنے میں کوشاں ہو جاتا ہے:

''قسم فجر دے تارے دی
مٹی اُتّے پینڈے ہوئے
اسمانی لشکارے دی
اکھاں کھول کے
کوئی نہ تکدا
صورت ایس نظارے دی
ایتھے لوکی
سُتے رہندے
کُنڈی مار چبارے دی
قسم فجر دے تارے دی

نذیر قیصر نے جاگتی اور سوچتی آنکھوں سے افلاک سے خاک پر نازل ہوتے ہوئے لشکارے کو دیکھا تو پایا کہ:

اک فرشتہ
ہتھ نوشتہ
دھرتی تیکر وال
پیراں تھلے چن تے سورج
سِر تے چٹّی شال
کشف دی رات
زمین تے اتری
کھلدیاں ورقیاں نال
اکھّاں مَل کے جاگ پئے نیں
لکھّاں نویں سوال
عرفاں دی گھنڈ کھول کے نکلے
دن، مہینے، سال
جنہاں دی
لبھی نہ سکدا کوئی
خواباں وچ مثال

کشف کی رات جو لاکھوں سوال بیدار ہو اُٹھے تھے ان میں سے فقط چند آتشیں سوالات نظم ''ایلی! ایلی! لما شبقتنی'' کے صورت گر ہیں:

میر یار بّا! میر یار بّا!
توں مینوں کیوں چھڈ دتا اے؟
میں تیرا یسوع تے نئیں آں
میرے سر تے کنڈے کیوں نئیں؟
میری کند تے سُولی کیوں اے؟
میرے ہتھاں تے پیراں وچ کلّاں کیوں نیں؟
میرے آسے پاسے روندے پرچھانویں
تے لوکاں دیاں
کندھاں کیوں نیں۔۔۔؟

ان سوالات نے نذیر قیصر پر ان المیوں کی معنویت آشکار کی ہے جن کے باعث ملتِ ابراہیمؑ کی سرگزشت (کہ نہایت اس کی حسینؑ، ابتدا ہے اسمٰعیل)، غریب و سادہ و رنگین ہے، عہدِ حاضر میں یسوعؑ اور حسینؑ کے عاشقوں کے مقدر پر دل سوزی سے امام حسینؑ، کربلا دی شام اور یاسر عرفان کی سی نظمیں بھی برآمد ہوئی ہیں اور ''تیسری دنیا'' کے مفتوح عوام میں نئی بیداری اور تازہ پیکار کے آثار کا خیر مقدم کرتے ہوئے نذیر قیصر، کورا کے فادر کم چی ہا کی آواز میں آواز ملاتے ہیں:

میں سلاخوں سے پرے دیکھتا ہوں
حلقہ در حلقہ۔۔۔
ستاروں پہ قدم رکھ کے گزرتا ہوا
سایوں کا ہجوم
درد کی تیغوں پر گرتے ہوئے
ہاتھوں کے ورق
ظلم کے نیزے پہ ٹھہرا ہوا
چہروں کا اُفق
میں سلاخوں سے پرے دیکھتا ہوں
شب کی قربان گہیں۔۔۔ٹوٹتے جسموں کا الاؤ
قتل ہوتی ہوئی آوزوں کی پیاسی خوشبو
اپنی پرچھائیں سے بہتا ہوا
صبحوں کا لہو
میں سلاخوں سے پرے دیکھتا ہوں

نذیر قیصر کے پنجابی شعری مجموعہ۔۔۔''زیتون دی پتی' کے پیش لفظ میں امرتا پریتم نے خوب کہا ہے کہ ''شاعر یسوع نئیں ہوندے پر یسوع دی قسمت ہنڈھاندے نیں'' نذیر قیصر معاشی استبداد اور سیاسی ظلم کے خلاف تیسری دُنیا کے جہاد میں شریک ہو کر یسوعؑ اور حسینؑ کی سچی پیروی کا حق ادا کرنے کا قائل اور اس

جہادِ حُریّت کے احوال و مقامات کو بائبل اور قرآن سے مکتسب امیجری، تلمیحوں اور استعاروں میں بیان کرنے کا خوگر ہے فکر و عمل کی اس نہج نے کہ نذیر قیصر کی نسل کے شاعروں میں نایاب سی ہے۔ ''گنبدِ خوف سے بشارت'' کی غزلیات کو ایک نادر و منفرد شان عطا کی ہے:

آنکھیں زنجیر تھی دروازوں میں
پاؤں سولی میں گڑھے تھے باہر
گھر نے چھوڑا نہ کہیں کا ورنہ
کام کرنے کو بڑے تھے باہر
ہر طرف جلتے تھے خیمے قیصر
ہر طرف نیزے گڑھے تھے باہر

آدمی ہُوں مٹی کا
ذائقہ ہوں پانی کا
بے صدا مسافر ہوں
بے چراغ بستی کا
کھِل رہا ہے نیزے پر
پھول بانجھ دھرتی کا
جیل کی فصیلوں پر
سایہ اُڑتے پنچھی کا

عصا بلند کروں سرکشیدہ لہروں پر
فصیلِ آب اٹھاؤں، ہوا جلاؤں کوئی
سیاہیوں میں گھرے ہیں دلوں کے آئینہ
کہیں سے پرتو گم گشتہ ڈھونڈ لاؤں کوئی

اپنے عہدِ ستم میں خلقِ خدا کی نجاتِ دیدہ و دل کے لیے وہ خالقِ اکبر کو پکارتے ہیں:

خالی دیوار و در میں شکلیں اُتار
بے صدا بستیوں کو خلقت دے
عہدِ بے کشف میں پیمبر بھیج
بے خبر آئینوں کو حیرت دے
بستیوں کو اجاڑ شہر جلا
اُمتوں کو نشانِ عبرت دے
شاخِ افلاک سے نجوم گرا
گنبدِ خوف سے بشارت دے

کبھی اس شہر میں سورج اترے
کبھی ان گلیوں میں بچے دیکھوں
پھول کھلتے ہوں، ہوا چلتی ہو
کبھی ان باتوں کو ہوتے دیکھوں
آسمان دیکھوں پرندے دیکھوں
کبھی اس خواب سے آگے دیکھوں

اس دعائیہ اور تمنائی لہجہ میں نذیر قیصر کا مابعد الطبعاتی احساس بھی بروئے کار آتا ہے اور انقلابی آرزومندی بھی رنگ لاتی ہے۔ ذاتِ باری میں فکری انہماک کی مثالیں ''گنبدِ خوف سے بشارت'' میں یہاں وہاں بکھری پڑی ہیں:

میں ترے ہونٹوں سے نکلا لفظ تھا
میں ترے رازوں کا سنّاٹا ہوا
صبح کے پردے میں کس کی شکل تھی
کس کرن سے آئینہ اندھا ہوا

رنگ تھا کہ خوشبو تھا، خواب تھا کہ جادو تھا
پردۂ معانی میں شعلہ تھر تھراتا تھا

نفی اثبات کا پانی مِٹّی
نئے گل بُوٹے پُرانی مِٹّی

آنکھ، افلاک، ستارے، پربت
پاؤں، زنجیرِ زمانی مِٹّی
کیسے گوندھی گئی آتش میں ہوا
کیسے ظاہر ہوئے پانی مِٹّی

کونپلیں لکھتی رہی زخموں پر
کٹ گئے ہاتھ نہ مانی مِٹّی

اے شعلۂ وجود کبھی آئینوں میں جل
اے شکلِ کم نما کبھی حیرانیوں میں آ
کچھ نئی شکلیں ہیں آوازوں میں
کچھ نئے نام بلاتے ہیں مجھے

میں زمیں سے پکارتا ہوں تجھے
تو جہاں ہے مری صدا سُن لے

باقی صفحہ ۴۱ پر ملاحظہ کیجیے

خاکِ بے نوا

جمیل یوسف
(لاہور)

پچھلے کئی دنوں سے میں نذیر قیصر کی شاعری پر لکھنا چاہ رہا ہوں۔ کئی بار قلم اُٹھایا مگر کسی لفظ نے ساتھ نہ دیا۔ سمجھ ہی نہیں آتی بات کا آغاز کس طرح کروں۔ اس کیفیت کا ظہار نذیر قیصر کے ایک شعر میں ملتا ہے:

نام سادہ کاغذ پر لکھ کے رہ گئے اُس کا
اس سے آگے کیا لکھتے، کچھ لکھا نہ جاتا تھا

شاعر نے جو نام سادہ کاغذ پر لکھا اس نے کچھ ایسا اثر دکھایا کہ آگے کچھ لکھا ہی نہ گیا۔ مجھ پر اسی طرح کا کوئی اثر نذیر قیصر کی شاعری کرتی ہے۔ جب بھی میں اُس کی کتاب کھولتا ہوں ہر صفحے پر کوئی نہ کوئی ایسا شعر مل جاتا ہے جس کے ملنے کے بعد میں کھو جاتا ہوں اور حالت وہی ہوتی ہے جسکو میر تقی میر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

نذیر قیصر کی شاعری میں کچھ ایسا جادو ہے کچھ ایسا چھومنتر ہے کہ محسوس ہوتا ہے۔ شعر پڑھنے سے پہلے میں جہاں تھا، اب وہاں نہیں ہوں۔ اردگرد کا سارا ماحول بدلا بدلا سا لگتا ہے۔ میں کسی ایسی حالت کا ذکر نہیں کر رہا جو اَن دیکھی یا اَن سنی ہو۔ آپ نے قوالی کی محفلوں میں دیکھا ہوگا کبھی کبھار کسی شخص کو عالم وجد میں حال پڑ جاتا ہے۔ وہ اردگرد کے ماحول اور دنیا مافیہا سے بالکل بے خبر سرمستی اور بے خودی میں ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے۔ سر دھننے لگتا ہے۔ بقول عدم:

جو شعر ہمارے سنتے ہیں مستی سے عدم سر دُھنتے ہیں
ہم اہلِ طریقت کی باتیں الہام کی باتیں ہوتی ہیں

نذیر قیصر کے شعر پڑھ کر سرمستی و بے خودی میں بے اختیار ہو کر میں ہاتھ پاؤں تو نہیں مارتا، نہ سر دُھنتا ہوں۔ البتہ ایک عالم حیرت و استعجاب میں گم ہو جاتا ہوں۔ لگتا ہے کشف کے عالم میں ہوں، کوئی نیا انکشاف ہونے والا ہے۔ آپ ذرا ان شعروں کو پڑھیں:

کاٹ دیتی ہیں شعاعیں مجھ کو
سائے مٹی سے اُگاتے ہیں مجھے

کیا سمیٹو گے تم مجھ کہ میں
ٹوٹتے آئینوں کا سایہ ہوں

اے غبارِ ہجومِ نقش ٹھہر
چشم کو دیکھنے کی مہلت دے

شب ڈھل گئی، دریچہ کھلا آسمان کا
چمکا فضا میں تیر، اُفق کی کمان کا

میں خاکِ بے نوا تھا مگر میرے ہاتھ نے
کھولا علم فضاؤں میں حرف و بیان کا

اُبھرا ہے تُو جب بھی آئینوں سے
میں تیرا نقاب ہو گیا ہوں

میں تیرے لبوں تک آتے آتے
پانی تھا، شراب ہو گیا ہوں

جب کسی شاعر کا کلام پڑھتے ہوئے اس طرح کے اشعار آپ کا راستہ روک لیں تو پھر تو وہی کیفیت ہوتی ہے۔ بقول شاعر:

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

حالانکہ چراغ اپنے اپنے جل رہے ہیں مگر جب چراغوں میں روشنی نہ رہے تو قلم میں روشنائی کہاں سے آئے اور کاغذ پر لفظ کیسے بنے۔ نذیر قیصر کی شاعری پر لکھنے میں یہی مشکل پیش آتی ہے۔ شاعر جو تاثر پیدا کرتا ہے اُسے کوئی اور شخص اپنے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا پھر جن الفاظ میں دوسرے شاعروں پر آسانی سے اظہار خیال کیا جا سکتا ہے۔ نذیر قیصر کی شاعری کو بیان کرنے کی سکت ان الفاظ میں نہیں ہے۔ و یسے بھی کسی اچھے شعر کے تاثر کو کوئی اور شخص اپنے الفاظ میں اس طرح بیان نہیں کر سکتا کہ وہی اثر پیدا ہو جو شعر میں ہے۔ نذیر قیصر کے اشعار پر لکھنے میں یہ دشواری کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ نذیر قیصر نے اپنے محسوسات کے لیے اظہار و بیان کے بالکل نئے سانچے اور پیمانے ایجاد کیے ہیں، جن کی کوئی مثال اس سے پہلے اُردو شاعری میں نہیں ملتی۔ اکثر شاعر اپنے خیالات، جذبات اور تصورات کا اظہار کرتے ہیں۔ جبکہ نذیر قیصر اپنے محسوسات کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً محبوبہ سے اپنے قرب اور اس کے لمس کا اظہار آج تک کسی شاعر نے اس طرح نہیں کیا جیسا کہ نذیر قیصر نے اپنے اس شعر میں کیا ہے:

ہونٹوں کا لمس اور جدائی کی سرد شام
دو سائے بے لباس تھے جسموں کی آگ میں

اور اسی طرح یہ اشعار بھی ہیں:

میں بوند بوند گر رہا تھا خاکِ بے نمود پر
ترے بدن کی شاخ پر کھلا دیا گیا مجھے

شب وصال جسم وجاں میں پھول سے برس گئے
زمیں پہ آسماں سا جھکا دیا گیا مجھے

میں بوند بوند جلا وصل کے کنارے پر
وہ لہر لہر بدن کروٹیں بدلتا رہا

گلاب بہتا رہا خواہشوں کے پانی میں
ہوائیں چلتی رہیں اور دیا مچلتا رہا

جما ہوا ہے شعلہ اُس کے ہونٹوں پر
چوم کے شعلے کو مہکانا ہے میں نے

شعلہ تھا وہ گلاب تھا کیا تھا
پڑ گئے ہیں نشان ہاتھوں میں
گرتے جاتے ہیں پھول بستر پر
کھلتا جاتا ہے تھان ہاتھوں میں

دونوں مہک سے بوجھل تھے
پھول کھلایا دونوں نے

بکھرتا جاتا ہے کمرے میں سگریٹوں کا دھواں
پڑا ہے خواب کوئی چائے کی پیالی میں
دیے کے سامنے وہ سر جھکائے بیٹھی ہے
چمک رہی ہے مری رات اس کی بالی میں

میں دیا جلا کے ڈھونڈتا ہوں
رکھ دی ہے کہیں پہ رات اُس نے

سو تو جاؤں گا میں اکیلا بھی
جاگنا تیرے ساتھ چاہتا ہوں
کبھی فرصت ملے تو آ جاؤ
تم کو ایک شخص سے ملانا ہے

کہیں جائے نہ رات گزر سائیں
مرے تن میں چانن کر سائیں

نذیر قیصر کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو مجموعی تاثر کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر محبت کا شاعر ہے۔ یعنی عشق ومحبت کے معاملات کا شاعر ہے۔ عورت سے اپنے تعلق پر اور ہجر ووصال کے معاملات پر اُس نے بہت لکھا ہے مگر یہ وہ تعلق نہیں ہے۔ جسے غالب نے چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد، کہا ہے۔ نذیر قیصر کے لیے یہ محض چھیڑ چھاڑ نہیں ہے اس کے لیے تو یہ پوری زندگی ہے۔ بلکہ اگر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا صنف نازک سے تعلق اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اس کی ساری زندگی اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔ اوپر درج کیے گئے اشعار سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نذیر قیصر کے نزدیک انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ صنفِ نازک سے اس کا تعلق ہے۔ یہی تعلق اسے بناتا اور بگاڑتا ہے۔

صف نازک تعلق کے بعد نذیر قیصر کے نزدیک انسان کے لیے اہم ترین مسئلہ خالق کائنات سے اس کے تعلق کی نوعیت ہے۔ اس تعلق پر بھی اُس نے کافی اشعار کہے ہیں۔ خدا نے جو کائنات تخلیق کی ہے جو زمین وآسمان بنائے ہیں زمین پر جو پھول کھلائے ہیں جو درخت اُگائے ہیں آسمان کی وسعتوں میں جو سورج چاند اور ستارے چمکائے ہیں بارش سے دھرتی پر جو امرت رس ٹپکایا ہے اور بارش اور دھوپ کے ملاپ سے زمین کی تہوں میں روئیدگی اور زندگی کی جو لہر لہر کروٹیں لینے لگتی ہے پہاڑوں، میدانوں، وادیوں دریاؤں او سمندروں میں جو وسعت او رخوبصورتی ہے اور ان سب مظاہر کے درمیان جس طرح انسان کو اُتارا ہے اور جس کڑی آزمائش میں اُسے ڈالا ہے ہر زبان میں بڑی شاعری کے موضوعات یہی ہیں اور مذہبی صحیفوں کے موضوعات بھی یہی ہیں۔ نذیر قیصر کی شاعری پڑھتے ہوئے بعض مقامات پر مجھے ایسے لگا ہے جیسے میں بائبل کی آیات پڑھ رہا ہوں۔ وہ گنبد خوف سے بشارت کا طالب ہی نہیں بلکہ خود اس کے کلام میں بعض جگہوں پر بشارتوں کی پرچھائیاں اپنی جھلک دکھاتی ہیں۔ باقی شاعروں نے بھی ان موضوعات پر لکھا ہے۔ خدا سے کلام کیا مگر نذیر قیصر کی سوچ اور اس کا لب ولہجہ اور اس کا کلام چاہے وہ خدا سے ہو، ہوا سے ہو، رات سے ہو یا چاند سے ہو یا ان سب سے اس تعلق کے بارے میں ہو، بڑا مختلف اور حیران کر دینے والا ہے۔ مثلاً اس نے اپنے ایک مجموعے کا نام اپنی غزل کے ایک مصرعے سے لیا ہے ''اے شام ہم سخن ہو''۔ شام سے متعلق نذیر قیصر کے چند اشعار دیکھیں:

شام رکتی ہے مرے مدفن پر
فن ہیں مجھ میں، زمانے اس کے

بس ایک شام سرِ دشتِ کربلا اُتری
پھر اس کے بعد گھروں سے علم نکلتا رہا

آنکھیں رکھ دیں اس نے گھر کے دروازے پر
شام ہوئی اور خالی رستہ واپس آیا

وہ بستر میں پڑی رہی
شام گلی میں کھڑی رہی

اے چاند جھک شجر پر
اے شام ہم سخن ہو

شام جب سیر کو نکلتی ہے
دور تک ساتھ جانا پڑتا ہے

چراغ سایہ، دریچہ، آنکھیں
وہ شام تھی داستان جیسی

خدا سے اور عالم خاک وآب وباد کے متعلق سب بڑے شاعروں نے لکھا ہے۔ خدا سے اور خدا کی تخلیق کی ہوئی کائنات کے مختلف مظاہر سے باتیں کی ہیں۔ ایک جانب خدا ہے اور دوسری جانب انسان ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک وسیع عریض ناپائیدار کنار کائنات ہے۔ یہی مذہب شاعری اور فلسفے کے موضوعات ہیں۔ مذہبی صحائف کا سلسلہ تو کب کا ختم ہو چکا اور فلسفیوں کا حال اکبرالہ آبادی نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے:

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

مگر شعراء کا خدا کے وجود پر صرف یقین ہی نہیں بلکہ یوں لگتا ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ موجوگی کو محسوس کیا ہے۔ اس کی جھلک دیکھی ہے اسی لیے وہ خدا سے باتیں کرتے ہیں۔ خدا کے وجود کے بارے میں شعراء کا استدلال سراسر مختلف نوعیت کا ہے۔ کیٹس جب کہتا ہے کہ 'حسن صداقت ہے اور صداقت حسن۔ بس یہی وہ سب کچھ ہے جو تم جانتے ہو اور تمہیں جاننے کی ضرورت ہے۔'' تو وہ دراصل اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں ہی بات کر رہا ہوتا ہے۔ اللہ جمیل ویحب الجمال کا بھی یہی مطلب ہے۔ حسن ہی ایک ایسا استعارہ ہے جس میں انسان اللہ تعالیٰ سے گفتگو کرتا ہے۔ حسن، خیر اور صداقت ہی اللہ کی وہ صفات ہیں جن کے حوالے سے انسان اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق قائم کر سکتا ہے۔ اس تعلق کا احساس نذیر قیصر کی شاعری سے قاری کے دل میں جاگ اُٹھتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ خدا اور اس کی تخلیق کردہ کائنات سے محوِ گفتگو ہے۔ شاعر صوفی نہیں ہوتا کہ عرفانِ حقیقت کے بعد اس کے ہونٹوں پر چپ لگ جائے۔ وہ اپنے عرفان اور کشف کا اظہار کرتا ہے۔ نذیر قیصر کے کچھ مزید اشعار ملاحظہ ہوں:

زندگی کا ثبات چاہتا ہوں
میں زمیں پر نجات چاہتا ہوں

حرف تیرے ہیں، صحیفے تیرے ہیں
میں قلم اور دوات چاہتا ہوں

کوئی ان لکھا اسم لکھنا ہے
کوئی انہونی بات چاہتا ہوں

میں کیسے گزرتا، راستے میں
دنیا و دیں پڑے ہوئے تھے

جانے کس کنارے پر تم کہیں کھڑے ہو گے
آ رہا ہے میری طرف ایک پھول بہتا ہوا

طاقِ شب میں چراغ سا قیصر
حرف تھا یا کوئی اشارہ تھا

دھوپ اور بارش سے پھلجھڑی بناتا ہے
آسماں بھی شاعر ہے، شاعری بناتا ہے

بوند ہو کہ پتی ہو، حرف ہو کہ مٹی ہو
چھوٹی چھوٹی چیزوں سے زندگی بناتا ہے

ایک میں رات بھر جاگتا ہوں
ایک میرا خدا جاگتا ہے

ایک میں تھا شہرِ بے چراغ میں
اک خدا کی ذات جاگتی رہی

تو نے تیغ سے لہو کی بوند گرائی تھی
میں دھرتی سے پھول اُٹھانے آیا ہوں

اُڑتا ہوا صبح کا پرندہ
مجھ کو بھی رہائی دے رہا ہے

یہ جائے نماز ہے کہ سبزہ
مٹی کو چٹائی دے رہا ہے

نذیر قیصر کی شاعری کا موسم

منصور آفاق
(لاہور)

میں جب بھی نذیر قیصر کو دیکھتا ہوں مجھے حیرت انگیز شاعر اور قلم کو تلوار بنانے والے کالم نگار حسن نثار کا یہ یادگار جملہ یاد آجاتا ہے کہ اگر شاعری انسانی روپ دھارتی تو وہ نذیر قیصر کی شکل میں دکھائی دیتی بے شک ان کے شعری مجموعوں کے مطالعے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے آنکھیں چہرہ، ہاتھ، زیتون دی پتی، گنبد خوف سے بشارت، اے شام سخن ہو، تمہارے شہر کا موسم، اے ہوا موذن ہو محبت میرا موسم ہے کی شاعری تک جذبوں کی پوروں پہ نرمگی کی آگ محسوس ہوتی ہے۔

نذیر قیصر عجیب آباد شاعر ہے گلیوں کا بنجارہ ہے آسمانوں سے آتی ہوئی پہلی ہوک ہے جو باہو کے مزار پر الوہی چادر کی طرح پھیل پھیل جاتی ہے نذیر قیصر نے جب کہا:

ایک ہوک یا ہو کی
جیوے قبر باہو کی

باہو جسے الٹایا جائے تو وہاب بن جاتا ہے باہو جس میں ایک نقطے کا اضافہ کیا جائے تو یا ہو میں بدل جاتا ہے فیض صاحب لکھتے ہیں: مجھے نذیر قیصر کی شاعری ادب میں ایک گراں مایہ اضافہ ہے نذیر قیصرا یک منفرد شاعر ہیں مگر ان کی انفرادیت اجتماعی شعور سے وابستہ ہے۔''میں کہتا ہوں انکی انفرادیت اجتماعی شعور سے وابستہ نہیں بلکہ اس کا ماحصل ہے۔احمد ندیم قاسمی نے کہا نذیر قیصر کو جدید تر شاعری کے معماروں میں شامل کرنا چاہیئے'' میں کہتا ہوں وہ جدید تر شاعری کے معمار ہی نہیں بلکہ تازہ خیالی کا تاج محل بھی ہیں۔بانو قدسیہ فرما گئی ہیں۔نذیر قیصر شہرِ سخن کا وہ بنجارہ ہے جس کے پاس نئی نئی سوغاتیں ہوتی ہیں۔میں کہتا ہوں نذیر قیصر نے رنگ وخوشبو اور روشنی کی جو سوغاتیں گلی گلی تقسیم کی ہیں اس سے پہلے وہ کہیں موجود نہیں تھیں۔منیر نیازی نے کہا تھا نذیر قیصر کی شاعری ایک چمکتے ہوئے چاند کی طرح طلوع ہوئی ہے اس شہرِ ظلمات کو شہرِ طلسمات بنا دینے کے لئے۔۔۔ میں کہتا ہوں نذیر قیصر کی شاعری کے شہرِ طلسمات میں کئی آفتاب موجود ہیں۔

اور عہد موجود کے سب سے بڑے شاعر ظفر اقبال نے بہت پہلے کہا تھا۔نذیر قیصر کا شمار جدید شاعری کے ان گنے چُنے بنیاد سازوں میں ہوگا جو شاعری کا منظر نامہ ہی تبدیل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔میں کہتا ہوں نذیر قیصر جدید شاعری کی بنیاد بھی ہیں اور اس کے گنبد کا جگمگاتا کلس بھی۔۔۔جب نذیر قیصر نے کہا تھا:

موم بتی انگلیوں کے ساتھ
وہ مرا بھیگا کوٹ اتارتی ہے

تو مجھے ان موم بتی انگلیوں کی دھیمی دھیمی آنچ دیر تک محسوس ہوتی رہی

اور جب انہوں نے کہا:

دنیا اچھی لگتی ہے رب اچھا لگتا ہے
اچھی آنکھوں والوں کو سب اچھا لگتا ہے

تو میری آنکھیں لمحہ موجود کی بدترین معاشی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی صورتِ حال میں بھی امید کی روشنی سے بھر گئیں۔مدینے کی محبت میں جو شعر نذیر قیصر نے کہے ہیں ان پر میں قربان میری آل اولاد قربان:

میں اور منزل دور کی
چھتری کھلی کھجور کی

نذیر قیصر آدمی کی تباہی پر بہت دکھی ہیں وہ مولانا روم کی طرح شہر میں چراغ لے کر کسی مکمل آدمی کی تلاش میں ہیں مگر انہیں ہر طرف آدمی نہیں آدمیوں کی دھول دکھائی دیتی ہے اور خدا بھی انہیں ملول نظر آتا ہے۔

آدمی آسمان تھا دھول ہوا
پھر خدا بھی بہت ملول ہوا
بادبانوں پہ پہلی رات اتری
پہلا تارا میرا رسول ہوا

جبرائیل سے جب پوچھا گیا کائنات کی عمر کتنی ہے تو اس نے کہا جب کچھ نہیں تھا۔بس اک ستارہ دمکتا تھا اور صاحب لولاک نے فرمایا وہ ستارہ میں تھا۔یہی بات نذیر قیصر نے کیسے شاعرانہ انداز میں کہی کہ پہلا تارا مرا رسول ہوا یہاں اس پہلے تارے کی علامت اتنی وسیع ہے کہ روشنی کی ہر کرن اسی کل کے ساتھ جڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ایک اور شعر یاد آ گیا کہتے ہیں:

حرف سے کونپلیں نکل آئیں
میرا لکھا پڑھا قبول ہوا

بے شک میں اور آسمان دونوں اس بات کے گواہ ہیں کہ نذیر قیصر کے حرف کو قبولیت عطا ہوئی ہے بے شک انہوں نے حرف کو آنکھیں دی ہیں۔

جاگتے ہیں سوتے ہیں
حرف آنکھیں ہوتے ہیں

نذیر قیصر نے جب کہا چاند کھڑکی میں سی لیا اس نے تو میرے جی میں آیا کہ ہاتھ بڑھا کر چاند کو اپنی آغوش میں لے لوں اور جب انہوں نے کہا:

خواب تھے رات کے پیالے میں
اور پیالہ اُلٹ گیا مجھ سے

تو مجھے شہر میں ہر طرف نذیر قیصر کے خواب چلتے پھرتے دکھائی دینے لگے۔نذیر قیصر پر میں نے ابھی کچھ لکھنا ہے اس مختصر تحریر کو اس کتاب کا دیباچہ سمجھ لیجیے جو میرے اندر کہیں مکمل ہو چکی ہے مجھے نذیر قیصر کی شاعری کا موسم بہت سہانا لگتا ہے جس کی شامیں چرانے کے لیے میرا دل مچلتا رہتا ہے مگر یہ ساری باتیں اس کتاب کی ہیں جو میرے باطن میں حرف حرف سانس لیتی ہے۔

☆

طاقِ شب میں چراغ

عاصی کرنالی

(●)

آیئے نذیر قیصر کی باتیں کریں آپ نے یہ نام بہت سنا ہوگا ضرورت سے زیادہ اور ہوسکتا ہے آپ اس سے ملے بھی ہوں گے اگر آپ اس سے ملے نہ ہوں اور ملنے کی خواہش ہوتو آپ کو حیرت کے کئی مرحلوں سے گزرنا ہوگا مثلاً آپ ملتان آکر کسی مسجد کے قریب لوگوں سے دریافت کریں گے مولانا نذیر احمد کے ہم نام نذیر قیصر کہاں رہتے ہیں اور وہاں سے پتہ چلے گا کہ انہیں قرب مسجد کی بجائے درون کلیسیا تلاش کیجئے، تب آپ نئے پتے پر چل کھڑے ہوں گے اور حدود کلیسیا میں واقع اس کے گھر پر دستک دیں گے اندر سے ایک خوبصورت نوجوان برآمد ہوگا آپ کہیں گے برخوردار! ذرا اپنے ابا نذیر قیصر کو بھیج دیجئے ''یا'' عزیز القدر! اپنے برادر بزرگ کو اطلاع دیجیے کہ ایک ملاقاتی آیا ہے وہ برخوردار یا عزیز القدر مسکرائے گا اور دھیمے لہجے میں کہے گا، اچھا ملواتا ہوں آپ بیٹھک میں تشریف رکھئے، آپ بیٹھک میں تشریف رکھیں گے، وہ آپ کے سامنے بیٹھ جائے گا آپ کو میٹھی نظروں سے دیکھے گا۔ آپ پر مسکراہٹ کی ہلکی پھلکی نرم چاندی بکھیرے گا اور دھیرے سے کہے گا فرمایئے! میں ہی نذیر قیصر ہوں۔ تب آپ بحرِ حیرت میں ایک گہرا غوطہ کھائیں گے۔ تب وہ کہے گا۔ چائے پئیں گے آپ؟ اور پھر خود ہی بات بڑھائے گا۔ ''وہ تو آپ کو پینی ہی پڑے گی۔'' اچھا میں چائے بنواتا ہوں تب وہ اندر چلا جائے گا خاصی دیر کے بعد آئے گا۔ بس چائے آیا ہی چاہتی ہے، ہاں کیسے آئے آپ؟ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر''' اتنی دیر میں بیگم نذیر قیصر آجائیں گی، بے حد خوش خلق، نیک دل، لائق صد احترام خاتون، آکر آپ کو سلام کریں گی اور نذیر قیصر سے کہیں گی، وہ۔۔۔ چینی تو گھر میں نہیں ہے! نذیر قیصر مسکرا کر، لجا کر، شرما کر کہے گا، ''اوہ یاد آیا چینی تو واقعی نہیں ہے''

''اچھا کوئی بات نہیں آپ دوبارہ آئیں گے تو کھانا کھائیں گے اور سنایئے آپ کے شہر کا کیا حال ہے، ادبی سرگرمیاں کیسی جارہی ہیں؟''

یہ تھی نذیر قیصر سے آپ کی ملاقات، ان چند لمحوں کی ملاقات کے بعد جب آپ اس سے رخصت ہوں گے تو آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ اپنا دل یہیں چھوڑ گئے ہوں!

نذیر قیصر ایک بھولی بھالی من موہنی شخصیت کا نام ہے جو آپ کی آنکھوں کے ذریعے آپ کے کانوں کے ذریعے آپ کے ذائقے کے ذریعے آپ کے ذہن و دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ میں نے تین حواس کا ذکر کیا ہے۔ لامسہ اور شامہ کو میں نے چھوڑ دیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے ذریعے اثر انداز ہونے کی بات بہت سادہ ہے۔ یعنی اس کی خوب صورتی، کانوں کے ذریعے اس کے در آنے کی بات سے میرا اشارہ اس کے دلکش اور دل نشیں کلام کی جانب ہے۔ رہی بات ذائقے کی اس کی مجموعی شخصیت مجھے لذیذ و شیریں لگی ہے اس لیے میں نے اپنے وجدان کے حوالے سے اس کی شخصیت کو ذائقے کے استعارے کی شکل میں پیش کیا ہے۔

نذیر قیصر بے حد نازک بدن نوجوان ہے پھر یہ نازک بدنی اپنا دائرہ پھیلاتی ہے اور یہ نزاکت اس کے مزاج سے چل کر اس کے خیال تک جا پہنچتی ہے۔ یعنی وہ نازک بدن ہے اور اس کی شاعری بھی نازک بدن، نازک مزاج اور نازک خیال ہے آپ کرن، تتلی، جگنو، بیر بہوٹی، پھول کی پتی، شبنم کے قطرہ لرزاں ہوا کی موج لطیف، ستارہ صبح کے تبسم، زیرلب کا تصور کریں گے تو اس کی شاعری کا عرفان آپ کو ہو سکے گا۔ اس کا شعر اس کے ہونٹوں سے ادا ہوتا ہے اور سامع کے دل میں براہِ راست اتر جاتا ہے پوری معنویت کے ساتھ جیسے چاند کی کرن جو انسان کے وجود کو چھوتی ہے اور شب کے اسرار اس پر منکشف کر دیتی ہے یا ہوائے صبح کا لطیف جھونکا جو انسان کی آنکھوں کو چومتا ہے اور اس پر روشنیوں کے بند دروازے کھل جاتے ہیں وہ غزل کہتا ہے، نظم کہتا ہے، گیت کہتا ہے اور شعر کے ہر پیرائے میں اسرار و معانی کی ایک نئی دنیا سمو دیتا ہے اس کا لہجہ اس کا اپنا لہجہ ہے۔ آپ بہت سے شعراء کے اشعار میں سے اس کا شعر الگ پہچان لیں گے یہ اس کی جیت ہے اس کی عظمت ہے اس نے اپنے خلوص اور ریاضت سے اپنا ایک تشخص قائم کیا ہے، ایک کانفرنس میں جیلانی کامران نے جب اپنے مقالے میں جدید شعراء کی فہرست تیار کی تو وہ نذیر قیصر کے نام پر مکمل ہوئی۔

نذیر قیصر ایک ملنسار اور روادار شخصیت ہے۔ اس کا وجود خیر کے خمیر سے اٹھا ہے اس کا مسلک صلح کل ہے اس کی دوستی سمندر کی طرح کشادہ آغوش ہے اس میں کسی دین و ملت، کسی طبقے، کسی حیثیت کی تخصیص نہیں، عیسائی ہو یا مسلمان ادیب ہو یا اَن پڑھ، امیر ہو یا غریب بوڑھا ہو یا بچہ، اس کے اخلاق اور خوش معاملگی کی پھوہار سب پر برستی ہے، وہ انسان دوست ہے اور محبت کو ایک آفاقی رشتہ قرار دیتا ہے اور سب میں اپنی دل جُو مسکراہٹیں بانٹتا پھرتا ہے۔ اگر مسکراہٹ کوئی مذہب ہوتا تو نذیر قیصر اس کا پیغام بر ہوتا۔ اس کی یہ مسکراہٹ دکھے دلوں کا مرہم آسودگی ہے اس کے وسیلے سے اس نے زخمی انسانوں کی مسیحائی کی ہے، پھر اس کے تبسم کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ یہ تبسم کہیں کہیں آنسوؤں کی قطار بن جاتا ہے اور یہاں سے اس کا فن شروع ہوتا ہے اور یہ اپنے ایک ایک آنسو کو قرطاس پر سجاتا ہے اور اس کی پوری شاعری دردمندوں کے لیے ایک پیغام محبت بن جاتی ہے۔ میں نے اس کی شاعری کا جس قدر مطالعہ کیا ہے اس سے میں اس نتیجے میں پہنچا ہوں کہ یہ شاعری، آشوب انسان کا مسلسل نوحہ ہے اور نوحے کو اس نے اپنے دل کے لہو کی بوندوں سے لکھا ہے فرد اور انسانی معاشروں کو جن ذہنی اور

عملی آلام کے آتشیں سمندر سے گزرنا پڑتا ہے۔اور دکھ درد کے جتنے تھپیڑے سہنے پڑتے ہیں۔ان کے شدید احساس سے نذیر قیصر کا شعر جنم لیتا ہے آپ اس کی پوری شاعری کے مزاج میں خوشی اور شادمانی کی لہر نہیں پائیں گے۔اس کے یہاں زخموں اور ٹیسوں کے عکس ہیں وہ بلند فریادوں کے مقابلے میں ان خاموش چیخوں کا ترجمان ہے۔جو دلوں ہی میں گھٹ کر رہ جاتی ہے وہ کامرانیوں کی علم برداری کرنے کی بجائے ان محرومیوں اور حسرتوں کا مرثیہ خواں ہے جن کے ننھے ننھے جنازے دلوں کے قبرستان میں دفن ہو جاتے ہیں ، انتشار، اضطراب،شکست وریخت، بے یقینی، ہراس اور خوف۔۔۔

ان سب عناصر سے اس کی شاعری، تنظیم وترتیب پاتی ہے اور اس طرح وہ عوام کی اجتماعی حیات کا غمخوار اور انیس بن کر سامنے آتا ہے لیکن وہ اس کاروان اضطراب کو خوف کے مرحلوں میں نہیں چھوڑتا بلکہ انہیں آنے والے آسودہ لمحوں کی بشارت بھی دیتا ہے وہ نفرت اور جنگ اور تعصب میں گھری ہوئی دنیا کے سر پر شاخ زیتون کا سایہ بھی کرتا ہے وہ دکھی انسانیت کو نئے عہد کے میٹھے گیت بھی سناتا ہے اور انہیں امید اور برکت اور سلامتی کے مژدے سنا کر ان کے دلوں میں زندہ رہنے کی امنگ بھی پیدا کرتا ہے۔

فن کی یہ باتیں غیر ارادی طور پر لکھنے میں آ گئیں ورنہ میں تو اس کی شخصیت پر لکھ رہا تھا لیکن میں کیا کروں جس طرح اس کی مسکراہٹ آنسو بن جاتی ہے اسی طرح اس کی ذات میں سے اس کی فنی شخصیت اُبھر آتی ہے یعنی مسکراہٹ ایک لمحے میں آنسو بننے کے عمل سے گزر جاتی ہے۔

نذیر قیصر بہت سی مصروفیتوں میں گھرا ہوا شخص ہے ان گنت ، بے شمار، لاکھوں مصروفیتیں ، جن میں شعر کہنا بھی شامل ہے اور اپنے ننھے منے فرشتوں جیسے بچوں کے چٹاچٹ بوسے لینا بھی جن میں اہم کلیسائی ذمہ داریاں بھی شامل ہیں۔اور اپنی میلی قمیض دھلوانے کے لیے لانڈری جانا بھی۔جن میں ادبی اور تنقیدی کانفرنسوں میں شریک ہونا بھی جن میں تبلیغ محبت بھی شامل ہے اور ملامت بھی تبلیغ محبت چرچ کی جانب سے اور ملامت بیگم کی طرف سے کہ ''تم آتے ہوئے بینگن اور آلو خرید کر کیوں نہیں لائے'' گھر میں کیا پکے گا؟ کلیسائی اجلاس، تبلیغی جلسے طلبہ کی تعلیم و تدریس، میوزک کا انتظام، موسیقی کی تعلیم، ڈراموں کی تیاری، مسلسل سفر، بیرونی مصروفیات، غرض، اس جانِ ناتواں نے اپنے دوش عزم پر پہاڑ اُٹھا رکھے ہیں اور حیرت یہ ہے کہ پہاڑ میں اس طرح پسنے کے باوجود ایسے ترشے ترشائے شعر کہتا ہے جیسے شفاف ہیرے اور ایسی خوبصورت باتیں کرتا ہے جیسے گلاب کے پھول کی پتیاں اور اس طرح مسکراتا ہے جیسے طاق کلیسیا پر چراغ جس کی لو میں دلوں کے لیے شانتی ہے راحت ہے، سکھ ہے۔۔۔میں نے اسے آرام کرتے نہیں دیکھا، وہ مجھے ایک مشین نظر آتا ہے۔اپنے عزم اور اپنی مشیت سے متحرک رہنے والی مشین، وہ بیمار ہوگا لیکن بیماری کا ذکر نہیں کرے گا نہ بیماری کا عذر بنا کر گزر کرے گا بلکہ کام میں اور زیادہ مصروف ہو جائے گا وہ مسلسل دوا کھائے گا لیکن آپ اُسے اپنے سامنے دوا کھاتے نہیں دیکھیں گے۔شاید وہ اپنے دوستوں کو شریک غم کرنے کے حق میں نہیں وہ تو انہیں آسودگی بانٹتا ہے۔گولی سے اس کا حلق تلخ ہو رہا ہوگا۔لیکن آپ اس کے سامنے آ جائیں گے تو وہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا لے گا تا کہ آپ کو اپنے اس بیکراں خزانے، اس آسمانی دولت میں سے اتنا دے کہ آپ کا دامن بھر جائے اور آپ اپنے زخمِ دل کے باوجود اس کے تبسم میں اس رفاقت دے سکیں۔

مجھے بعض دفعہ یہ حیرت ہوتی ہے کہ اس نے مختصر عمر میں، نازک سے وجود میں اتنی بہت سی لیاقتیں، مہارتیں، صلاحیتیں اور عظمتیں کیسے بھر لی ہیں۔اچھا انسان، اچھا شاعر، اچھا خطیب، اچھا نقاد اور اچھا چارہ گر۔۔۔ایسا شخص جو سب سے محبت کرتا ہے اور سب اس سے محبت کرتے ہیں۔میں نے کبھی کسی کو اس پر غصہ ہوتے نہیں دیکھا میں بھی اس پر غصہ نہیں ہوا حالانکہ ایک واقعے پر بلکہ دو واقعوں پر مجھے غصہ کرنا چاہیے تھا۔

آپ بھی سن لیجیے، پہلا واقعہ یہ ہے کہ اس نے ملتان میں ایک ادبی کانفرنس منعقد کی اس کے مشوروں میں مَیں بھی شریک رہا جب تفصیلی دعوت نامہ چھپا تو اس کے مقررین اور مقالہ خوانوں کی فہرست میں میرا نام نہیں تھا۔

میں نے گلہ کیا تو ذرا سوچ کر کہا: ''اچھا! ایک صاحب کے متعلق شک ہے کہ وہ شریک نہیں ہو سکیں گے میں آپ کا نام ''ریزرو'' میں رکھ لیتا ہوں۔''

مجھے شدید غصہ آنے لگا لیکن اس نے مجھے اپنے ہونٹوں پر سجی ہوئی مسکراہٹ سے فوراً مغلوب کر لیا۔

دوسرا واقعہ بھی سن لیجیے۔

ایک دن اس نے بے حد اشتیاق اور اصرار سے کہا ''میں چاہتا ہوں، آپ کی اور بھابی کی دعوت کروں! اچھا کل رات آ جایئے کھانا ہمارے گھر کھایئے، دیکھیے بھولئے گا نہیں۔''

میں نے کہا ''بہتر ہے ہم آ جائیں گے۔''

''میں چند قدم چلا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی، ضرور آیئے گا، بھولئے گا نہیں۔''

''۔۔۔اگلی رات ہم گھر پہنچے گھر بند دروازہ مقفل، پڑوسیوں سے پوچھا، کہاں ہیں یہ لوگ؟''

کہا! ''کسی دعوت پر گئے ہیں۔''

اگلے دن میں اس کے پاس گیا کہ اس پر شدید غصہ اتاروں، میں نے اپنے غصے کو نہایت ضبط کرتے ہوئے کہا!

رات ہم آئے تھے۔

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیوں آئے تھے؟''

☆

بیل بوٹوں سے لکھی حمد

محمد حمید شاہد
(اسلام آباد)

گزر چکی صدی کی چھٹی دہائی کے لگ بھگ وسط سے غزل کے باب میں اپنا نام رقم کروانے والے نذیر قیصر سے میرا اولیں تعارف ان کی کتاب ''آنکھیں چہرہ ہاتھ'' سے ہوا تھا:

آنکھیں چہرہ ہاتھ لئے پھرتا ہوں میں
کیا کیا اپنے ساتھ لئے پھرتا ہوں میں

جی، اس کتاب سے، جس کی تقریظ میں جیلانی کامران نے ایک عجیب بات لکھ دِی تھی۔ نذیر قیصر کا ذکر آتے ہی ہر کوئی وہی بات دہراتا تھا؛ کوئی متعجب ہو کر اور کوئی مرعوب ہوتے ہوئے۔ جیلانی کامران کے مطابق؛ نذیر قیصر کی غزلوں میں سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ ان کی دُنیا دشت وحشت کی دنیا نہیں تھی۔ بات یہیں تک رہتی تو اتنا ہنگامہ کہاں اٹھنا تھا۔ یہ بات انہوں نے 1967ء میں کہی تھی اور ہم آج تک کی غزل کو اٹھا کر دیکھ لیں، تو لگتا ہے کہ غزل کی دنیا تو اسی دشت میں پڑتی ہے۔ یہی وتیرا اسے محبوب ہو گیا ہے اور کسی حد تک اس صنف کی شناخت بھی۔ تپتی دوپہر، سنسان گلیاں، ویران مکان، بند دروازے، ریت کے تپتے اڑتے ٹیلے، خوف، تاریک رات جو ہمارے سروں پر تب تنی ہوئی تھی، ابھی تک تنی ہوئی ہے، ماضی کی پوشاک پہن کر آتے لمحے اور جذباتی جغرافیہ۔ اُس دشت وحشت کا لگ بھگ ایسا ہی نقشہ جیلانی کامران نے کھینچا تھا جس میں نذیر قیصر کی شاعری کا طلوع ہوا تھا اور بتایا تھا کہ یہ شاعر وہیں کہیں تھا مگر اس دشت سے الگ کھڑا تھا۔ اب جیلانی کامران کا وہ جملہ مقبس کر رہا ہوں جس نے ہر شاعر کے دل میں کھلبلی سی مچا رکھی تھی:

''نذیر قیصر کی شعری دنیا میں تجربے کا جمود ٹوٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور پہلی بار انسان اپنے آپ کو کائنات کی بارگاہ میں جاگتا ہوا محسوس کرتا ہے۔''

میں عرض کر چکا ہوں کہ عمومی طور پر دیکھیں تو غزل کی دنیا میں وحشت میں گرفتاری کا چلن اب بھی ویسا ہی ہے اور بہ طور خاص ایسے شاعروں کو بہت محبوب ہے جنہیں فوری توجہ چاہیے کہ یہ حیلہ اتنا جادو اثر تو ہے ہی کہ فوری توجہ دلا دیتا ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ نذیر قیصر اپنی ڈگر پر اور اپنی الگ شناخت کے ساتھ ایک نفسِ مطمئنہ کی طرح رواں ہیں۔ وہ کائنات اور انسان کے درمیان جن جمالیاتی اقدار کی بنیاد پر رشتہ قائم کر رہے ہیں وہ انسان کی اپنی نظر میں بھی توقیر بڑھانے کا سبب ہوئی ہیں۔ یہ ناراض، جھلاّ تا جھگڑتا اور الجھتا ہوا انسان نہیں ہے ایک نئی دنیا کا نیا انسان ہے؛ ایسا انسان جسے اپنی صداقتوں پر پورا ایقان ہے۔ جو اپنی روح کے کندھوں پر کسی گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے نہیں ہے، جو درختوں کی شاخوں اور خوشبو کی دیوار کے عقب سے ایک کھلنڈرے بچے کی طرح اچھلتا کودتا نکلتا ہے، راہ کے روڑے پتھروں کو پاؤں کی ٹھوکر لگاتے اور انہیں دور تک لڑھکاتے ہوئے:

خوشبو کی طرح تھام کے چلیے ہوا کا ہاتھ
مثلِ غبار، بوجھ فضا پر نہ ڈالیے

خوشبو کی طرح ہوا کا ہاتھ تھامنے والا بچہ خاک پر بیٹھ کر اس پر ایک دائرہ بناتا ہے، اپنے اردگرد جس میں انسان کی پوری کائنات سمٹ جاتی ہے۔ جی یہ دائرہ جو کائنات کو محیط ہے اسی زمین پر ہے جس پر وہ ہے اور ہم ہیں:

آسمانوں میں رب نہیں ملتا
پہلے ملتا تھا اب نہیں ملتا
مجھ کو دنیا میں جو میسر ہے
تیری جنت میں سب نہیں ملتا

بچے اور اس کی کل کائنات کا ذکر ہوا تو ''دوپہر کا چاند'' کے دیباچے میں نذیر قیصر کے اس کہے کی جانب دھیان جاتا ہے:

''میری شاعری بچوں کے لئے ہوتی ہے جسے بڑے بھی پڑھ سکتے ہیں اور بڑوں کو یہ شاعری ضرور پڑھنی چاہیے تاکہ وہ بچے بن سکیں شاعری جیسی بھی ہو جب تک وہ حیرت تخلیق نہیں کرتی پڑھنے والے کا راستہ روک کر کھڑی نہیں ہو جاتی اس وقت تک وہ شاعری نہیں کہلا سکتی۔ حیرت محسوس کرنے اور تخلیق کرنے کے لئے دنیا کو بچوں کی آنکھوں سے دیکھنا پڑتا ہے:

میں نے بچوں کی آنکھوں سے دنیا دیکھی ہے
قیصر میرے جیسے شاعر بچے ہوتے ہیں

جو شاعر دنیا کو بچوں کی آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ حیرت تخلیق بھی کرتا ہے اور اپنے پڑھنے والے کو حیرت زدہ بھی کرتا ہے۔''

نذیر قیصر کا یہ بیان بہت سے مغالطے پیدا کر سکتا ہے۔ جس حیرت کی وہ یہاں بات کر رہے ہیں یہ قطعاً بچگانہ حیرت نہیں ہے؛ ایک اور طرح کی حیرت ہے جس میں کئی قفل کھل جاتے ہیں۔ لگ بھگ ویسی جو صوفیا کے دامن میں پڑتی ہے تو بہت کچھ منکشف کرتی چلی جاتی ہے۔ اس نوع کی حیرت بوڑھی اور مکار آنکھوں کے وسیلے سے تخلیقی تجربے کا حصہ نہیں ہو پاتی، اس کے لیے بچوں کی سی معصوم آنکھیں چاہئیں۔

روتی ہنستی شاعری
بچوں جیسی شاعری
شعلے جیسا ذائقہ
پانی جیسی شاعری

بہ ظاہر نذیر قیصر سامنے کی زبان برتتے ہیں، سہل اور رواں، مگر واقعہ

یہ ہے کہ پانی ہو کر متشکل ہوتی اس شاعری کی تاثیر بدل کر شعلہ ہو جاتی ہے۔اُس آتش فشاں پہاڑ جیسی جو دیکھنے کو شانت نظر آتا ہے مگر اس کے اندر کا دھکتا رسال کھول رہا ہوتا ہے۔احساس کی یہ شدت اور اس شدت کا محض دکھاوے کا نہ ہونا بلکہ حقیقی ہونا اس اخلاص کی صورت سامنے آتا ہے جو ان کے شعر کو تاثیر کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔

دور تک پھول برستے ہی چلے جاتے ہیں
جب وہ ہنستی ہے تو ہنستی ہی چلی جاتی ہے

اُس کا اسٹیشن آنے والا تھا
ریل بھی سیٹیاں بجانے لگی

اُس نے ہاتھوں پہ ہونٹ کیا رکھے
آ گئی ساری جان ہاتھوں میں

اُس نے پیاس میں کروٹ بدلی
اور گھڑے میں جاگا پانی

میں نے اوپر نذیر قیصر کے ہاں جس بدلی ہوئی فضا کا ذکر کیا ہے اس میں ہماری اپنی زمین ہے، مٹی، پانی، چاند اور ستارے ہیں۔بہتی ہوا، پھول اور خوشبو ہے۔کہہ لیجئے، جہان فطرت کی کتاب صفحہ صفحہ کھلتی چلی جاتی ہے اور ہر صفحے کی لرزش سے ایک طلسماتی آہنگ بنتا ہے اور اس آہنگ کے ساتھ اس انسان کا ہیولا بنتا ہے جو اپنے آپ کو کائنات کی بارگاہ میں جاگتا ہوا محسوس کر رہا ہے۔اس منظر کی جھلک دیکھنے کو آخر میں ایک غزل سے دو چار اشعار:

نوشتے بکھرے پڑے تھے غبار اُڑا ہوا تھا
کہیں کہیں پہ ترا نام بھی لکھا ہوا تھا
اُتر رہے تھے فرشتوں کے غول باغوں پر
قدیم شہر تھا اور آسماں جُھکا ہوا تھا
لکھی ہوئی تھی کوئی حمد بیل بوٹوں سے
پرانے عہد کا کتبہ کہیں پڑا ہوا تھا
پرانے لوگ کسی غار میں پڑے ہوئے تھے
اور اُن کے نام کا سکہ کہیں چلا ہوا تھا
کھلے ہوئے تھے کہیں پھول باغ سے باہر
چراغ، طاق سے باہر کہیں جلا ہوا تھا
کسی بہشت کا کونا تھا میرا حجرہ بھی
کہیں کتاب، کہیں پر دِیا پڑا ہوا تھا

☆

- بقیہ -

گنبدِ خوف سے بشارت

بھیج اس شب کے بعد صبحِ حساب
اے خدا، آخری دعا، سن لے

خدا کے تصور میں اس صوفیانہ انہماک و انجذاب کے عالم میں بھی وہ خلقِ خدا کے مصائب و آلام سے غافل نہیں چنانچہ انقلابی آرزو مندی کا پرتو بھی نذیر قیصر کی غزلوں اور نظموں پر جھلملا رہا ہے:

اُلٹ رہا ہے ورق فلک کا
زمیں کو حیرت کا سامنا ہے
حصارِ ابر سے سورج نکلنے والا ہے
نظر اٹھاؤ کہ منظر بدلنے والا ہے
پسِ فصیلِ خموشی صدائیں کیسی ہیں؟
سنو کہ درد کا چشمہ اُبلنے والا ہے
کہو کہ پہلی کرن تیغ بننے والی ہے
کہو کہ آخری تارا نکلنے والا ہے
پکارتے ہیں در و بام قتل گاہوں کے
ہجوم شہر گھروں سے نکلنے والا ہے

اور نظم ''اے سرخ ستارے مشرق کے'' سیاسی استبداد کا جیتا جاگتا منظر پیش کرتی ہے:

اے سرخ ستارے مشرق
سنگینوں پر جو پھول کھلے
وہ کس کے لہو کے دولت تھے
جو پاؤں دھول میں دھول ہوئے
وہ کس منزل کی قسمت تھے
اے سرخ ستارے مشرق کے
آدھی دھرتی آدھا سورج
کس تیغ کی نوک پہ گھوم گئے
پھانسی کی اندھی رسی پر
وہ کون سجیلے جھوم گئے
اے سرخ ستارے مشرق کے

مگر جبر و تشدد کی سفاک اور سراسیمہ فضا میں بھی نذیر قیصر خیر کی قوتوں کی استقامت اور ارتقاء کے چلن پر اپنے ایمان کو متزلزل نہیں ہونے دیتا:

کون روک سکتا ہے
خوشبوؤں کی راہوں کو

دہلیز پہ رکھے پھول

سعود عثمانی
(لاہور)

کیسا عجیب آدمی ہے غیر مرئی کو مرئی بنا دیتا ہے۔ مرئی کو غیر مرئی۔ درختوں پتوں اور پھولوں سے کلام کرتا ہے۔ دن رات صبح او رشام اس کے گھرانے کے افراد میں شامل ہیں۔ ہوائیں بارشیں سردیاں اور گرمیاں اس کے مخاطبین میں ہیں۔ وہ جمادات نباتات سے گفتگو کرتا ہے۔ ان کی خوشی میں خوش ہوتا ہے اور ان کے دکھوں پر غمگین۔ دن اس کی انگلی پکڑ کر نکلتا اور جوان ہوتا جاتا ہے۔ رات اس کے پہلو میں آ کر لیٹ جاتی اور اس سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔ وہ اشیاء کی ارواح کی بات سمجھتا ہے اور ان سے مکالمہ کرتا ہے۔ اصل گفتگو تو اس کی انہی سے ہے۔ ہم سے تو وہ کبھی کبھی بات کرتا ہے اور بات بھی صرف شعر کی زبان میں۔ یہ اختیار صرف شاعر کا ہے اور شاعر ہونا کتنوں کو میسر ہے۔ شاعر بھی ہو جائے تو نذیر قیصر ہونا کتنوں کو میسر ہے؟

ابھی کتاب پر نذیر قیصر کی تصویر دیکھی تو وقت نے ایک الٹی زقند بھری اور میرا ہاتھ تھام کر لے اڑا۔ پھر بیس سال کا فاصلہ ایک لمحے میں طے کر کے لاہور ٹی وی اسٹیشن کے ایک سٹوڈیو میں جا اترا۔ ایک ادبی محفل کی ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔ جناب ظفر اقبال کے ڈرائنگ روم کا منظر سجا ہوا ہے۔ ان کے احباب جن میں لاہور کے نامور شعراء ہیں ان سے ملنے ان کے گھر آئے ہوئے ہیں۔ ایک نووارد سعود عثمانی کے نام سے بھی موجود ہے۔ شعری دنیا کا ا یک معتبر سینئیر نام نذیر قیصر بھی شرکاء میں ہے۔ نووارد شاعر سعود عثمانی حیرت سے دیکھتا ہے کہ نذیر قیصر اپنی شاعری پر بہت کم لیکن سعود عثمانی کی شاعری پر زیادہ بات کرتا ہے۔ سعود عثمانی کے دل میں ان کی شاعری کی قدر تو ہمیشہ سے تھی ان کے ظرف کا سکہ بھی دل پر بیٹھ گیا۔ یہ ان کی شخصیت کا وصف اور اپنے کام پر ان کا اعتماد ہے ہے جو کسی نئے آنے والے سے انہیں خوف زدہ نہیں ہونے دیتا ورنہ ان کے ہم عمر شعراء میں اپنے بعد کے شعرا کے لیے رویہ بالعموم حساب کتاب سیاست اور منافقت سے عبارت ہے۔ کسی جہت سے بھی دیکھ لیں نذیر قیصر کا شعری سفر کمال تخلیق کاری اور نقش گری کا سفر ہے۔ ایسا سفر جو قابل دید بھی ہے۔ قابل داد بھی۔

عجب سفر تھا مرے اس کے درمیاں قیصر
غبار اڑتا رہا اور ستارہ چلتا رہا

ان کے نادر انداز کے چند شعر اور سنیے

گرتے جاتے ہیں پھول بستر پر
کھلتا جاتا ہے تھان ہاتھوں میں

اس نے ہاتھوں پہ ہونٹ کیا رکھے
آ گئی ساری جان ہاتھوں میں
وہی رستہ وہی ہوا قیصر
اور وہی شمعدان ہاتھوں میں

پہلے میں دیکھ رہا تھا اس کو
اب مجھے دیکھ رہا ہے کوئی
زرد بانہوں میں جھکی شامِ وصال
شاخ میں پھول کھلا ہے کوئی
ہاتھ مشعل دیدار لیے
تیز بارش میں کھڑا ہے کوئی

وہ جو جسم اور ملاپ کی لطیف اور باریک جمالیات ہوتی ہیں نذیر قیصر کے یہاں ایسے ایسے فنی رچاؤ کے ساتھ آتی ہیں کہ بس پڑھتے رہیے اور پرت در پرت محسوس کرتے رہیے۔ وصال کا لفظ ان کے یہاں کم کم لیکن وصال کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر کیفیات ان کے یہاں ایسے بیان ہوتی ہیں جیسے پنکھڑی پنکھڑی اور تہہ در تہہ پھول کھلتا ہے۔ ایسا وصال جس میں جسم ہی نہیں ورائے جسم کائناتیں بھی جسمانی طور پر ہم آغوش ہوتی ہیں۔

دیکھتے رہنا تھا پھولوں بھری شاخوں نے مجھے
اور میں نے تجھے ہونٹوں پہ جھکا لینا تھا

وہ آیا تو اتنا پیار دے گا
دن بھر کی تھکن اتار دے گا
دیکھیں گے اسے چراغ اور میں
وہ اپنا لباس اتار دے گا

ہونٹوں کو چومتا رہا شعلہ کسی خیال کا
آنکھوں میں جاگتے رہے سائے شبِ خمار کے

دونوں مہک سے بوجھل تھے
پھول کھلایا دونوں نے
کمرے میں وہ دونوں تھے
شور مچایا دونوں نے
لکھ کر سادہ کاغذ پر
نام بتایا دونوں نے
پھول کھلے خاموشی میں
ہاتھ ملایا دونوں نے

اپنی خوب صورت نثر میں نذیر قیصر نے معاصر شاعری کے بارے میں بہت بنیادی بات کی ہے۔ ''کیا وجہ ہے کہ گفتگو کرتے ہوئے ہم اپنے مقاصد و

معنی کونہایت آسانی سے روزمرہ زبان میں ادا کرتے چلے جاتے ہیں لیکن جیسے ہی شعر کہنے لگتے ہیں،ہم ایک بنی بنائی زبان اوراس کی گھڑی گھڑائی ترکیبوں اورایک خاص شعری فضا کواپنے اوپرطاری کرلیتے ہیں۔'' یہ اس شاعر کی رائے ہے جو محض اپنی رائے دے کر بنی بنائی شاعری نہیں کرتا بلکہ اس نے عملی طور پر نئے زمین آسمان تخلیق کیے۔ایسی فضا بنائی جو اس کے ہم عصروں کے پاس یا تو نہیں تھی یا اس کے محض چند اجزا۔ تھے۔ ہتھیلی پر چند پھول ہونا اور بات ہے پھولوں بھری ٹوکری ہر ہاتھ میں کہاں جھولتی ہے۔

کتنے دنوں کے بعد شجر نے چھتری کھولی
کتنے دن میں دن بارش کا واپس آیا
ہاتھ میں دیا لیے وہ چھت پر واپس آئی
اس کے ساتھ ہوا کا جھونکا واپس آیا

تو دھرتی کی پہلی رات
میں دھرتی کا پہلا دن
تیرے بدن میں جاگی رات
میرے بدن میں ڈوبا دن

جمالیاتی شعور اس شاعری میں اتنا غیر معمولی اور منفرد ہے کہ خاص طور پر خود کلام دل کی لرزش اور تھرتھراہٹیں تک صاف سنائی دیتی ہیں۔

خاموشی طویل ہو گئی تھی
پھر کی نہیں کوئی بات اس نے
شعلے پہ رکے ہیں ہونٹ میرے
آنکھوں پہ رکھے ہیں ہاتھ اس نے
میں ایک تھکا ہوا مسافر
بستر پہ بچھا دی رات اس نے
وہ مرے دھیان میں گم بیٹھی ہے
بال کھولے ہیں ہوا نے اس کے
صبح تک مجھ میں بکھر جائیں گے

ٹوٹ کر آئینہ خانے اس کے
شعلے جیسا ذائقہ
پانی جیسی شاعری
تیرا پہلا عشق ہے
میری پہلی شاعری
اس دن کتنے پھول کھلے
اس دن کتنی جھڑی رہی
دیا طاق میں پڑا رہا
ماچس جیب میں پڑی رہی
آسمان کے سارے رنگ انڈیل دیے
دھرتی پر بارش برسانے والے نے
خالی چھوڑ دیا ہے دل کی تختی کو
دیواروں پر نقش بنانے والے نے
دیکھا نہیں دہلیز پہ رکھے پھولوں کو
دروازے سے اندر آنے والے نے
کوئی درخت بنایا نہیں کنارے پر
دریا کی تصویر بنانے والے نے
دیکھیں گے اسے چراغ اور میں
وہ اپنا لباس اتار دے گا

نذیر قیصر کے فن وشخصیت کومختصراً بیان کرنا ہوتو انہی کا شعر مستعار لینا پڑے گا۔وہ انہوں نے کسی کی بھی بات کی ہو دراصل اپنی بات کی ہے۔

دنیا اچھی لگتی ہے رب اچھا لگتا ہے
اچھی آنکھوں والوں کو سب اچھا لگتا ہے

جھلاہٹوں تلخیوں اور نفرتوں سے لبالب بھری ہوئی ہماری شعری برادری میں کتنے شاعر ہوں گے جنہیں دنیا اچھی لگتی ہے۔کتنے ہوں گے جنہیں رب اچھا لگتا ہے۔میں سوچتا ہوں کہ ان لوگوں کو نذیر قیصر جیسی اچھی آنکھیں کہیں سے مل جائیں لیکن پھر خیال آتا ہے کہ پھر بھی کیا فائدہ۔یہ قلم تو رب کسی کسی کو دیتا ہے۔نذیر قیصر جیسا قلم انہیں کیسے ملے گا۔نذیر قیصر ہونا کتنوں کو میسر ہے۔

بلاعنوان

گدھ ایک مردار گوشت کھانے والا پرندہ ہے جس کی فطرت میں قدرت نے ایک غور فکر کا پیغام دیا ہے۔اس کا کھاتے ہوئے پیٹ تو بھر جاتا ہے لیکن بھوک ختم نہیں ہوتی تو وہ بھاگنا شروع کر دیتا ہے اور بھاگتے بھاگتے کھایا ہوا الٹ دیتا ہے۔الٹی کے بعد پھر کھانے لگتا ہے پھر بھی پیٹ تو بھر جاتا ہے لیکن بھوک ختم نہیں ہوتی۔اسی طرح وہ بار بار یہی عمل دہراتا ہے لیکن بھوک ختم نہیں ہوتی کیونکہ وہ حرام اور مردار کھاتا ہے۔یہ قدرت کے وضع کردہ آفاقی اصول ہیں جو حرام کھانے والوں کے لیئے لمۂ فکریہ ہیں۔قدرت کچھ لوگوں کو اختیار دے کر موقع دیتی ہے کہ جتنا کھا سکتے ہو کھا لو مگر سیری کی لذت سے ہمیشہ محروم رہو گے۔مالِ حرام کھانا تمہارے لئے ایک مشقت کے سوا کچھ نہیں ہے۔حرام کھانے سے پیٹ تو بھر جائے گا لیکن تمہاری بھوک کبھی ختم نہیں ہوگی۔

جگراتے دا بھیت

- کھوج -

محمد انعام الحق (اسلام آباد)

میاں محمد بخش دے ناں

جے توں بھانڈا بھرنا کُڑیئے
شاماں توں نہیں ڈرنا کُڑیئے

ڈبن توں وی اوکھا ہوندا
اکھیاں دے وِچ ترنا کُڑیئے

جینا مرنا آ جاوے تے
کیہ جینا کیہ مرنا کُڑیئے

فیر نہیں رنگی جانی چُنی
فیر نہیں بدل ورھنا کُڑیئے

آندے آندے آ جاندا اے
عشق محبت کرنا کُڑیئے

جاندے ویلے بُھل نہ جاویں
پھُل سرہانے دھرنا کُڑیئے

○

قسم فجر دی

قسم فجر دی
جدوں فجر ساہ لیندی ہووے
قسم اگ دی
اگ جدوں رتاں دے رنگلے چرخے اُتے
فجر دی پونی کتے
پھل کھڑ جاون نیلے پیلے رتے
قسم شام دی
شام جدوں سورج دے اوہلے آن کھلوے
قسم چراغ دی
جدوں چراغ دی لو پانی تے تردی ہووے
قسم رات دی
رات جدوں اکھیاں وچ ہسے
جگراتے دا بھیت نہ دسّے
قسم خاک دی
خاک جدوں ہڈیاں دے اُتے
سجر اماس بنے
ہلدی ہوئی ٹہنی اُتے
پھل کپاس بنے
قسم قلم دی
قلم جدوں مٹی دی کوری تختی اتے
پہلے حرف دی لو کھلارے
قسم کتاب دی
جدوں کتاب دا آخری ورقہ پھولیا جاوے
حرف لہو وِچ تولیا جاوے
ازلاں دی گھنیری چُپ وِچ
سنیا جاوے بولیا جاوے

○

بولیاں

اُوہنے پلنگ تے رات وچھائی
سُفنے جاگ پئے

اسی جاگ جاگ کے سُتے
راتاں نہ مُکیاں

اسی موم بتی نوں چُمیا
بلاں اُتے رت جم گئی

سُکے رُکھ تے ویل چڑھیائی
رُکھ پچھے چن ہسدا

ساڈے نال جاگیاں سُتیاں
راتاں ہان دیا

تیری اکھیوں سُرمہ ڈُلھیا
جگ تے ہنیر پے گیا

کالی گُت پیراں نوں چُمدی
پیر تیرے ڈُڈھ ورگے

لمی لاٹ دے دیویا تیری
مہندی والے ہتھ سڑ گئے

اسی ورقے کالے کیتے
حرف نہ لِکھیا گیا

اسی قبریں پھل چڑھیائے
باغ اُجاڑ چھڈے

اسی فصلاں بچن والے
گھر ساڈے چُلھا نہ بلّے

اسی لائیاں کھجوراں لمیاں
ہتھ ساڈے کیہ آیا

اسی رکھے ڈاکو راکھے
آپے سوندے رہے

اسی راتیں شہر وسایا
فجرے اجڑ گیا

اسی گوریاں نوں وطنوں کڈھیا
کالے ساڈے ویر پے گئے

اسی پاکستان بنایا
تے ادھا توڑ سٹیا

بُوٹ فوجیاں دے پالش کیتے
مونہہ ساڈے کالے ہوگئے

اسی سورج قیدی کیتا
چڑیاں بول پیاں

اسی فجراں کتن والے
رات ساڈے ہتھ چُمدی

۔ غزل ۔

جینا سی یا مرنا سی کُجھ نہ کُجھ تے کرنا سی
دیوا بال کے بھل گئے ہاں دیوا کتھے دھرنا سی
لہراں لہندیاں ریتاں وِچ کیہ ڈُبنا کیہ ترنا سی
جے بیلاں نہ لاندے تے کندھ نے ہور اُسرنا سی
جیہنوں بھلدے جاندے ساں اوہنوں یاد وی کرنا سی
پھُل پیراں وِچ رکھنے سن چن سرہانے دھرنا سی
جتھے لکھاں ڈبے سن اوتھوں پانی بھرنا سی
قیصر ہُو دے عالم وِچ اپنے آپ توں ڈرنا سی

اشلوک

(گورونانک دے ناں)

نہ میں فجر دی ٹہنی چُمی
نہ کوئی پھُل کھڑایا
نہ میں سورج قلعی کرایا
نہ میں چن چمکایا

نہ اوہ عشق چبارے ستی
نہ اُس وال کھلارے
نہ میں لِتا پینگ ہلارا
نہ میں توڑے تارے

نہ اوہنے سر چُنی لِتی
نہ میں بکل ماری
چن چڑھیا میں بوہا کھولیا
اوہنے کھولی باری

نہ میں مرزا نہ اوہ صاحباں
نہ کوئی میر شمیر
فیر وی اوہ کمانے چڑھ گئی
لُٹے میرے تیر

نہ میں جاگدا اپنے کنڈھے
نہ کوئی اوس کنارے
دوہاں دے وِچکار لشکدے
ازلاں دے لشکارے

نہ اُس رنگلا پلنگ وچھایا
نہ میں ویڑھے وڑیا
نہ میں سُتا باغ بہشتیں
نہ میں دوزخ سڑیا

نہ میں بوہے دستک دِتی
نہ کوئی باہر آیا
نہ میں اپنی ذات پچھانی
نہ میں اُس نوں پایا

نہ سورج نہ دریا چڑھیا
نہ کوئی کونج کنارے
نہ اوہنے اسمان بنایا
نہ میں کھنب کھلارے

نہ میں ایہہ تن لہریں گڈیا
نہ میں لئی اڈاری
نہ میں سورج نال کھلوتا
نہ اُس کھولی باری

نہ میں ستا اوہدے سُفنے
نہ اُس آن جگایا
جاگو میٹی رات لنگھائی
ویلا کوچ دا آیا

ماہیے

چنی وِچ چن سیتا
کیہ کیتا دنیا تے
جے پیار وی نہ کیتا

امبیاں نوں بور پیا
عشقے دا دیوا جگیا
مِٹی وِچ نور پیا

میلہ اے چراغاں دا
ایہہ نگری داتا دی
ایہہ شہر اے باغاں دا

بوہا کُھلیا حویلی دا
گلے صراحی دے
اک ہار چنبیلی دا

دو پنچھی پتاں دے
گھراں والے کیہ جانن
دُکھڑے بے وطناں دے

چنبے دا ہار ہووے
رنگلے پلنگ اُتے
میں ہوواں یار ہووے

کِلی تے چن ٹنگیا
اسی چولا رنگیا سی
اوہنے اپنا تن رنگیا

گولی چل گئی باڈر تے
امبراں دا لہو ڈُلھیا
دھرتی دی چادر تے

کافی

(جاوید نوردے ناں)

عشق چبارے چرخہ ڈاہیا
کتیا چانن چوری دا
"سانو لیاں دے نین سلونے
سوہا دوپٹہ گوری دا"

سانولیاں نیں پینگاں پائیاں
نیلیاں پیلیاں رُتاں آئیاں
پانی تے پھل توری دا
سوہا دوپٹہ گوری دا

نہ اکھیاں ستیاں نہ جگیاں
تن دے اندر اگاں لگیاں
پانی صراحی کوری دا
سوہا دوپٹہ گوری دا

کچے رنگیں کُرتی رنگی
باہیں چوڑی منگی تنگی
اکھیں سُرمہ چوری دا
سوہا دوپٹہ گوری دا

گِٹھ گِٹھ اتے گنجھلاں گنڈھاں
کیویں کھولاں کیوں وٹڑاں
سرا نہ لبھدا ڈوری دا
سوہا دوپٹہ گوری دا

کالا امبر، ہرا سمندر
دیوے دی بتی دے اندر
بلدا تیل کٹوری دا
سوہا دوپٹہ گوری دا

محبتوں کے گلاب

فاری شا
(لندن)

نذیر قیصر کی شاعری اپنے ہم عصروں سے بہت آگے کا سفر ہے۔
صوفی تبسم

نذیر قیصر کی شاعری اُردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے جدید شاعری کے شور میں جہاں بہت سی آوازیں ایک دوسرے میں گم ہو کر رہ گئی ہیں وہاں نذیر قیصر کی آواز سب سے الگ سنائی دیتی ہے۔ نذیر قیصر ایک منفرد شاعر ہیں مگر ان کی انفرادیت اجتماعی شعور سے وابستہ ہے۔ نذیر قیصر کا بنیادی موضوع ذاتی اور عمومی دکھ اور درد کا گہرا احساس ان کے اسباب کا ادراک اِن عوامل کے خلاف احتجاج اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی اُمید اور آرزو ہے۔ نذیر قیصر کے پیرایہ اظہار میں تنوع بھی ہے اور موضوع سخن میں آدرش بھی وہ سیدھی مگر گہری بات کرتے ہیں۔ نذیر قیصر کا کلام ابہام سے مُبرّا ہے ان کے جذبات اور افکار ایک صحت مند ذہن اور دردمند دِل کا پتہ دیتے ہیں۔
فیض احمد فیض

نذیر قیصر نہ صرف جدید طرز احساس کی دولت سے مالا مال ہے بلکہ یہ جدید طرز احساس وہ آگے تقسیم بھی کرتا ہے۔ اس کے نہایت اعلیٰ درجے کے شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ نذیر قیصر کا شمار جدید غزل کے اُن گنے چنے چند بنیاد سازوں میں ہوگا جو شاعری کا منظر نامہ ہی تبدیل کرتے نظر آتے ہیں کیونکہ شاعری اس کی کومٹ منٹ ہی نہیں مسئلہ بھی ہے ہے جبکہ فی زمانہ شاعری اکثر شعرا کا مسئلہ نہیں بن پا رہی۔

محمد سلیم الرحمٰن نے ایک بار لکھا تھا۔۔۔ظفر اقبال ملاوٹ کا شاعر ہے کہ یہ چیزوں کو چیزوں میں ملا دیتا ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ ہی میں کچھ چیزوں میں سے کچھ چیزیں نکالتا بھی رہتا ہوں۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ نذیر قیصر کا کام اس سے آگے کی سطح کا ہے۔ یہ اپنی شاعری میں نہ صرف چیزوں کے درمیاں نئے رشتے تلاش کرتا ہے بلکہ انہیں نئے رشتوں میں منسلک بھی کرتا ہے۔ یہ مصوری میں استعمال ہونے والے طریق کار ''کولاج'' کی اگلی منزل ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے بطورِ خاص صاحبِ توفیق ہونا بے ضروری ہے۔

نذیر قیصر کا اصل کمال یہ ہے کہ اس ساری ہنرمندی میں وہ شعر کو صحیح معنوں میں شعر بنانے سے کبھی غافل نہیں رہتا اور جہاں تہاں بے مثال خوبصورتی تخلیق کر کے پڑھنے والے کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ نذیر قیصر کے سوا یہ کام اور کوئی نہیں کر رہا۔۔۔اور کہیں نہیں ہو رہا۔۔۔کیونکہ یہ الفاظ کی نہیں بلکہ خود شاعری کی مینا کاری ہے او رجس کے نتیجے میں ایک ایسی تازگی میسر آئی ہے جو اس سے پہلے موجود نہیں تھی، یہ تازہ کاری میرے لئے انتہائی خوشگوار بھی ہے اور بجا طور پر قابل رشک بھی۔
ظفر اقبال

نذیر قیصر کی شاعری میں وہ سبھی کچھ موجود ہے جو نئی شاعری میں ہونا چاہیے تھا اور وہ سب کچھ بھی موجود ہے جو ابھی تک نئی شاعری میں موجود نہیں تھا۔
گوپال متل

نذیر قیصر کی شاعری نئی نئی اور پر اسرار علامتوں کا ایک سیلِ بے پایاں ہے جو پڑھنے والے کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔
اعجاز حسین بٹالوی

نذیر قیصر غیر معمولی شدتِ احساس کا شاعر ہے۔ اس کا کلام پڑھتے ہوئے کبھی کبھی تو یہ خوف دامن گیر ہو جاتا ہے کہ کہیں اِس نوجوان اور ذہین شاعر کے دماغ کی نسیں نہ پھٹ جائیں۔۔۔شدّتِ احساس کے بغیر شاعری بیکار ہے اور جو لوگ اِس شدتِ محرومی کے باوجود شاعر کہلاتے ہیں، وہ شعر کہتے نہیں ہیں، گھڑتے ہیں۔ مگر نذیر قیصر نے اِس شدت کو انتہائی نقطے تک پہنچا دیا ہے۔ یہی اس کی غزل کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ ڈوب کر شعر کہنا اسی کو کہتے ہیں کہ شاعر، اپنے جذبہ و خیال کی نازک سے نازک لہر کو بھی دھڑکتے ہوئے الفاظ میں منتقل کر دے۔ نذیر قیصر، نازک احساسات اور ان کے نازک تر اظہار کا شاعر ہے۔ نزاکت، شدت کا یہ امتزاج اُردو غزل کو روایتی موضوعات کے حصاروں سے نکالنے کے لئے ضروری ہے۔ یوں نذیر قیصر کا جدید تر غزل کے معماروں میں شمار ہونا چاہیے۔

جذبہ و احساس کی اتنی نزاکت اور شدت کے مؤثر اور کامل اظہار کے لئے بعض علامتیں ناگزیر ہو جاتی ہیں مگر علامتوں کا انتخاب بہت کڑا مرحلہ ہے، بہت کم نوجوان شعراء اس مرحلے کو کامیابی سے طے کر پائے ہیں۔ نذیر قیصر کو علامتوں کی تلاش میں بہت تکلّف نہیں کرنا پڑا۔ اس نے ''آنکھوں اور چہروں اور ہاتھوں'' سے وہ سب کام لئے ہیں جو دوسرے نوجوان شعراء غیر مرئی اور غیر زمینی علامتوں سے لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ نذیر قیصر کی یہ علامتیں، صرف زمینی ہی نہیں، انسانی ہیں۔ اس کا ہر قاری ان علامتوں کا باقاعدہ مالک ہے اور انہیں برتتا ہے۔ اِس طرح نذیر قیصر کی یہ علامتیں، علامت نگاری کے موجودہ اندھیرے میں دُھوپ کی حیات بخش چمک کے مترادف ہیں۔ ان علامتوں سے نذیر قیصر نے ایسی مہارت سے کام لیا ہے کہ علامت کی مدد سے موضوع چمک اُٹھتا ہے اور قاری شعر میں علامت سے مرعوب ہونے کی بجائے براہِ راست شعر سے متاثر ہوتا ہے۔ سچے شاعر کا یہی منصب ہے اور نذیر قیصر کو اِس منصب کا مکمل ادراک اور احترام ہے۔
احمد ندیم قاسمی

نذیر قیصر کو ہم جتنا اچھا شاعر سمجھتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ اچھے شاعر ہیں۔
ڈاکٹر جواد احمد

نذیر قیصر شاعری کے میدان میں اچھا خاصا لمبا سفر کر چکے ہیں اور انہیں شاعر کی حیثیت سے داد بھی بہت مل چکی ہیں۔ فیض، راشد سے ناصر کاظمی اور منیر نیازی تک نے نذیر قیصر کو اس انتہا پر جا کر خراج تحسین پیش کیا ہے کہ ہم اگر مبالغہ کے ساتھ بھی اس شاعری کی توصیف کریں تو اس کی کیا قیمت ہوگی؟ وہ جو جیلانی کامران نے کہا ہے کہ نذیر قیصر کی شاعری میں انسان کائنات کی بارگاہ میں خود کو پہلی بار جاگتا ہوا محسوس ہوتا ہے اس کے بعد کچھ بھی کہنے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ بس اتنا کہنا بہت ہوگا کہ نذیر قیصر کی شاعری کتنی سیدھی سچی شاعری ہے۔ بیان سادہ مگر کتنا موثر ہے۔ ایک نئے پن کا احساس۔ کسی بچے کی آنکھوں جیسا جو کائنات کو پہلی بار حیرت سے دیکھ رہی ہوں۔

انتظار حسین

نذیر قیصر کی شاعری پڑھ کر آدمی ایک خوشگوار حیرت سے ہم کنار ہوتا ہے۔

احمد فراز

نذیر قیصر کتابی شاعر نہیں، اس کی شاعری کے ماخذ فطرت کی کھلی کتاب میں بکھرے پڑے ہیں۔ وہ پرندوں کی طرح آسمانوں اور زمینوں کے درمیان محبت کی سفارت کاری کرتا ہے۔

ناصر کاظمی

نذیر قیصر کی شاعری ایک ایسے خیال کی نشاندہی کرتی ہے جو اس وقت خوف و ہلاکت کے اندیشوں میں گرفتار دنیا کے سامنے، ایک نئے خوبصورت اور دہکتے ہوئے چاند کی طرح طلوع ہو رہا ہے اس سراسیمہ دنیا کو ایک شہرِ طلسمات بنا دینے کے لیے۔

منیر نیازی

نذیر قیصر کی شاعری مختلف ہے۔ کچھ زیادہ مختلف وہ اس لیے کہ اس کی شخصیت ہی مختلف ہے بہت ہی مختلف نذیر قیصر کی ہستی محبت میں گندھی ہوئی ہے بے ریا وسیع النظر اعلیٰ ظرف ریشم دکھائی دیتا ہے مگر اپنے باطن میں فولاد کی طرح صیقل۔ فیض، ندیم، راشد، اشفاق احمد سے لے کر نئی نسل تک سب اس کے معترف اور مداح ہیں وہ اس کھردرے معاشرے میں اپنی شخصیت کی طرح ریشم سے مصرعے بُنتا ہوا اکیلا شاعر ہے۔

ہارون الرشید

نذیر قیصر ہمارے عہد کا سب سے خوبصورت سخن ور ہے اور میری ادبی محبتوں میں اس کا نام سرِ فہرست ہے۔ ایسا خوبصورت شاعر اور دوسرا کوئی ہے ہی نہیں۔ نذیر قیصر کی خوشبو میں بھیگی ہوئی شاعری بارش میں شعلے کی مانند ہے۔ اگر شاعری انسانی شکل اختیار کرتی تو وہ نذیر قیصر کے پیکر میں مجسم ہوتی۔

حسن نثار

نذیر قیصر سراپا عشق ہے اور میں اس کے عاشقوں میں سے ہوں۔

اشفاق احمد

نذیر قیصر شہرِ سخن کا وہ بنجارہ ہے جس کے پاس ہمیشہ نئی نئی سوغاتیں ہوتی ہیں۔

بانو قدسیہ

ناصر کاظمی اور منیر نیازی کے بعد غزل کو آشوب سے بچانے والوں میں نذیر قیصر کا نام بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ سمندر، آنکھیں، ہوا، دیوار اور پرندے اس نسل کے استعارے تھے۔ مانوس الفاظ جب نامانوس اور ان کا متشکلہ نامعلوم دے تو یہ الفاظ انسانی تجربے کی تلاش میں تخلیقی بازگشت بن جاتے ہیں۔

نذیر قیصر داخلی اور باطنی تجربے کا شاعر نہیں ہے۔ اس کو تو ہوا بھی زنجیر نظر آتی ہے اور دھول، غبار عبرت کی طرح اس کی آنکھوں کے منظر نامے کو قریۂ حرف کی بربادی کی تحریر بناتی جا رہی ہے۔ زندگی کا مسلسل نوحہ نذیر قیصر کی غزل کا زاویہ ہے مگر یہ نوحہ خود شکنی اور خود اذیتی کا شاخسانہ نہیں۔ لغت نے ایک دفعہ پھر پلٹا کھایا ہے۔ علم، تیغ، سر بریدگی، سلاسل، قید اور لہو۔ مرثیوں کے دائرے سے نکل کر غزل کا لاحقہ بن گئے ہیں۔ نئے پن کے اس دور میں نذیر قیصر کی آواز اپنے ماحول سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔

آواز کا یہ اختلاف اس لئے نہیں ہے کہ نذیر قیصر نئے نئے سمبل گھڑنے کے درپے ہے بلکہ اس لئے کہ وہ خود شناسائی کے مرحلے طے کرنے کے لئے اپنے اردگرد کے ماحول کا مطالعہ کرتا ہے اور اس مطالعے سے وہ جاندار اصطلاحیں، جاندار اشارے اور زندگی سے قریب تر ہونے کا رشتہ تلاش کرتا ہے۔

نذیر قیصر نے اپنے مسائل اور اپنی نسل کی نمائندگی کے لئے زیادہ تر غزل کو پیرایۂ اظہار بنایا ہے مگر نذیر قیصر میں بھی اک نئے جہانِ معنی کا منظر نامہ ہیں۔ غزل میں جہاں اس نے اپنی ذاتی الجھنوں اور سوچوں کو آفاقیت کا رنگ دینے کے لیے شعری اضافے کئے ہیں وہاں غزل کے دامن کو نئے اور زندہ فکر و احساس کی ایک نئی منفرد نزاکت اور توانائی سے بھی بھر دیا ہے۔

نذیر قیصر زمین کے جاگنے کا منتظر ہے۔۔۔ اور زمین ایک دِن ضرور جاگے گی۔

کشور ناہید

نذیر قیصر نے جو شعری جہان آباد کیا ہے اس سے سرسری نہیں گزرا جا سکتا اس شعری جہان سے سانس روک کر ٹھہر ٹھہر کر گزرنا پڑتا ہے کہ ایں جہان دیگر است۔

شہریار

نذیر قیصر کی شاعری رومان اور انقلاب کی آگ میں کھلتے ہوئے پھولوں جیسی ہے نذیر قیصر میرے قبیلے کا ایک سچا اور بہادر شاعر ہے۔

حبیب جالب

اردو شاعری کی تاریخ میں نذیر قیصر جیسے خوبصورت شاعر ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ نذیر قیصر، رابندر ناتھ ٹیگور اور فیض صاحب کے رُتبے کے شاعر ہیں۔ پرائڈ آف پرفارمنس تو کیا اگر میں نوبیل پرائز کی کمیٹی میں ہوتی تو

نذیر قیصر کو نوبیل پرائز کا حقدار قرار دیتی۔ نذیر قیصر کی شاعری میں جو حیرت اور طلسمی فضا ہے وہ اور کہیں نہیں۔

عرفانہ عزیز

نذیر قیصر کی شاعری ٹیگور کی طرح گہری اور پراسرار ہے اس جھیل کی طرح جس کی دھند میں کنول کے پھول جھلملاتے ہیں۔

کرسٹین راجر

نذیر قیصر جیسی شخصیات صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسی خوبصورت اور تخلیقی شخصیات کی حفاظت کرنی چاہیے۔

شفیق احمد فاروقی

بڑا شاعر ہونا بڑی بات ہے مگر بڑے شاعر کے ساتھ بڑا انسان ہونا اس سے بھی بڑی بات ہے۔ میں نے زندگی میں تین بڑے شاعر دیکھے ہیں جو بڑے انسان بھی ہیں ایک فیض احمد فیض، دوسرے جگر مرادآبادی اور تیسرے نذیر قیصر صاحب۔

ظہیر احمد تاشی

نذیر قیصر کی شاعری بہشت میں دیکھے ہوئے کسی خواب جیسی ہے جس میں آدمی جاگتا رہتا ہے۔ میں اور میری نسل نے جب شاعری کا آغاز کیا اس دور میں نذیر قیصر آنکھیں، چہرہ، ہاتھ (۱۹۶۹)، زیتون دی پتی (۱۹۷۵) کی صورت میں ایک رول ماڈل بن چکے تھے۔ آنکھیں، چہرہ، ہاتھ کے دیباچے میں جیلانی کامران نے لکھا تھا۔ نذیر قیصر کی شاعری میں تجربے کا جمود ٹوٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نذیر قیصر کی شاعری میں انسان کائنات کی بارگاہ میں خود کو پہلی بار جاگتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ میٹھے دھیمے لہجے میں سیدھی سچی باتیں کرتا نذیر قیصر اگر صرف باتیں ہی کرتا تو وہ کوئی مسیحا ہوتا اور اگر بکریاں چراتا تو انہیں کبھی بکریاں نہ رہنے دیتا بلکہ اپنی باتوں سے انہیں بھی جیتے جاگتے انسان بنا دیتا۔ امرتا پریتم کی آنکھوں سے دیکھو تو نذیر قیصر ہونٹوں سے بانسری لگائے آنکھیں میچے کرشن دکھائی دیتا ہے لیکن مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ نذیر قیصر کسی اور آسمان کا پرندہ ہے جو ہماری بارود بچھی دھرتی کی آگ بجھانے اپنی چونچ میں آنسوؤں سے بھری زیتون کی پتی لے کر اتر آیا ہے۔ یہ کسی اور دھرتی کا پانی تھا جو ہماری پیاسی دھرتی کے پیالے میں انڈیل دیا گیا ہے۔ خوبصورت اور اعلیٰ شاعری کرنے کے لئے پہلے محبت کرنا سیکھنا پڑتا ہے اور محبت سیکھنے کے لئے نذیر قیصر کی شاعری پڑھنی پڑتی ہے۔

انجم سلیمی

چاندنی خوشبو رنگ روشنی خوبصورتی انسان دوستی، امید اور جمالیات مل کر نذیر قیصر کی شاعری کا ایک خاص رنگ بناتے ہیں یہ بات صرف ان کی شاعری تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ سب رنگ نذیر قیصر کی شخصیت میں جھلملاتے ہیں ان کا کوئی بھی ملنے والا یا دوست آنکھیں بند کر کے ان کے بارے میں سوچے تو تصور میں ان کا مسکراتا ہوا چہرہ ہی آئے گا یہ نذیر قیصر کے اندر کی سچائی ہے جس کے کارن وہ ہر طرح کا خیال اپنی شاعری میں بڑی سادگی، سہولت اور خوبصورتی کے ساتھ تصویر کر دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کیا لکھنا ہے؟ اور کس کے لیے لکھنا ہے؟

نصیر احمد

ہم خوش نصیب ہیں کہ نذیر قیصر کے عہد میں زندہ ہیں یہ خوش نصیبی اس لیے بھی ہے کہ ہم انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے بھی ہیں اور ان کی زبان سے ان کی شاعری سنتے ہیں یقین جانیے کہ اس وقت شاعری کی دنیا میں نذیر قیصر سے بڑا دوسرا اور کوئی شاعر موجود نہیں اور ہم لاہور والے تو اور بھی خوش قسمت ہیں کہ ہمیں ان کی رفاقتیں بھی میسر ہیں۔

عرفان صادق

نذیر قیصر کی جادوئی شخصیت ہمارے لیے ہمیشہ سے مشعل راہ رہی ہے۔ ان کی نئی شاعری آج کے عہد کا صحیفہ ہے۔

سرفراز تبسم

آنکھیں، چہرہ، ہاتھ میری پسندیدہ کتاب ہے جو میرے سرہانے پڑی رہتی ہے۔ نرم گفتار اور محبت کرنا میں نے نذیر قیصر سے سیکھا ہے۔

پروین شاکر

نذیر قیصر نے تین نسلوں کی آبیاری کی ہے۔ میں لاہور داتا صاحب اور نذیر قیصر سے ملنے جاتا ہوں۔

ثروت حسین

ہماری نسل نے نذیر قیصر کو پڑھ کر لکھنا سیکھا ہے۔

اکبر معصوم

نذیر قیصر کی شاعری پڑھ اور سن کر سحر طاری ہو جاتا ہے۔

مظہر الاسلام

نذیر قیصر کی شاعری پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے کسی نے پھول پیش کیے ہوں۔

ڈاکٹر خلیق الرحمٰن

نذیر قیصر میرے محبوب شاعر ہیں۔

رفیق سندیلوی

نذیر قیصر ہر عہد کے محبوب شاعر ہیں۔

ڈاکٹر ناصر بلوچ

میرے مطابق نذیر قیصر ہمارے عہد کے سب سے اچھے شاعر ہیں۔

اقتدار جاوید

میں بہت خوش قسمت ہوں کہ میں نذیر قیصر کے عہد میں پیدا ہوا۔

اشفاق احمد کاشف

نذیر قیصر کی شاعری میں کوئی طلسم ہے جسے محسوس کیا جا سکتا ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا ہے۔

جمال احسانی

نذیر قیصر میرے لیے سراپا محبت ہیں اور ان کی شاعری بھی محبت سے

چھلکتا ہوا پیالہ ہے۔

طاہر بلوچ

نئی شاعری میں نذیر قیصر کا اپنا ایک منظر نامہ ہے جو دیکھنے والے کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔اس منظر نامے میں نذیر قیصر نے حرف وخیال کے وہ چراغ روشن کیے ہیں جن کی روشنی نہ صرف ہمیشہ قائم رہے گی بلکہ اس روشنی سے آنے والی نسلوں کے چراغ بھی روشن ہوں گے۔

جمشید مسرور

''آنکھیں، چہرہ، ہاتھ'' سے ''محبت میرا موسم ہے'' تک نذیر قیصر کا شعری سفر نامہ شاعری کا ایک نیا عہد نامہ ہے نئی زندگی طرح جس میں نئی نئی حیرتیں جنم لیتی ہیں۔

ساجد سراج

نذیر قیصر لیونگ لیجنڈ شاعر ہیں۔

مریم تراب

نذیر قیصر سے مل کر اُسے دیکھ کر اور سن کر ایک عجیب مسرت ہوتی ہے جیسے ہلکی بارش میں دھوپ نکل آئی ہو۔

بیگم سرفراز

جتنی دیر ہم نذیر قیصر کے ساتھ بیٹھتے ہیں ہمیں لگتا ہے کہ ہم عبادت میں ہیں۔

فادر سہیل پیٹرک

نذیر قیصر ایشیا کے وین گارڈ شاعر ہیں۔

قاضی جاوید

نذیر قیصر ایک سچے درویش ہیں ان کی صحبت میں بیٹھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی گھنے برگد کی پُرسکون چھاؤں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

زوبیہ انور

نذیر قیصر پنجابی اور اردو کے بے مثال شاعر ہیں انہوں نے اپنا راستہ الگ تراشا ہے اور آج نئی نسل کے بہت سے نمائندہ شاعران کے راستے پر چلتے دکھائی دیتے ہیں۔

آصف عمران

نذیر قیصر، تمہیں تمہارا جنم دن مبارک۔آج بہت لوگ تمہارا یہ دن منائیں گے، مبارک باد بھیجیں گے اور کہیں گے مبارک ہو جس نے اپنے حرفوں سے ہمیں سانس لینا سکھایا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ، ہواؤں کی سرسراہٹ، اپنے خیالوں میں گم خاموش بہتی ندی اور اس میں گرتے ہوئے پتے کا شور، وہ جنگلی پھولوں کے رنگ اور چمکیلا موسم، خوشبوؤں کی بہار اور مہندی لگے ہاتھوں میں تتلیاں سجائے، دیوانہ وار محبوب کو ڈھونڈتی ہوئی محبوبہ۔۔۔اور ایسی اَن گنت تصویریں بنا بنا کر ہمارے دل ودماغ پر نقش کر دیں، ہمیں گہرے طور پر حسّاس بنا دیا۔ ہمارے دلوں کو درد محسوس کرنے کا سلیقہ دیا۔ پیار دینا سکھایا (کرتے تو سبھی ہیں) پیار دینا ایک الگ ہی رویہ ہے۔ جی تو چاہتا ہے لکھتا چلا جاؤں کیا کروں۔ پھر کیا ہے، پیار دینا تو تم سے سیکھ ہی لیا نا۔ ہاں، خدا تمہیں ایک طویل عمر عطا کرے۔تمہارے دل ودماغ کو اسی طرح تروتازہ رکھے، کائنات اور اس میں موجود ہر شے سے تمہارے رشتے مضبوط رکھے۔اور آسودہ حال اور خوش رہو۔

ہریش میسی

نذیر قیصر صاحب ہمارے عہد کے وہ خوبصورت شاعر ہیں جنہوں نے ہمیں انسانوں سے پیار کرنے کا درس دیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے ہمیں پرندوں سے محبت کرنا سکھایا۔ درختوں سے باتیں کرنی سکھائیں۔ وہ ہمیں آج سے سو سال پیچھے بھی لے جاتے ہیں اور مستقبل کے سہانے خواب بھی دکھاتے ہیں یہاں تک کہ حال میں رہ کر جینے کا حوصلہ بھی دیتے ہیں۔اُن کی شاعری میں غیر معمولی شدت کا جو احساس ہے پڑھنے والا خود کو اُسی قالب میں ڈھال کر اس درد کو اس محبت کو اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے اور یہ صلاحیت ہمارے عہد کے دور میں کسی اور شاعر میں نہیں۔

اُن کی شاعری زمان ومکان کی پابند نہیں ہے۔ وہ ایک فطری بہادر اور نڈر شاعر ہونے کے ساتھ بہت اچھے انسان بھی ہیں۔اُن کی شاعری ہمارے لیے جلتی تپتی دھوپ میں ایک ٹھنڈے ہوا کے جھونکے کی مانند ہے۔

فہیمہ خالد

- مہر -

بھارتی ریاست کیرالہ میں دلہن نے اس وقت سب کو حیرت زدہ کر دیا جب اس نے اپنے ہونے والے خاوند سے مہر میں نقدی، جائیداد، زیورات کی بجائے ایک سو کتابیں مانگ لیں۔اعجاز حکیم اور اجنا نظام کا نکاح اکتوبر میں ہوا تھا۔اعجاز نے دلہن کی فراہم کردہ فہرست کے مطابق کتابیں حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی تاہم وہ شادی کی رات تک ننانوے کتابیں ہی اکٹھی کر پایا۔سویں کتاب ''بھارت کا آئین'' جلد فراہم کرنے کا وعدہ کر لیا۔دلہن کی فرمائش کردہ کتابوں میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں۔قرآن، بائبل، گیتا کے علاوہ خالد حسینی اور موراکامی کے ناول کے ساتھ سابق امریکی خاتونِ اوّل مشیل اوباما کی آپ بیتی بھی نمایاں ہے۔

☆

" دردکادرماں "

حمدِ باری تعالیٰ

اِلتجائے امتِ احمدؐ سن، اے ربِّ کریم!
یا سمیعُ، یا بصیرُ، یا خبیرُ یا علیم!

رشتۂ امید بھی اب ہاتھ سے جانے لگا
یا لطیفُ یا عزیزُ، یا مقیتُ، یا عظیم!

اب ہماری راکھ سے پیدا ہو اک تازہ جہاں
یا بدیعُ، یا معیدُ و مُبدی و حیّ و رحیم!

زندگی ہو، روشنی، آسودگی اور امن ہو
یا رؤفُ، یا ودودُ، یا ولیُّ، یا حلیم!

راستے کھل جائیں گم گشتہ خلائق پر تمام
یا وکیل و قادرُ، یا ذوالجلال یا کریم!

درد کا درماں ملے، انسانیت پائے شفا
یا حسیبُ، یا حفیظُ و یا سلامُ، یا حکیم!

نجیبہ عارف (اسلام آباد)

نعت رسولِ مقبولؐ

نعت جب اُنؐ کی شان میں لکھنا
خوشبوؤں کی زبان میں لکھنا

سایۂ مہربان میں لکھنا
خود کو اُنؐ کی امان میں لکھنا

وجہِ تخلیقِ کائنات ہیں وہ ﷺ
مِدحتوں کے بیان میں لکھنا

حالِ دِل اُنؐ سے عرض کرتے ہوئے
لُکنتیں ہیں زبان میں، لکھنا

اب مدینے کا آ گیا ساحل !
اب ہَوا بادبان میں لکھنا

نعت لکھنے کا جب خیال آئے
لا کر اُنؐ کو ہی دھیان میں لکھنا

رفعتیں ساری اُنؐ سے ہیں منسوب
نام وہؐ آسمان میں لکھنا

نسیم سحر (راولپنڈی)

روشنی کا تعاقب

رضیہ اسماعیل
(دبئی)

''میں یہ سوچ کر اکثر اداس ہو جاتی ہوں کہ اگر مکانوں میں کھڑکیاں نہ ہوتیں تو پھر کیا ہوتا؟''

''دروازے تو خیر دروازے ہیں، ان کی افادیت تو سب ہی جانتے ہیں مگر کھڑکیاں.....کبھی ان کی افادیت پر بھی ہم نے سنجیدگی سے غور کیا ہے؟'' میں خود ہی سوال اور خود ہی جواب بن جاتی۔

اپنے کمرے کی بڑی سی کھڑکی کے پٹ تھامے میں کافی دیر سے کھڑی تھی۔ پھر اچانک کچھ سوچ کر میں مسکرا اٹھی۔ مجھے لگا اس مسکراہٹ نے میرے اندر بہت سی کھڑکیاں کھول دی ہیں۔ ذہن کی کھڑکیاں، دل کی کھڑکیاں، روح کی کھڑکیاں.....

''کیا روح کی بھی کھڑکیاں ہوتی ہیں؟'' میرے اندر سے سوال گونجا۔

''ہاں، ہوتی ہیں مگر یہ اتنی آسانی سے نہیں کھلتیں۔'' اندر سے ہی جواب آیا۔

''مگر کیوں؟'' سوال میرے لبوں تک آتے آتے رہ گیا۔ مگر میرے اَن کہے سوال کے جواب میں ہی دل بول اٹھا۔

''یہ فنا قبل از فنا والا معاملہ ہے یعنی موت سے پہلے مر جانا، اپنی ذات کی مکمل نفی۔''

''مگر ذات کی نفی اتنی آسان نہیں ہوتی۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں، اگر کوئی دوسرا آپ کی ذات کی نفی کرے تو یہ تکلیف دہ عمل ہو سکتا ہے لیکن جب آپ خود ہی اپنی ذات کی نفی کرتے ہیں تو یہ مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔'' دل نے جواب دیا۔

''یہ فہم وادراک کی کون سی منزل ہوتی ہے؟'' میں نے پھر سوال کر دیا۔

''جب آدمی کو یہ پتا چل جائے کہ وقت کی تختی پر اس کی اہمیت ایک نقطے سے زیادہ نہیں ہے، اس کے ہونے یا نہ ہونے سے ذرہ برابر بھی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔'' اندر سے مدلّل جواب سن کر میں نے کچھ سوچتے ہوئے کھڑکی کے پٹ پوری طرح کھول دیئے۔

باہر سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی زندگی اپنی تمام تر خباثتوں کے ہمراہ ایک زوردار انگڑائی لے کر بیدار ہو چکی تھی۔

پڑوس میں رہنے والا دوہاجو رحیمو جولاہا اپنی نئی نکور بیوی کو بلا وجہ ہی منہ بھر بھر کر گالیاں دے رہا تھا۔ وہ ذرا چوں چراں کرتی تو اُسے مارنے کو دوڑتا۔

رحیمو کی ننگی ننگی گالیاں سن کر گلی میں ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر پڑے، دن رات کھوں کھوں کرتے، اللہ وسائے موچی نے حقے کی نَے پرے کر کے بلغم زدہ گلے سے رحیمو کو سمجھانا شروع کر دیا۔

''اوئے، رحیمو! اگر اس بے چاری پر جوانی ٹوٹ کر آئی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ اب دن رات گالیاں دینے سے اس کی جوانی کا منہ زور دریا تو اترنے سے رہا۔ پکی عمر میں سہرا باندھ کر گھوڑی پر بیٹھنا تو آسان ہے مگر گھوڑی کو قابو میں رکھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔''

رحیمو کے پاس اللہ وسائے موچی کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا اور شاید اللہ وسایا اس سے کسی جواب کی توقع بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے دوبارہ زور شور سے حقہ گڑگڑانا شروع کر دیا۔

کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ کر مجھے فرانز کافکا کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ ''دنیا کتنی دل چسپ جگہ ہے؟ اس بات کا اندازہ کرنا ہو تو مٹھی بھر دنیا اپنی آنکھوں کے نزدیک لا کر غور سے دیکھو۔''

''میں بھی مٹھی بھر دنیا کو اپنی آنکھوں کے بہت نزدیک لا کر دیکھوں گی۔'' میں نے ایک عزم سے کہا۔

اگرچہ مجھے اس بات کا ادراک تھا کہ بے حد نزدیک سے مشاہدہ کرنے والی دنیا کی نزاکتیں سوچ کی اور بہت سی کھڑکیاں کھول دیں گی۔

مگر میں نے اس مشاہدے سے حاصل ہونے والی لذت کے خیال سے سرشار ہو کر کچھ اور انہماک سے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

میرے علم میں یہ بات تو تھی کہ رحیمو کی پہلی بیوی رحمتے چند مہینے قبل اسے ایک لمبی رفاقت کے بعد دائمی جدائی کا داغ دے کر جا چکی تھی اور اب رحیمو کو بیوی کی یاد میں دن رات آنسو بہاتے دیکھ کر سب ہی پریشان ہو رہے تھے۔ رحیمو کو غم کی کھاٹ سے کسی طرح بھی اترتے نہ دیکھ کر اس کے بھائی نے اسے دوسری شادی کا مشورہ دے ڈالا۔

''آخر بندہ ہی بندے کا دارو ہوتا ہے۔ زنانی کی موت پر اتنا لمبا سوگ مناتے تو ہم نے کسی کو نہیں دیکھا، تو کوئی بڈھا تو نہیں ہو گیا رحیمے! ہڈ پیر سلامت ہیں۔ اچھی کاٹھی ہے، مرد ذات کا کیا ہے، وہ تو ہمیشہ جوان ہی رہتا ہے۔''

رحیمو کے بھائی سلطان نے اسے دوسری شادی کے لئے قائل کرنے کے لئے دلائل دینے شروع کر دیئے۔

سلطان کی بات سن کر رحیمو کچھ روز گومگو کا شکار رہا مگر پھر دوسری شادی کے خیال نے اس کے دل میں گدگدی کرنی شروع کر دی۔ بغیر سوچے سمجھے ہی اس نے اپنے سے عمر میں کئی گنا چھوٹی لڑکی سے شادی کے لئے رضامندی ظاہر کر دی۔ رحیمو کی اس ناسمجھی کا خمیازہ اب رحیمو کے ساتھ ساتھ سب محلے والے بھگت رہے تھے۔

یک لخت سوچ کی ایک ننھی سی کھڑکی میرے ذہن میں کھل گئی، ''بھلا رحیمو کو اس عمر میں نئی سیج سجانے کی کیا ضرورت تھی؟ رحمتے کے ساتھ اس کی ایک لمبی رفاقت کی سانجھ تھی۔ ازدواجی زندگی میں اگر چند سال بھی سکھ کے نصیب ہو جائیں تو بڑی بات ہے۔ باقی ماندہ زندگی بھی انہی چند سالوں کے سہارے بُری بھلی گزر ہی جاتی ہے، مگر رحیمو نے تو اوکھلی میں سر دے دیا ہے، اب موصلے تو پڑنے لازمی ہیں۔''

''میں تو کہتی ہوں رحمتے کی بجائے رحیمو کو مر جانا چاہیے تھا۔ کم از کم اڑوس پڑوس والوں کی زندگیاں تو اجیرن نہ ہوتیں۔ رحمتے کا کیا تھا، صابر شاکر عورت تھی۔ اس بڑھاپے میں اُسے کہاں دوسرا خصم کرنے جانا تھا، یہ حق تو صرف مردوں کی رکھیل ہے۔'' ایک دن ماسی برکتے روز روز کی جوتم پیزار سے تنگ آ کر غصے سے پھٹ پڑی۔

رحیمو کا تماشا ذرا ختم ہوتا تو ماسٹر دل محمد ڈگڈگی بجانی شروع کر دیتا۔ دن رات بے چاری ماسٹرنی کو گھرکیاں دیتا رہتا۔ ماسٹرنی غریب گھر کی دبو قسم کی عورت تھی۔ ماسٹر کی زیادتیوں پر زبان کھولتے ہوئے ڈرتی تھی کہ کہیں تین کا پہاڑا پڑھ کر ماسٹر اس سے ہمیشہ کے لئے ہی نہ جان چھڑا لے۔

ماسٹر پرلے درجے کا کنجوس آدمی تھا۔ سکول جاتے ہوئے باورچی خانے کو تالا لگا کر جاتا، کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ ماسٹر کی کمائی سے ماسٹرنی اپنے غریب رشتے داروں کو کھلاتی پلاتی رہتی تھی۔ اسی پر بس نہیں، ماسٹر گھر کے دروازے پر بھی بڑا سا تالا لگا دیتا تھا۔ ماسٹرنی سارا دن کھڑکی میں لٹکی گلی میں آنے جانے والوں کو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتی۔ آنکھوں میں اترنے والی رم جھم کو اپنے میلے سے دوپٹے کے پلو میں جذب کرنے کی ناکام کوشش اس کے دکھ کی مزید تشہیر کر دیتی۔

کھڑکی نے سرگوشی کی ''ماسٹرنی غریب گھر سے ضرور ہے مگر شریف عورت ہے۔ کوئی اور عورت ہوتی تو ان حالات میں نہ جانے کیا کر گزرتی مگر ماسٹر کی ڈگڈگی ہے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔'' میں نے کھڑکی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مگر جیسے ہی نگاہ پلٹی، سارا منظر ریت کی طرح جھر جھر کر کے کہیں دور نکل گیا۔

میں نے ایک اور مٹھی بھر دنیا ذرا آنکھوں کے قریب لا کر دیکھنا چاہی تو گلی میں مجھے اوباش فیقا سر منہ سنوار کر ادھر ادھر تا کا جھانکی کرتا نظر آیا۔

اس تنگ سی گلی سے گزرنے والی نوجوان لڑکیوں پر گھٹیا قسم کے عاشقانہ فقرے اچھالنا اس کی عادت تھی۔ ایسے میں اگر کوئی جی دار قسم کی لڑکی پلٹ کر فیقے کو جواب دے دیتی تو فیقے کا حرامی پن سوا ہو جاتا۔ بڑی بے شرمی سے ایک آنکھ میچ کر دل پر ہاتھ رکھ کر کہتا، ''بسم اللہ، آ ؤ بادشاہو، تہاڈی اڈِیک سی۔''

فیقے کی بات لڑکی کے تن بدن میں آگ لگا دیتی اور وہ جُز بُز ہو کر مزید کچھ کہے سنے بغیر جلدی جلدی گلی پار کرنے کی کوشش کرتی۔

''کچھ شرم کر فیقے! محلے کی دھی بہنوں کے ساتھ ایسی اوچھی حرکتیں نہیں کرتے۔'' ایک دن تیز طرّار ماسی برکتے نے فیقے کو بری طرح ڈانٹ دیا۔

''اوئے ماسی، تھوک کے حساب سے مجھے یہ بہنیں نہیں چاہیے۔ مجھے کیا ان کا اچار ڈالنا ہے؟ الٹا ان بہنوں کی فوج کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر مجھے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دے گی۔ ناں بھئی، میں کسی کو بہن وہن نہیں بناتا۔ میں تو انھیں ملکہ بنا کر دل کے تخت پر بٹھاؤں گا۔'' وہ بڑے ڈھیٹ پن سے ماسی برکتے کی بزرگی کا بھی لحاظ نہ کرتے ہوئے، ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہتا۔

''دُر فٹے منہ تیرا، شکل چنگی نہ ہو تو بات تو چنگی کر لینی چاہیے۔'' ماسی برکتے کی پھٹکار سن کر فیقا اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر کھی کھی کرنے لگتا۔

کمرے کی کھڑکی ہر روز کھلتی اور بند ہوتی رہی۔ مٹھی بھر زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش میں ہر بار نئی رام کہانی، نئی بپتا، نیا منظر نامہ، نئے کردار، نئے سوال، نئے جواب سامنے آ جاتے۔ گویا سوچوں کی اَن گنت کھڑکیاں کھل کر کبھی دل، کبھی ذہن تو کبھی روح پر دستک دینے لگتیں۔

اس مرتبہ روح کی کھڑکی پر پڑنے والی دستک کی آواز میرے بہت اندر تک اتر رہی تھی۔ اندر اور باہر کے شور نے مل کر جیسے راگ بھاگیہ شری چھیڑ دیا تھا۔ لگتا تھا جیسے کوئی اندر سے دھڑ دھڑ دروازہ پیٹ رہا ہو۔ ایسے میں اپنی ذات کے خول سے اندر باہر ہوتی ہوئی چودھری فضل دین کی اکلوتی لاڈلی بیٹی ریشم میری نظروں کے حصار میں آ گئی۔

میرے گھر سے ملحق چودھری کی بڑی سی حویلی کے پکے صحن میں گم سُم لیٹی ہوئی ریشم کو دیکھ کر چودھری فضل دین کے دل پر آرے چل رہے تھے۔

چودھری دبی دبی آواز میں بڑی فکر مندی سے چودھرائن سے کہہ رہا تھا، ''بڑی وکھری قسم کی لڑکی ہے ریشم۔ نہ بچوں جیسی شرارتیں ہیں، نہ فرمائشیں، نہ سکھیوں سہیلیوں سے تو تکار، نہ گڈی گڈے کا بیاہ، نہ لڑائی نہ جھگڑا، نہ صلح نہ صفائی۔ بس اپنی ہی دنیا میں مگن، گواچی گواچی سی، پتا نہیں ہر وقت کیا ڈھونڈتی رہتی ہے؟''

چودھری کی بات سن کر پاس بیٹھی ہوئی چودھرائن نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا، ''میرے لاکھ پوچھنے پر بھی منہ نہیں کھولتی۔ بس ٹِر ٹِر دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو میں یہ سوچ کر ڈر جاتی ہوں کہ کہیں اس پر کوئی بھوت پریت کا سایہ تو نہیں آ گیا۔ پنڈ کے سائیں بابا کو نہ دکھا دیں۔ کوئی دم درود ہی کر دے گا۔ سنا ہے بڑی کرنی والا بابا ہے۔''

''ہوں'' چودھری کا بے حد مختصر سا جواب سن کر چودھرائن کچھ اور ہی فکر مند ہو گئی۔

چودھرائن کی ممتا کا سمندر زبردست ہلکورے لے لے کر امید و ناامیدی کے ساحلوں کو بھگو رہا تھا۔ چودھرائن کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس طرح وہ اپنی دکھوں کی سولی پر لٹکی ہوئی نازوں پلی اکلوتی اولاد کو مائیکل انجلو کے مجسّمے

''چہارسُو''

Pieta کی طرح ہاتھوں میں احتیاط سے اٹھا کر ایسی لوری سنائے جسے سن کر وہ ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹ آئے۔

''اٹھ میری سوہنی دھی، دن ڈھلنے کو ہے۔'' صحن میں ساری دوپہر تیز دھوپ میں سر سے پاؤں تک سفید چادر اوڑھے چارپائی پر لیٹی ہوئی ریشم کو دیکھ کر چودھرائن نے بھرّائی ہوئی آواز میں ایسے کہا لگتا تھا کہ وہ ابھی رو دے گی۔

صبح سے چودھرائن اُسے کتنی بار تیز دھوپ میں لیٹنے سے منع کر چکی تھی مگر ریشم ٹس سے مس نہ ہو رہی تھی۔

''اٹھ ریشو میری جان۔ سیانے کہتے ہیں جب دو وقت مل رہے ہوں تو لیٹنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ نحوست پھیلتی ہے۔ اٹھ شاباش!'' چودھرائن نے جیسے ہی بیٹی کو ہاتھ پکڑ کر چارپائی سے اٹھانا چاہا وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

''امّاں آپ سب مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ رب نے اگر میرے من کو سوچوں میں ڈال دیا ہے تو میں کیا کروں؟'' ریشم نے قدرے خفگی سے کہا۔

''ناں، دھی رانی! سوچتے تو ہم سب ہی ہیں مگر ہم نے تیری طرح جوگ نہیں لیا۔'' چودھرائن نے بیٹی کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''امّاں میری اور تیری سوچوں میں یہی تو فرق ہے۔ میرا دماغ سو سو سوال کرتا ہے اور تیرا دماغ سو سو جواب مانگتا ہے۔'' بیٹی کے تیز طرّار جملے پر چودھرائن لاجواب سی ہو گئی۔

ریشم کو ہر وقت یہی محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی روح کی کھڑکی پر کسی نے بڑا سا تالا لگا دیا تھا جو ہزار کوشش کے باوجود بھی اس سے کھل نہیں پا رہا تھا۔

ہر سو اندھیرا، گھور اندھیرا تھا۔ ایسے میں اسے انسانوں سے وحشت سی ہونے لگتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ جنگلوں بیابانوں میں نکل جائے جہاں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے رجیو جولا ہے، ماسٹر دل محمد اور فیقے کی آوازیں اسے سنائی نہ دیں۔ جہاں نہ چودھری فضل دین کی فکر مندیاں اس کا پیچھا کریں اور نہ ہی چودھرائن کے سوال اسے سوئی کے نکّے میں سے گزرنے پر مجبور کریں۔ مگر کیسی مجبوری تھی وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی؟

پھر ایک دن مٹھی بھر زندگی ریشم کی آنکھوں کے بھی بہت قریب آ گئی۔

گاؤں کے باہر ایک کھلا میدان تھا جہاں گھنے سایہ دار درختوں کے نیچے اکثر گائیں بھینسیں دن میں لیٹی اور بیٹھی ہوئی جگالی کرتی رہتی تھیں۔ بچے آنکھ مچولی کھیلتے، درختوں کی شاخوں سے جھولے جھولتے اور بہت اونچائی پر بنے پرندوں کے گھونسلوں تک پہنچنے کی ناکام کوشش کرتے۔ مگر جیسے ہی سورج ڈھلتا اور چراغ روشن ہوتے تو میدان بالکل سنسان ہو جاتا تھا۔

اس نے دیکھا کہ شام کے گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے میں وہ اس میدان میں کھڑی تھی.....

میدان کے اُس پار سرسبز کھیتوں کا سلسلہ حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔

ان کھیتوں کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی کئی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں نہر کی طرف نکل جاتی تھیں۔ یہ نہر جیسے جیسے گاؤں کے قریب آتی، اس کا پاٹ چوڑا ہوتا جاتا تھا۔

دن کے وقت ندی پر کافی گہما گہمی رہتی تھی۔ گاؤں والے مویشیوں کو نہلاتے، پانی پلاتے، عورتیں کپڑے دھوتیں، بچوں کو نہلاتیں اور خود بھی ادھ ننگی سی نہانے کے لئے پانی میں اتر جاتیں۔

ذرا فاصلے پر بنے ہوئے ندی کے پُل پر سے نوجوان لڑکے نہر میں چھلانگیں لگاتے اور نہر کے ٹھنڈے ٹھار پانی میں اگر کبھی تربوز تیرتے ہوئے آ جاتے تو وہ انھیں پکڑنے کے لئے جھپٹ پڑتے۔ سخت گرمی کے موسم میں گویا یہاں ایک دنیا آباد رہتی تھی مگر اس وقت یہاں مکمل خاموشی تھی۔

شام کے گہرے ہوتے ہوئے سایوں میں کھلے میدان کو پار کر کے آہستہ آہستہ کھیتوں کے بیچوں بیچ بنی ہوئی پگڈنڈی سے گزر کر وہ نہر کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں کنارے پر اسے ایک چمکیلی روشنی نظر آ رہی تھی۔ لیکن جیسے جیسے وہ نہر کے قریب ہو رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ وہ روشنی اُس سے دور ہٹتی جا رہی تھی۔ مگر اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور آہستہ آہستہ روشنی کی طرف بڑھتی رہی۔

نہر کے کنارے پر جا کر وہ بے حد مایوس ہو گئی، کیوں کہ وہی روشنی اب نہر کے دوسرے کنارے پر چمک رہی تھی۔

ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ وہ نہر میں چھلانگ لگا کر دوسرے کنارے تک چلی جائے مگر نہر کا پاٹ کافی چوڑا تھا اور اسے ٹھیک سے تیرنا بھی نہیں آتا تھا۔ اس بے بسی کی کیفیت میں وہ کتنی ہی دیر چپ چاپ نہر کے کنارے کھڑی ہو کر اُس پار چمکتی ہوئی روشنی کو دیکھتی رہی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسی سلفے کی لاٹ تھی جو اس ویرانے میں چمک رہی تھی۔ چاروں طرف آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پھر یہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی؟ کیسی تھی یہ روشنی جو باہیں کھولیں اسے اپنی طرف بلا رہی تھی؟

روشنی کے مجنونانہ تعاقب میں اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ اندھیرا بہت گہرا ہو گیا تھا۔ اب وہاں اس کے علاوہ کوئی ذی روح نہ تھا۔ گھر واپس جانے کے خیال سے وہ جیسے ہی پلٹی، اپنے پیچھے کھڑے ایک سائے کو دیکھ کر خوف سے اس کی چیخ نکل گئی۔

اندھیرے میں اُسے ٹھیک سے کوئی چہرہ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ سایہ اس سے مخاطب ہوا، گاؤں کے سائیں بابا کی آواز پہچان کر اس کی جان میں جان آ گئی۔

''روشنی کا پیچھا کر رہی تھی پتر؟'' بابا نے نرمی سے سوال کیا۔

''ہاں بابا'' وہ جلدی سے بولی۔

''روشنی کا پیچھا کرو گی تو یہ تم سے اور دور ہو جائے گی۔'' بابا نے کہا۔

''وہ کیوں بابا؟'' اس نے حیرانی سے سوال کیا۔

''اس لئے کہ ہم لوگ اپنے اندر کی روشنی کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور

روشنی کو ہماری یہ بے گانگی بالکل پسند نہیں ہے۔اس لئے جب باہر نظر آنے والی روشنی کا تعاقب کروتو وہ ہم سے اجنبیوں کی طرح دور ہٹتی چلی جاتی ہے۔'' بابا نے بڑے صوفیانہ لہجے میں جواب دیا۔

''بابا! کیا روشنی ہمارے اندر موجود ہے؟'' اس نے تجسس سے سوال کیا۔

''ہاں پتر، یہ روشنی ازل سے ہر انسان کو ودیعت کی گئی ہے۔یہ دل تو سوہنے رب کا گھر ہے، اس کے نور سے روشن ہے مگر بدقسمتی سے ہمیں اس کا ادراک نہیں ہے۔ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'' خَلَقَ اللهُ الْخَلق فی ظُلُمٰتٍ ثُمَّ القرا عَلَيْهِ نُوْراً.....''

یعنی کہ اللہ رب العزت نے خلقت کو اندھیرے میں پیدا کیا مگر اس پر اپنے نور کا پرتو ڈال کر اسے روشن کر دیا۔

وہ بہت غور سے بابا کی باتیں سن رہی تھی۔

''ہم دنیا دار کمینے اپنی ناعاقبت اندیشی سے نور کے چراغوں کو بجھا دیتے ہیں۔ پھر بجھے ہوئے دیوے لے کر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔اپنی بدنصیبیوں اور اپنی بدبختیوں کے شکوے شکایتیں کرتے ہیں۔'' بابا نے قدرے جلال سے اونچی آواز میں کہا۔

''بابا نور کے چراغ کیسے بجھ جاتے ہیں؟ پُتر بندہ ستر ہزار پرتوں سے بنا ہے اپنے رب کے حکم سے جب وہ عالمِ ارواح سے عالمِ ناسوت یعنی اس دنیا میں آتا ہے تو اُس کے اوپر ایک پرت غالب آ جاتا ہے جس میں جلد بازی، سرکشی، بغاوت، حکم عدولی، ناشکری، بے یقینی اور وسوسوں کا ہجوم ہوتا ہے اور یہی وہ دنیا کی زندگی ہے جسے قرآن نے اسفل السافلین کہا ہے۔''

سائیں بابا اپنی روانی میں بہتا چلا جا رہا تھا۔

''کیا یہ روشنی میرے اندر بھی موجود ہے؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں پُتر! یہ روشنی تو سب کے اندر موجود ہوتی ہے۔تمھارے اندر بھی ہے۔'' بابا نے نرمی سے جواب دیا۔

''تو کیا یہ رحیمو جولاہے، ماسٹر دل محمد اور فیقے کے اندر بھی ہے؟'' اس نے اپنی بے یقینی کو یقین کا چولا پہنانے کے لئے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

ہاں، پُتر! یہ تو سوہنے رب کا نور ہے جو ہر دل کے اندر موجود ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہر دل کی طاق پر نور کا ایک چراغ رکھ دیا گیا ہے۔اب یہ ہم پر ہے کہ ہم اس چراغ کو اپنے عمل سے روشن رکھیں یا اپنی بداعمالیوں سے اسے بجھا دیں۔'' بابا کی باتیں سن کر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''پُتر! زیادہ مت سوچو، بس اپنے اندر جھانکو، بجھا ہوا چراغ نگاہوں کی تپش سے خود بخود جل اٹھے گا۔ہر طرف چانن ہی چانن ہو جائے گا۔روشنی کا تعاقب کرنے کی بجائے اپنے اندر کی روشنی کو تلاش کرو۔اسے پہچانو، اس سے دوستی کرو، اس سے ہاتھ ملاؤ، یہ تمھاری اپنی روشنی ہے۔اس سچے رب کا نور ہے جو ہماری سوچ سے بھی زیادہ ہر وقت ہمارے قریب رہتا ہے'' اتنا کہہ کر سائیں بابا۔

'' الف اللہ چنبے دی بوٹی میرے مرشد من وچ لائی ہُو
اندر بوٹی مُشک مچایا جاں پھلن تے آئی ہُو''

کہتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

اللہ ہُو کی دھمک جیسے ہی ریشم کے دل پر پڑی تو اُسے یوں لگا جیسے اس کی روح کی بند کھڑکی کھل گئی ہو، سب اندھیرے چھٹ گئے ہوں۔

ہر سو نور کے چراغ روشن ہو چکے تھے۔اسے اپنے سوالوں کے جواب مل چکے تھے۔کیوں کہ اب اندر سے کوئی سوال کر رہا تھا:

تمھارے ہاتھ میں سورج بھی ہے، چراغ بھی ہے
پھر اتنی تیرگی کیسے ہوئی زمانے میں؟

لیکن جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی، وہاں نہ سائیں بابا تھا، نہ نہر کا کنارہ، نہ کھیت، نہ کھلیان تھے۔

بس طمانیت کا ایک بھرپور احساس تھا جو اس کے چاروں طرف اللہ ہو کی دھمال ڈال رہا تھا۔

میں نے بھی اسے مطمئن پا کر مسکراتے ہوئے کھڑکی بند کر دی۔

ماہِ محرم

(۲۲۔جنوری ۱۹۰۱ء ملکہ برطانیہ الیگزینڈریا وکٹوریہ کی وفات پر)

اے ہند تیرے سر سے اٹھا سایۂ خدا
اِک غمگسار تیرے مکینوں کی تھی گئی
ہلتا ہے جس سے عرش یہ رونا اُسی کا ہے
زینت تھی جس سے تجھ کو جنازہ اُسی کا ہے
صورت وہی ہے نام میں رکھا ہُوا ہے کیا
دیتے ہیں نام ماہِ محرم کا ہم تجھے
میّت اٹھی ہے شاہ کی تعظیم کے لیے
اقبال اُڑ کے خاک سرِ رہگذار ہو

ڈاکٹر محمد اقبال

کوئی نام نہ دو

مشتاق اعظمی
(اسنول)

ہوڑہ بمبئی میل کے الہ آباد کوچ میں اسے اپنی برتھ ڈھونڈنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ دروازے کے پاس ہی کنارے کی اوپر والی برتھ اس کی تھی۔ سوٹ کیس، ہولڈال اور اٹیچی بیگ اوپر رکھوانے کے بعد جب اس نے نیچے برتھ پر بیٹھی ہوئی خاتون کو بغور دیکھا تو چونک اٹھا۔ اس کے اداس چہرے پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔

''ارے شائستہ تم! کہاں سے آرہی ہو؟'' ندیم کا لہجہ پُر اشتیاق تھا۔

''ایک انٹرویو کے سلسلے میں الہ آباد آئی تھی۔ ایک ہائی اسکول میں ہیڈ مسٹریس کی جگہ خالی ہے۔ گورنمنٹ اسکیل اور دوسرے الاؤنسز کے علاوہ رہائش کے لیے معقول کوارٹر کا بھی انتظام ہے۔'' شائستہ نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''کیسا چانس ہے؟''

''فیر! سکریٹری تو مجھ سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ مجھے سی آف کرنے اسٹیشن تک ساتھ آیا تھا۔''

''وِش یو گڈ لک''۔

''اوہ، تھینکس!''

اتنے میں گاڑی چل پڑی۔ ایک جھٹکا سا لگا۔ چند لمحوں کے لیے باتوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ دونوں پر ایک بوجھل سی خاموشی مسلط ہوگئی۔ ٹرین اپنی منزل کی جانب بڑھنے لگی۔ کمپارٹمنٹ کا ماحول ابھی پوری طرح پُرسکون نہیں ہوا تھا۔ اپنی اپنی برتھوں کی تلاش میں کچھ مسافر اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ کوچ کا اٹنڈنٹ ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔

شائستہ نے باہر کے مناظر سے نگاہیں ہٹا کر ندیم سے پوچھا ''تم الہ آباد کس سلسلے میں آئے تھے؟''

''گذشتہ ماہ میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ میں ان کے چہلم کے سلسلے میں الہ آباد آیا تھا'' ندیم نے کہا۔

''ارے ہاں یہ افسوسناک خبر میں نے بھی سنی تھی''۔ شائستہ اداس ہو کر بولی:

''کیا ہوا تھا انہیں؟''

''کچھ بھی نہیں!'' ندیم نے کہا۔

''اچھے بھلے تھے۔ رات کے گیارہ بجے اچانک دل کا دورہ پڑا اور ڈاکٹر کے آتے آتے چل بسے۔''

''تو اب گھر کی ساری ذمہ داریاں تمہارے سر آگئیں؟'' شائستہ نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

''ظاہر ہے۔ میرا اور بھائی تو ہے نہیں!'' ندیم نے جواب دیا۔

''سنا ہے تمہاری شادی کا بڑا ارمان تھا انہیں۔ افسوس مرحوم یہ حسرت اپنے سینے میں لیے دنیا سے رخصت ہوگئے۔''

ندیم نے ایک گہری نگاہ شائستہ کے چہرے پر ڈالی۔ اس نے سوچا، حالات اور زمانہ انسان کے خیالات میں کتنا بڑا تغیر پیدا کر دیتے ہیں۔ ابھی چند برس پہلے یہی شائستہ جب کالج میں پڑھتی تھی تو اس کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ لیکن آج وہ اس کے اتنی نزدیک بیٹھی کس بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ ''ندیم کو خاموش دیکھ کر شائستہ نے سمجھا اس نے یہ بات بے موقع کہہ دی ہے۔ اس لیے اس نے فوراً کہا۔ ''ندیم معاف کرنا۔ شاید اس گفتگو کا ابھی کوئی محل نہ تھا''۔ ''نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' ندیم نے کہا ''یہ موضوع چھیڑ کر تم نے مزید گفتگو کے لیے راہ ہموار کر دی ہے۔''

شائستہ ندیم کے اس جواب پر کچھ بے چین سی دکھائی دینے لگی اور ندیم اس کی آنکھوں کی تحریر پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ٹرین نے ایک طویل سیٹی بجا کر کسی اسٹیشن کے آنے کا اعلان کیا۔ ندیم نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ اندھیرے میں اسٹیشن کی عمارت دھند میں لپٹی نظر آئی۔ ٹرین اس چھوٹے اسٹیشن کو دھیمی رفتار سے چھوڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ ندیم نے اوپر کی برتھ سے اپنا اٹیچی بیگ اتارا۔ اس میں سے چند تازہ رسالے اور کچھ سیب نکال کر سامنے رکھ لیے۔ ایک سیب اپنے ہاتھ سے اٹھا کر شائستہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''لو اپنے دانتوں کو زحمت دو۔ میرے پاس چاقو نہیں ہے۔''

شائستہ نے حیا آلود تبسم کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا اور ایک رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی۔ ورق الٹتے پلٹتے ایک صفحے پر اس کی نگاہ رُک گئی اور چہرہ مسرت سے دمکنے لگا۔ ندیم نے اس کی دلی کیفیت بھانپ کر اس کی پسند اور معیار کا اندازہ کرنے کے لیے پوچھا ''کیا کرشن چندر کا افسانہ ہے؟''

''نہیں فیضؔ کی غزل ہے!''

''شاید فیضؔ تمہارا پسندیدہ شاعر ہے؟''

''ہاں، میں شروع سے فیضؔ کی مدّاح رہی ہوں۔ فیضؔ ترقی پسند شاعری کا سب سے خوبصورت نام ہے۔ اس نے سیاسی شاعری کو رومانی اسلوب عطا کیا ہے۔''

شائستہ کے اس جواب سے اس کے بلند ادبی ذوق کا اندازہ کر کے ندیم کو بیحد خوشی ہوئی۔ کئی سال کے بعد آج اس نے شائستہ کو اتنے قریب سے دیکھا تو اسے وہ بالکل ویسی ہی لگی جیسی کالج میں دکھائی دیتی تھی۔ کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔۔۔ البتہ اس کی دلکش آنکھوں میں گہری اداسی کے سائے ضرور پھیل گئے تھے۔ کالج میں ہر طرف شائستہ کے حسن اور اس کی دلفریب اداؤں کے چرچے ہوا کرتے تھے۔ وہ نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بن چکی تھی۔ کلاس میں لیکچر کے دوران کتنے ہی دل پھینک نوجوان، پروفیسر کے لیکچر سے اپنی توجہ ہٹا کر شائستہ کی

جانب توجہ طلب نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔لیکن اس نے کبھی کسی کو اپنے قریب آنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

ایک بار فائنل ایر میں کالج کرکٹ ٹیم یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم سے مقابل تھی۔مراد کالج کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا۔جب وہ بیٹ لے کر میدان میں اترا تو اس کا قد آور ورزشی جسم دیکھ کر شائستہ کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔اس نے اپنے تصور کے کینوس پر ان تمام چہروں کو دیکھ ڈالا جو اس کے لئے سرد آہیں بھرا کرتے تھے۔لیکن ان چہروں میں کہیں بھی مراد کا چہرہ نہ تھا۔اور مراد کی اس بے توجہی نے شائستہ کے دل میں اس کے لیے کشش پیدا کر دی تھی۔کھیل شروع ہوا۔مراد نے جارحانہ انداز میں بیٹنگ شروع کی۔اس کے ہر چوکے پر تماشائیوں کی بھرپور داد مل رہی تھی۔دیکھتے دیکھتے اس نے چورانوے رن بنا لیے۔ٹیم کا حامی گروپ سانس روکے مراد کی سنچری کا منتظر تھا۔نئے اوور کی پہلی گیند پر اس نے دو رن بنا لیے۔اب صرف چار رنوں کی کمی رہ گئی تھی۔دوسری گیند پر جب مراد نے ایک چھکا تماشائیوں کی طرف اچھال دیا تو میدان تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا۔جوش مسرت سے بے قابو ہو کر شائستہ بڑی دیر تک کھڑی تالیاں بجاتی رہی۔ مراد نے شائستہ کا مسرور چہرہ دیکھا تو یوں لگا جیسے سنچری بنانے کی صحیح داد اسے پہلی دفعہ ملی ہو۔اور یہی لمحہ تھا جب شائستہ کے دل میں ایک انجان تمنا جاگ اٹھی۔

کھیل ختم ہو گیا۔لیکن ایک نیا کھیل شروع ہو چکا تھا۔دوسرے ہی دن سے مراد اور شائستہ ہر جگہ ایک ساتھ دیکھے جانے لگے۔کالج کینٹین، لائبریری، سینما ہال اور ٹاؤن پارک ان کی دھڑکنوں کے امین بن گئے۔ساری زندگی ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی گئیں۔شادی کے لیے عہد و پیمان بھی ہوئے لیکن۔۔۔''کیا سوچنے لگے؟''۔۔۔اچانک شائستہ کی آواز نے ندیم کو چونکا دیا۔ٹرین کی رفتار سست پڑنے لگی تھی۔وندھیاچل کا اسٹیشن نزدیک آ گیا تھا۔

وندھیاچل میں نئے مسافروں کے سوار ہونے سے کچھ دیر کے لیے کمپارٹمنٹ کی خاموش فضا بکھر سی گئی تھی۔زیادہ تر مسافر اپنی اپنی برتھ پر جا چکے تھے۔کچھ نیم دراز ایک دوسرے سے بات چیت میں مشغول تھے۔کافی دیر کے بعد ندیم نے گفتگو کا سلسلہ پھر جوڑا''شائستہ، ہم ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے کتنے دور دور رہے ہیں۔کبھی کسی تقریب میں مل گئے یا پھر کبھی سرِ راہ ملاقات ہو گئی۔اس میں کچھ دخل ہماری ذاتی مصروفیتوں کو بھی ہے۔تم اسکول میں مصروف اور میں کالج میں برسرِ ملازمت۔مہینوں بیت جاتے ہیں، ایک دوسرے کی خیر و عافیت نہیں مل پاتی۔مراد نے تم سے شادی کا وعدہ کیا۔پھر انکار کر دیا۔یہ بات مجھے معلوم ہوئی تھی اور مجھے بے حد افسوس ہوا تھا۔لیکن تفصیلات کا مجھے علم نہیں۔آخر ایسا کیوں ہوا؟''

'ندیم، یہ قصہ پرانا ہو چکا۔کوئی نئی بات کرو۔''شائستہ کے دل کی کسک اس کے چہرے پر ابھر آئی۔''نئی کہانی پرانا قصہ ختم ہونے کے بعد ہی تو شروع ہو سکتی ہے''۔ندیم اپنی زندہ دلی کو نہ دبا سکا۔شائستہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی''بس یوں سمجھو کہ ہمارے درمیان دل کے سوا باقی چیزیں مشترک نہ تھیں''۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا۔''شادی سے کچھ ہی دن پہلے میں بیمار ہوئی۔ڈاکٹر نے چیک آپ کے بعد رپورٹ دی کہ مجھ میں ٹی۔بی کے جراثیم سرایت کر گئے ہیں۔ جب یہ بات مراد کو معلوم ہوئی تو شادی ایک خواب بن گئی۔پیمان وفا کے تار ٹوٹ گئے۔''شائستہ کے لہجے میں درد تھا اور خوبصورت آنکھوں میں اداسی۔

''اس کے بعد کیا تمہارے اس درد کو بانٹنے والا کوئی نہیں ملا؟''ندیم کے اس ہمدردانہ سوال پر شائستہ نے ہاتھ میں ایک سیب اٹھایا۔ندیم کو دکھاتے ہوئے بولی''اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ سیب جو تم نے کچھ دیر پہلے اپنی اٹیچی سے نکالا ہے۔اندر سے سڑا ہوا ہے تو کیا تم اسے کھانا پسند کرو گے؟''شائستہ کے اس جواب میں برجستگی بھی تھی، بے کلی بھی اور دل ربائی بھی۔ندیم نے بے اختیار ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔اعتماد کے ساتھ بولا۔''کہو تو یہ ہاتھ میں ہمیشہ اسی طرح تھامے رہوں''۔اس نے پر امید نظروں سے شائستہ کی طرف دیکھا۔

''اچھا، ابھی تو چھوڑو یہ ہاتھ!''شائستہ کے لہجے میں حیا بھی تھی اور شوخی بھی۔رات کا ایک تہائی حصہ بیت چکا تھا۔شائستہ کی آنکھوں میں نیند کا خمار تیرنے لگا۔ندیم نے اوپر اور شائستہ نے نیچے برتھ پر اپنے بستر بچھا لیے۔تیز روشنی گل کر دی گئی۔شائستہ تو جلد ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی لیکن ندیم کو نیند آنے میں کچھ دیر لگی۔

دھن باد اسٹیشن پر ندیم کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا، شائستہ منھ ہاتھ دھو کر تازہ گلاب کی طرح کِھلی کِھلی بیٹھی تھی۔نگاہوں کے تبسم کے ذریعہ دونوں نے ایک دوسرے کا استقبال کیا۔۔۔ندیم تولیہ، ٹوتھ برش اور صابن لے کر ٹوائلٹ چلا گیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ وہاں سے لوٹا تو شائستہ ٹوس، آملٹ اور چائے کی ٹرے سامنے رکھے اس کی منتظر تھی۔ندیم نے شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور بولا''ابھی سے اتنا خیال!''۔۔۔شائستہ اس فقرے پر کچھ جھینپ سی گئی۔ دونوں نے ایک ساتھ ناشتہ کیا۔

منزل مقصود قریب آ رہی تھی۔چھوٹے چھوٹے اسٹیشن تیزی سے پیچھے چھوٹتے جا رہے تھے۔ٹرین وسل بجاتی، گنگناتی مسلسل آگے بڑھ رہی تھی، جیسے وہ بھی ندیم کے جذبات کا ساتھ دے رہی ہو۔صبح کے ساڑھے آٹھ بجے آسنسول اسٹیشن آ گیا۔ندیم ہولڈال اور دوسرے سامان قلیوں کے سروں پر رکھوا کر شائستہ کے ساتھ کمپارٹمنٹ سے باہر آ گیا۔مسافروں کا ازدھام گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔گیٹ سے باہر نکل کر ندیم نے شائستہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔''کیوں مزاج تو بخیر ہیں۔کیسا لگا سفر؟''''بہت اچھا، بے حد سہانا! یوں لگا جیسے مجھے مراد کی ہم سفری مل گئی ہو۔''شائستہ سرور میں ڈوب کر بولی۔

لیکن اس کے اس جواب پر ندیم کے چہرے کی بشاشت یک لخت رخصت ہو گئی، جیسے بہار نے یکا یک خزاں کا روپ اختیار کر لیا ہو۔وہ افسردہ ہو کر بولا''شائستہ میں تمہارے دل کے نہاں خانے سے مراد کی تصویر نکال کر اپنی تصویر شاید کبھی بھی نہ لگا سکوں گا۔اس لیے بہتر ہوگا ہم اس سفر کو کوئی نام نہ دیں''

ندیم ایک خالی ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا اور شائستہ اسے روک نہیں سکی۔

ضد رہی نہ سرکشی

تسنیم کوثر
(لاہور)

کبھی کبھی جب۔۔۔زیست کی کٹھنائیاں دل برداشتہ کردیں۔
لہجوں کی سرد یخ بستہ ہوائیں جذبوں کو ٹھٹھرا دیں۔
کسی کی ذرا سی بے اعتنائی پہروں رلائے اور۔۔۔ ہر اک شے سے جی اوب جائے تو۔

ایسے میں اچانک لمبی مخروطی انگلیوں والے، ہلکی ہلکی جھریوں والے دو گورے گورے ہاتھ میرا ہالہ بن جاتے ہیں۔ایک ہاتھ میری ٹھوڑی پر اور دوسرا۔ میرے لیے نوالے بناتا ہوا، مجھے مناتا ہوا، کھلاتا ہوا۔

یہ ہاتھ میری امّاں کے ہیں جن کی محبتوں کے حصار میں پروان چڑھی میں اور جن کے پیار کے خمار نے مجھے کچھ ضدی بھی بنا دیا کہ۔۔۔ میری ساری ضدیں، ساری فرمائشیں امّاں ہی سے جڑی تھیں۔کھانا کھانا ہے تو۔۔۔امّاں کے ساتھ، سکول جانا ہے تو۔۔۔امّاں کے ساتھ، کوئی فرمائش کرنی ہے تو امّاں سے۔یہاں تک کہ امّی جان کی ڈانٹ ڈپٹ کی شکایت بھی ان سے ہی کرنی ہے اور من بھاتا کھانا نہ ملنے پر ناراض بھی انہی سے ہونا ہے۔سکول سے واپسی پر گھر میں قدم رکھتے ہی پہلا سوال امّاں سے ہی کرنا ہے کہ:

''کیا کھانا بنایا ہے آج؟''

جواب میں من مرضی کی چیز سن کے خوشی خوشی کھانا کھا لیا جاتا اور اگر۔۔۔کدو، بینگن، ٹنڈے، کریلے جیسے نام سننے کو ملتے تو پھر۔۔۔ بستہ وہیں پھینک کے بھوک ہڑتال کردی جاتی۔۔۔امّاں مجھے ناراض دیکھ کر بولاسی جاتیں کبھی گھی چینی سے کھلانے کی کوشش کرتیں تو کبھی آلو والے پراٹھے کی پیشکش کر دیتیں مگر میں۔۔۔منہ پھلائے سر نہوڑائے بیٹھی رہتی۔کچھ ہی دیر بعد امّاں میری پسند کی کوئی چیز مجھے بانہوں میں سمیٹتے ہوئے کھلانے لگتیں مجھے منالیتیں۔

ان محبتوں کے حصار اور گھر بھر کے لاڈ پیار نے مجھے کچھ بگاڑ دیا تھا۔ گھر کے کُل پانچ چھ افراد اور ان میں ایک میں اکیلی بچی جو۔۔۔ایک گود سے اتری تو دوسری میں جا دبکی۔۔۔ جو شرارتیں کم اور ضدیں زیادہ کرتی تھی اور جو۔۔۔اپنی امّی جان سے بھی زیادہ اپنی امّاں سے پیار کرتی تھی۔

امّاں کی محبت نے مجھے امّی جان کے زیادہ قریب نہیں ہونے دیا تھا کہ ۔۔۔امّی جان سے ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہہ ملتی تھی جبکہ امّاں کے پاس۔۔۔ پیار ہی پیار تھا۔امّی جان مستقبل کے ڈراوے دیتی تھیں اور امّاں کبھی کسی کام کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتی تھیں۔ہر جگہ مجھے ساتھ ساتھ رکھتی تھیں۔بڑی پیاری تھیں میری امّاں۔

بڑا سا سفید دوپٹہ، گندم کی بالی جیسی سنہری رنگت، سردیوں کی نرم گرم دھوپ جیسا روپ، بالوں میں چاندی کی فصل، کانوں میں ڈنڈی جھمکی، ستواں کھڑی ناک میں چمکتا لونگ، ماتھے پہ سجی محراب اور نور کے ہالے میں لپٹا ہوا پیکر۔

یہ تھیں میری امّاں جو۔۔۔ ہر گھڑی اپنے بڑے سے سفید دوپٹے کی بُکل میں مجھے چھپائے پھرتیں۔میری ہر صبح ہر شام ان کی قربت میں گزرتی تھی کہ۔۔۔ محبتیں جب حصار بنتی ہیں تو پھر اپنے حصار سے نکلنے نہیں دیتیں اور جب محبتوں میں بٹوارہ بھی نہ ہو تو۔۔۔ یہ حصار کچھ اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

میری ہر صبح امّاں کی گود میں طلوع ہوتی تھی۔آنکھ کھلتی تو وہ۔۔۔میرا سر اپنی گود میں رکھے تسبیحات پڑھ رہی ہوتیں اور ساتھ ہی ساتھ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مجھے جگاتی رہتیں۔جب تک منہ ہاتھ دھو کر میں باورچی خانے میں پہنچتی امّاں بل دار پراٹھا اور گوری سی چائے لیے میری منتظر ہوتیں کہ۔۔۔ مجھے کالی چائے پسند ہی نہیں آتی تھی۔میں چائے کے پیالے میں پراٹھے کے نوالے ڈبو ڈبو کر کھاتی اور امّاں سے لاڈ کرتی جاتی۔اس لاڈ پیار ہی نے تو مجھے سات سالہ بچی کو ۶۵ء کی جنگ میں اپنے امّی ابّا کے ساتھ نہیں جانے دیا تھا کہ میں اپنی امّاں کے پاس، ان کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔چاروں اور اندھیرے کا جال، ہر طرف سناٹے او کاڑہ شہر تاریکیوں میں ڈوبا ہوا۔ یہاں تک کہ ہماری برادے والی انگیٹھی جنگ کے دنوں میں بجھی بجھی رہنے لگی تھی جونہی سائرن کی آواز سنائی دیتی امّاں مجھے اپنے ساتھ چمٹائے زیر لب کلمے درود پڑھتے ہوئے سیڑھیوں میں آ بیٹھتیں۔چنے، بسکٹ اور میووں کی پوٹلی ہمہ وقت ان کے پاس رہتی۔وقتاً فوقتاً اس پوٹلی میں سے چیزیں نکالتیں اور مجھے کھلانے لگتیں۔

میں درجہ چہارم میں تھی جب مجھے اپنے بال لمبے کرنے کی رٹ لگ گئی تھی۔میرے اس شوق کی تکمیل کو امّاں نے بشیر گوندل (ملازم) کو بازار بھیج کر آملے، سیکا کائی اور ریٹھے منگا لئے تھے اور ہاون دستہ اس کے ہاتھ میں تھما کے اسے یہ جڑی بوٹیاں کوٹنے پر لگا دیا تھا۔ان جڑی بوٹیوں کا استعمال کر کے انہوں نے میری خواہش کے مطابق میرے بالوں کو دراز کر دیا تھا۔

میرے امتحان قریب آتے تو مجھ سے زیادہ وہ فکر مند ہو جاتیں۔میرے ساتھ جاگتی رہتیں۔امتحان تب مارچ میں ہوا کرتے تھے ان دنوں سرما رت الوداعی رنگ بکھیرنے لگتی اور میرا جی صحن میں سونے کو مچل جاتا مگر۔۔۔امّاں صحن میں سونے ہی نہ دیتی تھیں کہ بدلتی رُت کہیں بیمار نہ کر جائے۔جس دن میرا امور خانہ داری کا پیپر ہوتا اس روز گھر میں ہلچل سی مچ جاتی۔امّاں ٹی کوزی میز پوش اور برتن ٹوکری میں رکھتی جاتیں میں ضد کر کے الماری میں سینت کے رکھے ہوئے نئے چینی کے برتن نکلواتی۔امّی جان کو ڈنر سیٹ خراب ہونے کا دھڑکا لگا رہتا مگر میری ضد کو ماننا ہی پڑتا۔بشیر گوندل سالم تانگہ کرا تا اور امّاں اور تنو بھائی کی سنگت میں میری سواری بمعہ ساز و سامان گورنمنٹ گرلز ہائی سکول پہنچ جاتی۔جب تک پیپر ختم نہیں ہوتا امّاں وہیں سکول میں بیٹھی رہتیں۔

جب میرے میٹرک کے امتحان قریب تھے تو امّاں رات گئے تک میرے ساتھ جاگتی رہتی تھیں۔ جب تک میں پڑھتی رہتی تھی وہ عشا کی نماز کی ادائیگی نہیں کرتی تھیں کہ۔۔۔نماز پڑھنے کے بعد اگر وہ سو گئیں تو میں بھی کتابیں نہ سمیٹ دوں۔

میرا میٹرک کا رزلٹ آیا تو میری امّاں خوشی سے نہال ہو گئیں ۔ میرے تایازاد اور خالہ زاد بھائی بہت کم نمبر لے کے پاس ہوئے تھے۔ امّاں نے کالج داخلے کے لیے میرے بہت چونچلے کئے۔ ماموں جان کے ساتھ بازار گئیں کتابیں، ڈائریاں، بیگ اور بہت سی چیزوں کے ساتھ نیلے رنگ کا کرسٹل کریپ کا سوٹ بھی لے کر آئیں جس پر میں سرخ کڑھائی کی تھی اور موتی ٹانکے تھے کہ۔۔۔ یہ سب ہنر مجھے انہوں نے ہی سکھائے تھے۔

امّاں ہمارے پاس ہی رہتی تھیں۔ کبھی کبھار ماموں جان کے چلی جاتی تھیں کہ ان کی اس عمرِ رائیگاں کا حاصل یہ دونوں ہی تو تھے کہ۔۔۔

جوانی تو انہوں نے سہاگن ہوتے ہوئے بھی بیوگی میں کاٹ دی تھی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ۔۔۔ عورت کی زندگی اس لیے تلخ ہوتی ہے کہ وہ بھول نہیں سکتی جبکہ مرد رات کی بات صبح بھول جاتا ہے۔ مرد فطرتاً مطمئن اور بے پرواہ مگر عورت مضطرب اور وفادار ہوتی ہے۔ مرد فطرتاً خانہ بدوش جبکہ عورت وطن پرست ہوتی ہے مرد ہر جگہ ہر گھر بنا لیتا ہے دل لگا لیتا ہے مگر۔۔۔

عورت جس دیوار کے سائے میں بیٹھ جاتی ہے اُٹھ نہیں سکتی۔

میری امّاں بھی جس دیوار کے سائے میں بیٹھی تھیں عمر بھر وہیں بیٹھی رہیں۔ بابو کی بے وفائی بھی انہیں وہاں سے نہ اٹھا سکی۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی دنیا اجڑتے دیکھتی رہیں۔ شوہر کی بے رخی، سوتن کی ناز برداریاں، سسرال کی سختیاں اور اپنے بچوں کی حق تلفیاں سب کچھ سہتی رہیں۔ اُف تک نہ کی۔۔۔ آنسو نہ آہیں۔۔۔ شکوہ نہ بد دعا۔۔۔ وہ جانتی تھیں کہ:

شکوہ کرنا عورت کو چھوٹا کر دیتا ہے۔ وہ سخت جان ہوتی ہے، وفا شعار ہوتی ہے سب کچھ خود پہ جھیل جاتی ہے مگر من میں اٹھتے جوار بھاٹا کی خبر کسی کو نہیں ہونے دیتی۔ سنا ہے جس دن بابو نے دوبارہ سہرا باندھا بس اسی دن سے امّاں نے سفید دوپٹے کی بُکل میں یوں اپنا آپ سمیٹا کہ خود سے بھی خود کو چھپا لیا۔ جی پہ پتھر رکھ کے ہر ظلم و ستم سہا مگر۔۔۔ وہ چوکھٹ نہ چھوڑی جہاں سے اپنے ماں باپ کی نصیحت کے مطابق انہیں مر کر ہی نکلنا تھا لیکن جب ملک میں بٹوارے کی وبا پھوٹی اور گھر گھر دنگا فساد ہونے لگے تو نہ صرف امّاں بلکہ پورے خاندان کو ہی اپنی جانیں بچانے کے لیے وہ چوکھٹ چھوڑنا پڑی۔ بھری پری حویلی اُجڑ گئی۔ اس حویلی پہ حکمرانی کرنے والی ہماری پردادی محمود النساء بیگم بھی ہجرت کرنے والے قافلے میں شامل ہو گئیں مگر۔۔۔ اپنی راجدھانی چھوٹ جانے کے غم نے انہیں صاحبِ فراش کر دیا۔ تب بہت ساری بہوؤں بیٹیوں کے ہوتے بھی میری امّاں نے اپنی اس ساس کی جی جان سے خدمت کی جس نے ان پر سوت بٹھا دی تھی اور پھر جب سفر کی اذیتوں کو نہ سہتے ہوئے قافلے میں ہی وہ ملک عدم سدھاریں تو۔۔۔ میری امّاں نے ہی انہیں اپنے سفید دوپٹے کا کفن دیا تھا۔ کہتے ہیں بابو نے امّاں سے دوبارہ رابطے کی درخواست کی تھی مگر۔۔۔ انہوں نے اپنے اس محرم کو اب نامحرم مان لیا تھا اور خود کو اپنے بچوں میں گم کر لیا تھا۔ امّی جان اور ماموں جان۔۔۔ امّاں کے تو یہ دو بچے تھے مگر پروردگار نے ان کے دونوں بچوں کو کثیر العیال بنا دیا تھا۔ ہمارے اور ماموں جان کے گھر میں بچوں کی تعداد بڑھتی گئی مگر۔۔۔ امّاں نے میری محبت میں کمی نہ آنے دی البتہ ماموں جان کا ولی عہد مہروز جو مجھ سے کئی برس چھوٹا تھا وہ بھی انہیں بہت پیارا تھا۔ اس کے باوجود ان کی محبت کا جھکاؤ میری طرف ہی رہا اور پھر۔۔۔ محبتوں کے آخری دن آ گئے۔

ماموں جان کی پوسٹنگ ملتان ہو گئی۔ وہ امّاں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ امّاں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اور میں ان کے جانے کے بعد سے ہی ان کے آنے کے دن گننے لگتی تھی۔

گلابی رُت تھی۔ سردیاں اپنا دامن سمیٹ رہی تھیں۔ ماموں جان کا پوسٹ کارڈ آیا تھا وہ امّاں کو لے کر آنے والے تھے۔ ہم سب گھر والے ان کے منتظر تھے مگر۔۔۔ انتظار، انتظار ہی رہا۔ امّاں ہمارے ہاں آئیں ہی نہیں۔

ماموں جان صبح ناشتے کے بعد امّاں کو لے کر ملتان اسٹیشن پہنچے اور امّاں کو ویٹنگ روم میں بٹھا کر ٹکٹ لینے چلے گئے۔ ٹکٹ لے کر پلٹے تو ریل گاڑی کی سیٹی سنائی دینے لگی۔ انہوں نے ویٹنگ روم سے امّاں کو لیا اور ان کا ہاتھ تھامے ریل گاڑی تک پہنچے۔ بیگ گاڑی میں رکھا اور امّاں کو ریل گاڑی میں سوار کرانے لگے مگر۔۔۔ امّاں کا بے جان جسم ان کی بانہوں میں جھول گیا۔ انہیں کچھ سمجھ ہی نہ آیا اور جب سمجھ میں آیا تو وہ دل چھوڑ بیٹھے۔ یہ پل بھر میں کیا ہو گیا تھا۔ ان کی دنیا اجڑ گئی تھی۔

اُدھر کہرام مچا تھا اور ادھر اوکاڑہ میں سب گھر والے امّاں کے منتظر تھے۔ میں تو ان کے آنے کی خوشی میں اس روز کالج سے جلدی آ گئی تھی۔ آخری پیریڈ چھوڑ دیا تھا۔ میری امّاں جو آ رہی تھیں مگر۔۔۔

میری امّاں نہیں آئیں۔ ایک ٹیلی فون نے ہمیں اُن کے کہیں اور جانے کی خبر دی تھی اور میں اوکاڑہ سے ملتان تک سارے رستے اس خبر کے جھوٹ ہونے کی دعائیں مانگتی رہی تھی لیکن خبر جھوٹ نہیں نکلی۔

ملتان پہنچے تو بارش زوروں پر تھی۔ اسی دھواں دھار بارش میں ہی میں نے اپنی امّاں کو آخری بار دیکھا تھا۔

نور ہی نور بکھرا ہوا تھا۔

چہرے پر طمانیت کے گلاب کھلے تھے۔ میرے ساتھ رات دیر تک جاگنے والی امّاں ابدی نیند سو رہی تھیں۔

میری بھیگی ہوئی آنکھوں کی پتلیوں نے یہ گلرنگ عکس سمیٹ لیا تھا جو اب بھی میری خشک آنکھوں میں سمٹا ہوا ہے۔ چالیس سال گزر جانے کے بعد بھی یہ نقش مٹ نہیں سکا کہ یہ محبتوں بھرا نقش ہے جو کبھی مٹتا ہی نہیں۔

وقت پنکھ لگا کر اڑ گیا۔۔۔ کئی دہائیاں دبے پاؤں گزر گئیں۔ محبتوں کے دن بیت گئے۔۔۔ سب لاڈ اٹھانے والے چلے گئے تو پسند، ناپسند بھی نہ رہی کدو، ٹینڈے، کریلے سبھی کچھ اچھا لگنے لگا۔

ضد رہی اور نہ وہ سرکشی۔ زندگی سے سمجھوتا کرنا بھی آ گیا اور پھر۔۔۔ زباں بندی بھی سیکھ لی کہ۔۔۔

شکوہ کرنا عورت کو چھوٹا کر دیتا ہے۔

ایک دلت کہانی

پرویز شہریار
(نئی دہلی)

صبح منی لال کی آنکھ کھلی تو اس نے بستر پر لیٹے لیٹے محسوس کیا، آج بہت کڑاکے کی سردی ہے۔ اس نے اٹھ کر نائٹ گاؤن کے اوپر اوور کوٹ چڑھایا۔ سر پر اپنی ہیٹ لگائی۔ اس کے بعد لائٹر سے اپنی سگار سلگائی اور پھر اپنی اسٹک لے کر دروازے سے باہر نکلا اور بھاٹی مائنس کے اپنے دومنزلہ مکان سے نکل کر فارم ہاؤسیز کے راستے پر چل پڑا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ صبح وہ مارننگ واک پر ضرور جاتا تھا، چاہے جتنی بھی سردی ہو گرمی ہو۔

دفعتاً، اس کا ذہن حال کی قید سے فرار ہو کر ماضی کی وادیوں میں بھٹکنے لگا۔

جب وہ گاؤں سے دلی آیا تھا۔ اس وقت، ماں باپ نے کتنی مشکل سے پیسے جمع کر کے اس کا ایڈمشن کرایا تھا۔ وہ بہت کم عمر میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں آ گیا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر تھی، اس وقت۔ جب اس نے بی اے میں داخلہ لیا تھا۔

یہ 1988 کی بات ہے، جب وہ دلی آیا تھا۔ ہر طرف یونیورسٹی میں ڈرگ کے شکار ہونے سے بچنے کے لیے بڑے بڑے ہورڈنگ لگے ہوئے تھے۔ یونیورسٹی کے سینیئر طلباء ڈرگ کے نشے میں مست رہتے تھے اور پڑھائی بھی کرتے تھے۔ اس نے تب روسی زبان پڑھنے کے لیے جے این یو میں داخلہ لیا تھا۔ تب ہندوستان اور روس کی بڑی اچھی دوستی تھی۔ دنیا میں روس اور امریکہ کا بڑا دبدبہ تھا۔ سوچا تھا کہ رشیئن اسٹڈی کر کے سوویت یونین چلا جاؤں گا۔ وہاں ہندوستانیوں کی بڑی اؤ بھگت ہوتی تھی۔ ہندوستان میں دلتوں کو کون پوچھتا ہے! اعظم گڑھ کے فوربیس گنج کے جوتے کاٹنے والوں کی گھاس پھوس کی جھونپڑیوں والی بستی سے نکل کر ملک کی راجدھانی تک پہنچ جانا، ہم جیسے لوگوں کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ جب وہ دلی آیا تھا، تو اس وقت تک اس کی شادی ہو چکی تھی۔ ماں باپ نے دلی بھیجنے سے پہلے پڑوسی گاؤں کے ایک کھیتہر مزدور کی بیٹی سے شادی کرا دی تھی۔ انہیں لگتا تھا کہ ان کا بیٹا شہر سے اگر بہو لے آیا تو بڑا وبال ہو جائے گا۔ شہر کی لڑکی گاؤں کے گنواروں کو خاطر میں نہیں لائے گی۔

شہر میں ہر جگہ خوبصورتی تھی۔ صاف ستھری چکنی سڑکیں۔ سڑکوں کے کنارے دونوں طرف درخت لگے ہوئے تھے۔ پارکوں میں ہریالی تھی۔ جب وہ ہاسٹل جانے کے لیے بس اسٹاپ پر 615 نمبر کی بس کا انتظار کرتا تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ ہر ایک منٹ میں کوئی نہ کوئی موٹر کار وہاں سے فراٹے بھرتی ہوئی نکل جاتی تھی۔ وہ اس بات پر حیران ہوتا تھا کہ شہروں میں کتنی گاڑیاں ہیں۔ گاؤں میں تو بس صبح سے شام تک کوئی اکا دکا ٹرک یا موٹر گاڑی نظر آتی تھی۔ دور سے ریل گاڑی کی سیٹیوں کی آواز آتی تھی۔ دن میں ایک بار ریل گاڑی اس کے قصبے سے ہو کر گزرتی تھی۔ دلی میں بڑے بڑے چوراہے تھے۔ یہاں ایمس کے سامنے چاروں طرف سے گاڑیاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ تب سڑکوں پر پل بہت کم تھے۔ ریل گاڑیاں جہاں سے گزرتی تھی، وہیں اوپر پل ہوا کرتے تھے۔ جیسے تلک برج اور صدر بازار کا برج وغیرہ۔ فلائی اوور اور فٹ اوور برج کا تب دور دور تک کوئی تصور نہ تھا۔ سڑکوں کے نام خوبصورت حروف میں انگریزی، ہندی اور اردو میں لکھے ہوتے تھے۔ پالیکا بازار اور پرگتی میدان اس وقت نئے نئے بنے تھے۔ دلی آنے والا ہر شخص انہیں دیکھ کے دنگ رہ جاتا تھا۔ زمین کے اندر ہی اندر پورا بازار بنا ہوا تھا۔

اسے یاد آیا۔ صفدر جنگ کے فلائی اوور برج کی دیواروں پر جہاں سے اس کی 615 نمبر کی بس گزرتی تھی۔ لکھا ہوا تھا،

"ہندو خطرے میں ہے۔"

یہ اتنے بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوتا تھا کہ ہماری نظر اس طرف چلی ہی جاتی تھی۔ جب اس نے پہلی بار یہ دیکھا تھا۔ تب سارا دن وہ اس بارے میں سوچتا رہا تھا کہ ہندو کیسے خطرے میں ہو سکتا ہے؟ اتنا بڑا ملک ہندوستان اور اس کی راجدھانی دلی اور دلی ہی میں ہندو خطرے میں ہے۔ جبکہ 80 فیصد آبادی اس ملک میں ہندوؤں کی ہے۔ خیر، بات آئی گئی ہو گئی۔ اس نے سوچا۔ دھرم کی ٹھیکیداری جن کے ہاتھوں میں ہے، وہ جانے، ان کا کام ہے۔ مجھ جیسے دلت کو ان سب باتوں سے کیا لینا دینا۔ ہمیں تو مندر تک میں بھٹکنے کی اجازت نہیں ہے۔

ابھی فرسٹ ٹرمپ کا امتحان مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ بیوی کا پوسٹ کارڈ آیا کہ وہ حمل سے ہو گئی ہے۔ یہ سن کر خوشی بھی ہوئی اور غم بھی ہوا۔ غربت میں بچے کی خبر مصیبت میں اضافہ کر دیتی ہے۔ ایک سال کے بعد خبر ملی کہ سوویت یونین ٹوٹ چکا ہے اور اب اس کے چودہ ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ روسی لوگ اسٹار وار اور نیوکلیئر پاور میں دنیا میں سب سے زیادہ ترقی پر پہنچ گئے تھے۔ لیکن روٹی کے لیے لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے ہو کر انہیں گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اچانک ملک میں انتشار پیدا ہو گیا اور سوویت یونین سے آزاد ہو کر 14 دیش الگ ہو گئے تھے۔ میرے خوابوں کے بھی شیشے ٹوٹ کر بکھر چکے تھے۔ کرچیاں جب زیادہ چبھنے لگیں تو میں نے رشیئن اسٹڈی چھوڑ کر ہندی ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ تب تک رچنا میری پہلی بیٹی پیدا ہو چکی تھی۔

جے این یو کی پالیٹکس نے مجھے اتنا تو سمجھا ہی دیا تھا کہ لال غلامی میں اب کچھ نہیں رکھا ہے۔ لیفٹ پارٹیاں اب زیادہ دن ٹکیں گی نہیں۔ اے وی بی پی کا وجود جے این یو میں بھی نمایاں ہونے لگا تھا۔ ان کے تیور سے لگتا تھا کہ آنے والے دنوں میں یونیورسٹی کے اندر بھی دنگے بھڑکیں گے، ضرور۔ صفدر ہاشمی اور

حبیب تنویر کے اسٹریٹ پلے میں فاشسٹ قوتیں اثر انداز ہونا شروع ہوگئی تھیں۔

وقت کتنی تیزی سے بدل گیا۔منی لال نے محسوس کیا،اب واپس چلنا چاہیے۔اس نے اپنی قیمتی گھڑی پر نظر ڈالی۔دوسری سگار سلگائی اور کش بھرتا ہوا واپس گھر کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

1992 میں بابری مسجد توڑ دی گئی۔سوچا تھا،پورے ہندوستان میں دنگا بھڑک اٹھے گا۔لیکن تھوڑا بہت احتجاج ہوا۔گودھرا میں گھر جلے،انسان مرے اور مسلمانوں کے ضمیر کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔کچھ لوگ حراست میں لیے گئے، پھر ایک ایک کر کے سب چھوٹ گئے۔

حکومتیں بدلنے لگیں۔کانگرس، جنتا دل اور بھاجپا، پھر ملی جلی سرکار بنانے کا دور آیا۔کوئی اندر سے سپورٹ کرتا تھا تو کوئی باہر سے۔اقتدار میں سبھی بنے رہنا چاہتے تھے۔کہتے ہیں،

"سیاست میں کوئی اچھوت نہیں ہوتا۔"

مایاوتی اور کلیان سنگھ کی حکومت بنی۔بعد میں محبوبہ مفتی اور بی جے پی کی حکومت بھی بنی۔کل تک جو دشمن تھے،دوست ہوگئے۔

دلتوں میں بھی بدلاؤ آیا۔پہلے گاندھیائی دلت تھے جو ہری جن کہلاتے تھے،انہیں تو رام مندر کے جلوسوں میں شامل کیا جانے لگا۔لیکن جو امبیڈ کرائیٹ تھے،وہ اپنے آپ کو بدھسٹ سمجھتے تھے اور انہوں نے بھاجپا سے دوری بنائے رکھی۔لیکن 2014 کے بعد سے گاندھیائی دلتوں کی ایک نئی فوج تیار ہوگئی تھی۔وہ خوش تھے کہ انہیں مندروں میں جانے سے اب کوئی نہیں روکتا۔وہ پوجا پارٹ میں کچھ زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے تھے۔وہ بھکت کہلانے لگے۔

بھکتی کا انہیں پورا پورا فائدہ بھی حاصل ہوا۔پہلے دلتوں کے گاؤں کے گاؤں نذر آتش کر دیے جاتے تھے۔ان کی پیٹ پیٹ کر چمڑی ادھیڑ دی جاتی تھی۔لیکن اس پورے ماب لینچنگ نے ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر اب مسلمانوں کی طرف موڑ دی تھی۔شاہین باغ کا سی اے اے کو لے کر اتنا بڑا احتجاج ہوا۔دلی کے نارتھ ایسٹ میں دنگا ہوا۔مسجد پر بھگوا جھنڈے لہرائے گئے۔"ملک کے غداروں،کو گولی مارو سالوں کو۔" جیسے آپتی جنک نعرے لگائے گئے۔لیکن دلتوں کی طرف کسی نے بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔حتیٰ کہ منی پور میں عیسائیوں کے گھر جلے،دکانیں جلی،انسانوں کو ننگا نچایا گیا۔لیکن ہم دلتوں پر رام کی کرپا بنی رہی۔ ان پر اگر پھول نہیں برسائے گئے تو ان کے گھر بھی نہیں جلائے گئے،نہ ان کے جسموں پر کوڑے برسائے گئے۔

اتنا ہی بہت ہے کہ موہن بھاگوت نے آرکھشن کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ہمیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔

آج چالیس سال سے دلی میں ہوں۔گھاس پھوس کی جھونپڑی سے نکل کر ملک کی راجدھانی میں پانچ پانچ کمروں کا دومنزلہ مکان بنوا کر رہ رہا ہوں۔یہ کیا کم ہے۔معمولی لیکچرر کی ملازمت سے زندگی شروع کی تھی۔آج ہمارے پانچوں بچے پوسٹ گریجویٹ اور پی ایچ ڈی کے اسکالر ہیں۔میں خود پروفیسر ہوں۔اپنا مکان،اپنی کار اور سرکاری ڈوپلیکس بنگلہ میں رہتا ہوں۔وہ بھی دلی کے پاش ایریا میں۔اس سے زیادہ کا تو میں نے کبھی سپنا بھی نہیں دیکھا تھا۔

سپنا پر یاد آیا۔منی لال نے اپنا ہیٹ اتار کر اپنی بال سے بے نیاز چاندی کھجائی اور دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے،خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔

رشید اعظم خان کا کھیت جس دن خرید لوں گا۔اس دن میرا وہ سپنا بھی پورا ہو جائے گا،جس کے لیے میں دلی آیا تھا۔بڑا اکڑ تھا،سسرے کو اپنی ڈاکٹری پر۔بابو جی کو پتہ نہیں کون سا انجیکشن لگا دیا تھا کہ گھٹنے کا درد تو کیا دور ہوتا، الٹے ان کا سارا شریر نیلا پڑ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے،۔۔۔ تین چار گھنٹے کے اندر ان کی موت ہوگئی۔

مجھے خبر ملی تو میں نے کہا۔دلی سے آیا ہوں اور میں ان کا اکلوتا لڑکا ہوں۔ماتا جی سے پاؤں پکڑ کے معافی مانگو اور ایک لاکھ روپیہ جرمانہ دے دو۔تو چھوٹ جاؤ گے۔ورنہ پولیس کیس ہوگیا تو جیل بھی جاؤ گے اور پولیس کو جو دینا پڑے گا سو الگ۔اس نے ڈر سے پیسے تو دے دیے تھے،لیکن اس کا تیور آج بھی میرا دل چیر جاتا ہے۔

منی لال نے آخری جملہ بہت حسرت کے ساتھ ادا کیا اور گیٹ کھول کے اپنے مکان کے اندر داخل ہوگیا۔

- بقیہ -
دیارِ مصر

اگلے دن نیشنل میوزیم دیکھا جس کا حال پہلے لکھ چکی ہوں۔اس کے بعد واپسی تھی۔ چند گھنٹے کمرے میں آرام کرنے کے بعد ہم سب لابی میں جمع تھے۔کچھ لوگ ہمارے ساتھ ہی نیویارک تک آ رہے تھے۔کچھ لوگ عمرہ کرنے جا رہے تھے اور کچھ لوگ ابھی اور بھی رکنا چاہ رہے تھے۔ہماری بہن اور بھانجی نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تھا وہ دبئی جانا چاہ رہے تھے اور میں اینہ اور کچھ لوگ ہمارے ساتھ امریکہ آ رہے تھے۔مگر یہ دس دن ہم سب نے بہت محبت اور پیار سے خوب ہنستے بولتے گزارے تھے اس لیے اداس تھے۔ایک دوسرے سے فون پر بات کرنے کے وعدے کیے۔اپنے پہنچنے کے بعد بھی کافی عرصے رابطے میں رہے۔پھر مصروفیات میں گم ہو گئے۔یہ ایک یادگار سفر تھا جو کہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

"ضبطِ غم"

فنا کانپوری

(۱۸۔جولائی ۱۹۲۲ تا ۱۸۔جولائی ۱۹۸۸ء)

گھر ہوا گلشن ہوا صحرا ہوا
ہر جگہ میرا جنوں رُسوا ہوا

میں تو پہنچا ٹھوکریں کھاتا ہوا
منزلوں پر خضر کا چرچا ہوا

غیرت اہل چمن کو کیا ہوا
چھوڑ آئے آشیاں جلتا ہوا

غم سے نازک ضبطِ غم کی بات ہے
یہ بھی دریا ہے مگر ٹھہرا ہوا

پرسشِ غم آپ رہنے دیجیے
یہ تماشا ہے میرا دیکھا ہوا

حسن پر بھی تھی زمانے کی نظر
وہ تو کہیے، عشق ہی رُسوا ہوا

یہ عمارت تو عبادت گاہ ہے
اس جگہ اک میکدہ تھا کیا ہوا

○

ولی عالم شاہین

(کناڈا)

زندگی سے دو دو ہاتھ صبح و شام لینے کا حوصلہ نکل گیا ہے
ہاتھ پاؤں چلتے تھے اب زبان چلتی ہے اور دماغ چل گیا ہے

اتنے سارے دہشت گرد میرے گرد ہوتے تھے درد اب سنبھل گیا ہے
بوجھ اٹھائے کاندھے پر تیری سمت جانے کا راستہ بدل گیا ہے

بار بار اجڑنے پر شہر پھر بسا ہی تھا اب کے سارا جل گیا ہے
کیا پہاڑ کیا لوہا موم بن کے سارے میں دفعتاً پگھل گیا ہے

میرا ایک اک جذبہ اس قدر ادھورا تھا مورتی میں ڈھل گیا ہے
اب یہ حال ہے اپنا رات دن پرستش میں دل ذرا بہل گیا ہے

کب نہیں اترتی تھیں یہ بلائیں اوپر سے ڈر بلا کا ٹل گیا ہے
اِن نئے صحیفوں میں اب خبر کا رونا کیا واقعہ بدل گیا ہے

○

ارشدانصاری

(کراچی)

میں تری زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہوں تو کیا
کیوں پھر تری زلف کو چھوڑ کر صبا ہرجائی ہوئی

ترے رُخ کا یہ سحر کوئی تو محسوس کرے
بے سبب چاندنی لگتی نہیں شرمائی ہوئی

ذکر آیا ترا جب گلشنِ گل میں جس دم
کِھل اٹھی کوئی کلی باغ میں اترائی ہوئی

خونِ دل آنکھ سے ٹپکے تو اُسے اشک کہیں ے
میرے ان اشک ک تو پھر بھی نہیں شنوائی ہوئی

ناصح نے جو کہا، اسے بھول گئے ارشؔد
اسی ادا سے تو دہر میں مری پذیرائی ہوئی

○

آفتاب مضطر

(کراچی)

جو مُضحِک عدل کا ہے، وہی مُنصِف بَنا ہے تماشا چل رہا ہے
ہے فَق انصاف کا منہ، عجب آب وہَوا ہے تماشا چل رہا ہے

زباں َکیلی گئی ہے، نظر جادُو سے ہے بند، نظر بندی سے پابند
کھڑا ہے مجمع سا کِت، لگا اک قُفل سا ہے، تماشا چل رہا ہے

کہیں بیگانگی کا، کہیں دیوانگی کا، کہیں فرزانگی کا
فسانہ سا چِھڑا ہے، ڈرامہ سا لگا ہے، تماشا چل رہا ہے

کہیں پیمانگی ہے، بَخِیلی ہے کہیں پر، چَھلکتی ے کہیں پر
عجب میخانگی کا، تماشا لگ چلا ہے، تماشا چل رہا ہے

قصیدہ خُو بیانی، قصیدے پڑھ رہی ہے، سَرِ ہجوِ ملی ہے
عجب درباریانہ لگا دربار سا ہے، تماشا چل رہا ہے

مچی یک طُرفگی ہے، عجب سی گمرہی ہے، سِوا ہرِ ہرَ وی ہے
نہ کوئی چل رہا ہے، نہ رستہ کٹ رہا ہے، تماشا چل رہا ہے

ہے چولا پہنے بابا، نچاتا ڈُگڈُگی پر، تماشائی ہیں شَشدَر
کہیں بچّہ جمُورا، کہیں جھولا پڑا ہے، تماشا چل رہا ہے

یہ محشر کی گھڑی ہے، بَلیَنڈائی چھڑی ہے، جو میداں میں کھڑی ہے
سوا نیزے پہ سورج اگرچہ آ لگا ہے، تماشا چل رہا ہے

لیے حرفِ ملامت، تماشائی ہے دنیا، تماشا دیکھ اب، آ!!
مَلامَت کا ہدَف اب ترا مضطر بنا ہے، تماشا چل رہا ہے

○

مشتاق اعظمی

(اسنبول)

محبت چوٹ کھا کھا کر کبھی بے دم نہیں ہوتی
یہ ایسی شئے ہے جو بڑھتی ہے لیکن کم نہیں ہوتی

ملاؤ ہاتھ تو دل بھی ملے یہ ذہن میں رکھنا
وہاں غنچے نہیں کھلتے جہاں شبنم نہیں ہوتی

کسی کی راہ کا بن کر دیا دیکھو تو سمجھو گے
یہ ایسی روشنی ہے جو کبھی مدھم نہیں ہوتی

پہنچ پاتا میں اس کے آستانے تک بھلا کیسے
اگر سعیِ مسلسل میری مستحکم نہیں ہوتی

ترے ارض و سما کا حُسن نظم و نسق یا اللہ
نہ تھا ممکن اگر تری عطا پیہم نہیں ہوتی

خلوص و مہر کے پیکر سے جھک کے مل تو لیتا ہوں
مگر دستار ہر چوکھٹ پہ میری خم نہیں ہوتی

وہ اک ساعت جو تیری ہم نشینی میں گزرتی ہے
وہ اک ساعت حیات جاوداں سے کم نہیں ہوتی

○

سہیل اقبال

(کینیڈا)

بکھرا ہوا وہ شخص پریشاں نہیں تھا کیا
آنکھوں میں اُس کی ریت کا طوفاں نہیں تھا کیا

تُو عشق کو مذاق سمجھتا ہے کس طرح
کیا تیرا چاک چاک گریباں نہیں تھا کیا

تُو نے بھی تیرگی سے مراسم بڑھا دیے
تجھ کو چراغِ وصل کا امکاں نہیں تھا کیا

تصویرِ یار آنکھ کی پتلی میں آ گئی
پوشیدہ میری آنکھ میں میداں نہیں تھا کیا

آنکھیں ملا کے بات نہیں کر رہا تھا وہ
تم ہی بتاؤ اب وہ پشیماں نہیں تھا کیا

یہ اور بات اب تُو چھپاتا ہے دل کی بات
اک عمر تک ترا یہی ارماں نہیں تھا کیا

دل کے قریب کر کے جدا کر دیا سہیل
پتھر سمجھ لیا مجھے انساں نہیں تھا کیا

○

رؤف خیر
(حیدرآباد دکن)

دشت چھانا نہ سمندر ہی کھنگالا ہم نے
اپنے اندر ہی تجھے ڈھونڈ نکالا ہم نے

ہم وہ سورج ہیں کہ بانٹا ہے اجالا ہم نے
گود میں اُن کی کوئی چاند تو ڈالا ہم نے

اب اسی ''خطۂ زہراب'' میں جینا ہے ہمیں
سو ہر اک زہر کا اک توڑ نکالا ہم نے

سلسلہ جوڑتے پھرتے نہیں ان سے اُن سے
آپ اپنے کو بنایا ہے حوالہ ہم نے

ماننے پر ہمیں آمادہ کوئی ہو کہ نہ ہو
خود کو منوانے کا ہر ڈول تو ڈالا ہم نے

قلعے بنوائے کہیں تاج محل بنوایا
حرفِ روشن سے کوئی دل نہ اجالا ہم نے

خیرؔ بے شک ''یدِ بیضائے سخن'' رکھتے ہیں
خود نمائی کا مگر روگ نہ پالا ہم نے

○

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

زندگی کی رہگزاروں سے گزر جانے کے بعد
کھوئے کھوئے بیٹھے ہیں دریا اُتر جانے کے بعد

اُس سے کیا شان تھی اور کیسے کیسے زُعم تھے !
یاد آتے ہیں وہ لمحے اب گزر جانے کے بعد

چھپ نہیں سکتی حقیقت جھوٹ کے بہروپ میں
سچ ابھر آتا ہے آخر رنگ اتر جانے کے بعد

دیکھ کر ظلم و ستم یوں لگ رہا تھا روز و شب
حال کچھ بدلے گا لیکن زیست کر جانے کے بعد

چھا گیا تھا وقت ایسا یوں نظر آتا تھا واں
جیسے چھٹکارا نہ ہو گا اپنا ہر جانے کے بعد

جور و الفت کے اصولوں میں تصادم رات دن
پر سمجھ آئے گی یہ بھی رمز مر جانے کے بعد

جائزہ لیں کاش اِس طرزِ عمل کا اے ریاضؔ
کون چلتا ہے بھلا شوقِ سفر جانے کے بعد

○

ارشد سعید
(آسٹریلیا)

زمیں ساری یونہی بنجر پڑی ہے
یہ سالِ نو کی کیسی جنوری ہے

یہاں کی ساری دیواروں پہ لکھ دو
جو جابر ہے وہی حق سے بری ہے

زمیں سے اُگ رہا ہے شوقِ منزل
درِ زنداں پہ آزادی کھڑی ہے

زمیں نے لے رکھے ہیں قرض اتنے
یہ غربت کے لیے مشکل گھڑی ہے

جو کہتے تھے یہاں مقتل سجے گا
وہ اب دیکھیں کہ چہروں پر ہنسی ہے

ستم کی داستاں جُوں ہی سنائی
محافظ نے لگائی ہتھکڑی ہے

عدالت فیصلہ مرضی کا دے گی
یہ ہے انصاف یا ذوقِ شہی ہے

جواں چہروں کو منزل کی تمنا
اور آنکھوں میں مسرت کی نمی ہے

وطن کی یاد کیا آئی ہے ارشدؔ
مری آنکھوں میں اشکوں کی لڑی ہے

○

نبیل احمد نبیل
(لاہور)

کہیں سر پر گراں نہ ہو جائے
یہ زمیں، آسماں نہ ہو جائے

ڈر رہا ہوں میں تجھ سے ملتے ہوئے
تُو کہیں مہرباں نہ ہو جائے

جیسے ٹوٹا ہے آئنے میں عکس
وہ ہی دل کا سماں نہ ہو جائے

اِس قدر ہجر ہائے اِتنا فراق!
یہ ہی میرا بیاں نہ ہو جائے

خامشی اِس قدر کہ ڈرتا ہوں
ہر مکاں، لامکاں نہ ہو جائے

یہ جو فُرقت کا ایک لمحہ ہے
دیکھنا جاوداں نہ ہو جائے

بول اُٹھا ہوں کہ میری خاموشی
کہیں تجھ پر گراں نہ ہو جائے

کسی پہلو بھی یہ ٹھہرتا نہیں
دل رگوں میں رواں نہ ہو جائے

زخم کو زخم ہی سمجھئے نبیل
داغ جب تک عیاں نہ ہو جائے

○

ایک چراغ

امرتا پریتم
۔ گورمکھی سے ترجمہ ۔
رینو بہل (چندی گڑھ)

جب وہ چھوٹا بچہ تھا والدین اس سے رُتو کہہ کر بلاتے تھے۔ جب اُس نے سکول میں نام لکھوایا تو اس کے استاد نے اس کو رتن کہہ کر پکارا۔ جب وہ آٹھویں جماعت میں پہنچا تو اس کے دوست یار اُسے رتن سنگھ کے نام سے یاد کرتے لیکن جب اس نے سکول سے نام کٹوالیا تو سارا گاؤں اسے بالکا بھائی کہنے لگا۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے لشکر کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ اس گاؤں میں پہنچے تو رات ہوگئی۔ صبح ہوئی تو مہاراجہ نے پاٹھ پوجا کے لیے گرودوارے کا پتہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ اس گاؤں میں کوئی گرودوارا نہیں۔ بولے ''تلونڈی چمرا'' اتنا بڑا گاؤں اور یہاں گرودوارا نہیں؟'' اور مہاراجہ نے ایک بھلے سے سردار کو تھوڑی سی زمین دے دی اور کہا کہ اس زمین کے ایک حصے میں گرودوارا قائم کرواور باقی میں کھیتی کر کے اس کا خرچ چلاؤ۔

یہ بالکا بھائی اسی بھلے سردار کے خاندان میں سے تھا۔ گرودوارے کے ساتھ لگی زمین زیادہ نہیں تھی اس لیے بالکا بھائی کے والد نے کچھ دنوں کے لیے اپنی جگہ پر کسی دوسرے شخص کو وہاں بٹھا دیا اور خود لائل پور کے علاقے میں کچھ زمین خرید لی۔ اس زمین سے اسے اچھا نفع ہوا۔ اس نے سوچا کچھ سال وہ اسی علاقے میں رہے گا مگر تھوڑے ہی دنوں میں اسے گاؤں سے خبر ملی کہ جس شخص کو وہ اپنا کام سونپ کر آیا ہے وہ اس کام کو سنبھال نہیں پا رہا۔

بھلے سردار کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنے دونوں بڑے بیٹوں کو بلا کر کہا کہ ان میں سے کوئی ایک گاؤں جا کر اس کام کو سنبھال لے۔ یہ دین کے وقار کے نگہبانی کا کام ہے۔ سارے گاؤں کی بہو بیٹیوں کے اعتقاد کا سوال ہے۔ لیکن جوان بیٹوں کی آنکھوں کے سامنے لائل پور کے علاقے کا موٹا گندم ناچ رہا تھا اور وہاں کی سفید سفید کپاس کھل رہی تھی انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ تب بھلے سردار نے لاچار ہو کر اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو سکول سے اٹھا کر تلونڈی چمرا بھیج دیا۔ اس طرح ایک چھوٹا بچہ جس نے رُتو سے رتن سنگھ بننے میں چودہ پندرہ برس لگائے تھے ایک دن اچانک ہی بالکا بھائی بن گیا۔

اس بالکا بھائی نے جب صبح سویرے گرودوارے کی صاف صفائی کے بعد اپنی شیریں آواز سے گرو گرنت صاحب کا پاٹھ کیا تو دین کا وقار اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ گاؤں کی بہو بیٹیوں کا اعتماد پھر گرودوارے کی جانب لوٹ آیا۔

گاؤں کی عورتیں ایک ہاتھ سے بالکا بھائی کے سر پر پیار دیتیں اور دوسرے ہاتھ سے اس کے پاؤں چھو لیتیں۔ کوئی صبح کو اس کے لیے دودھ کا کٹورا بھر کے لے آتی تو کوئی دوپہر کو لسی کا گلاس لاتی۔ جو عورت اپنے گھر میں نیا مٹکا لگاتی اس میں سے پہلا کٹورا بالکا بھائی کو پلاتی اور اسے یقین ہو جاتا کہ اب ساری گرمیاں اس کے مٹکے کا پانی ٹھنڈا رہے گا۔ جو عورت سردی کی آمد پر مسور کی دال کی پنیاں بناتی سب سے پہلی پنی وہ بالکا بھائی کو کھلاتی اور اسے یقین ہوتا کہ اب سارا سال اس کے گھر میں برکت رہے گی۔ جس کے گھر بیاہ شادی کے لیے بھٹی چڑھائی جاتی وہ سب سے پہلے مٹھائی کی تھالی بھر کر بالکا بھائی کے آگے جا رکھتا اور اسے یقین ہوتا کہ اس کا یہ کام بنا رکاوٹ کے پورا ہو جائے گا۔

کسی عورت کے بچے کو بخار چڑھتا تو وہ گھبرائی گھبرائی بالکا بھائی کے پاس آ کر منتیں کرتی کہ وہ اپنے نہار منہ صبح سویرے ''مہاراج'' کا فال دیکھے اور اسے بتائے کہ فال اچھا آیا ہے کہ نہیں۔ اور بالکا بھائی اپنے شیریں زبان سے یہ کہتا کہ ''ماتا جی مہاراج کا فال ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے کبھی برا نہیں ہوتا'' تو اس عورت کو صبر آ جاتا اور اس کا بیٹا اچھا ہو جاتا۔

فصلوں کے وقت جب پہلے پہل لوگوں کے گھر اناج آتا تو وہ سب سے پہلے تسلو بھر کر بالکا بھائی کے آگے جا رکھتے اور پھر بارش وقت پر ہوتی تو کھیتوں میں وقت پر ہی بیج پڑ جاتا۔

بالکا بھائی کا چہرہ دلکش، آنکھیں شرمیلی اور آواز اتنی سریلی تھی کہ لوگوں کا دل کرتا کہ گھر میں رکھوایا پاٹھ ختم ہوتے ہی وہ دوسرا پاٹھ رکھوالیں۔ عورتیں انگلیوں پر دن گنتی رہتی کہ اگلی اموایسہ کب آئے گی سنکرانتی کب آئے گی اور گرو پورب کب آئے گا جب وہ بالکا بھائی کے لیے اپنی رسوئی میں اس کے لیے تھالی پروسیں گیں۔

ایک مرتبہ کسی کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی خواہش تھی کہ ان کے نام کا گھر میں پاٹھ رکھوائے اور بالکا بھائی گھر آ کر بھوگ لگائے۔ بالکا بھائی کا چھوٹا سا دل گھبرا گیا اور اس نے کہہ دیا کہ وہ پاٹھ نہیں رکھے گا اور نہ ہی بھوگ لگائے گا۔ عابد کی آنکھیں بھر آئیں اور بالکا بھائی کے پاؤں چھو کر نکل گیا۔ بالکا بھائی اپنی کوٹھڑی میں آ کر رونے لگا۔ ان دنوں ایک رمتا سادھو گرودوارے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے بالکا بھائی کا منہ سر چوما اور بالکا بھائی نے اس کے سامنے اپنے دل کھول کر رکھ دیا۔ کہنے لگا کہ کچھ لوگ مر کر بھوت پریت بن جاتے ہیں۔ اگر وہ مرنے والے شخص کے گھر پاٹھ کرنے جائے گا تو کون جانے اسے بھوت پریت پکڑ لے۔ سادھو نے بالکا بھائی کو بہت پیار کیا اور سمجھایا کہ جس جگہ پر گرو گرنت صاحب کا پرکاش ہوتا ہے جہاں ان کا پاٹھ ہوتا ہے اس جگہ پر بھوت پریت یا ڈائن آنے کی ہمت نہیں کرتے۔ ''سچ؟'' بالکا بھائی یہ کہتے ہوئے جھٹ سے اٹھے، اپنی بہتی آنکھیں صاف کیں اور اس گھر پاٹھ کرنے کو تیار ہو گئے۔

اس طرح بالکا بھائی کے من کی نازک زمین میں دین کی جڑیں دھیرے دھیرے گہری دھنستی گئیں۔

ہر صبح بالکا بھائی جپ جی صاحب پڑھتا شام کو راہ داس کا پاٹھ کرتا اور دوپہر کو کوئی نہ کوئی تذکرہ ذکر چھیڑ لیتا اور سامعین سرشار ہو جاتے۔

جپ جی صاحب تو ابتدائی زمانے کی شہ تھی جو کبھی بدل نہیں سکتی تھی۔ رہ راس بھی قدیم شہ تھی مگر تذکرہ اور ذکر ایک جدید ذریعہ تھا جسے ہر روز نیا ہونا ہوتا

تھا۔تذکرے میں ''سورج پرکاش'' ختم ہوتا تو ''بھگت وانی'' شروع ہو جاتی۔ بھگت وانی ختم ہوتی تو ''رانا مورسنگھ'' شروع ہو جاتا۔کئی مرتبہ تو بیت پڑھے جاتے ،دوہے پڑھے جاتے ،نظم پڑھی جاتی اور کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ وارث شاہ کی ہیر بھی گائی جاتی۔ بالکا بھائی کا نرم دل انگ انگ کٹوانے والے منی سنگھ کی شہادت پڑھتے ہوئے جس طرح رو پڑتا اسی طرح ڈولی میں بیٹھتے وقت ہیر کی چیخیں سن کر بھی اس کا دل بھر آتا اور اس کے من میں اس سوچ کی بنیاد اور گہری ہو جاتی کہ آدمی کا دین زلفوں اور سانسوں کے ساتھ نبھنا چاہیے۔

سنکرانتی کا دن تھا۔آج بالکا بھائی صبح معمول سے پہلے ہی اٹھ بیٹھا۔ ابھی ایک پہر رات باقی تھی ۔اس نے کنویں میں سے پانی نکال کر غسل کیا۔ چولہے میں لکڑیاں جلا کر پرساد تیار کر کے ایک پرات میں ڈالا۔ روز وہ لوگوں کو بتاشوں کا پرساد بانٹتا مگر سنکرانتی اور اماوس کے دن وہ بانٹنے کے لیے حلوے کا پرساد تیار کرتا تھا۔ پاٹھ ہوا، کیرتن ہوا، ارداس ہوئی اور وہ لوگوں کو پرساد بانٹنے لگا۔ایک لڑکی کو وہ پرساد دے رہا تھا تو تھوڑا سا پرساد اس کے ہاتھ سے نیچے اس کے پاؤں پر آ گرا۔لڑکی نے جلدی سے بالکا بھائی کے پاؤں پر گرا ہوا پرساد اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لیا۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ پرساد زمین پر گر پڑے تو اسے اٹھا کر کھا لینا چاہیے نہیں تو پرساد کی بے ادبی ہوتی ہے لیکن اس لڑکی نے پرساد اٹھانے کے لیے اس کے پاؤں کو ہاتھ لگایا تو اس کے پاؤں میں ایک کپکپی ہوئی اور اوپر چڑھتی چڑھتی وہ اس کے دل تک پہنچ گئی۔

یہ سنکرانتی کا دن تھا اور سارا دن بالکا بھائی کے جسم میں ایک جھنجھناہٹ سی لگی رہی۔ یہ سنکرانتی کی رات تھی اور بالکا بھائی کی نیند اکھڑ گئی۔

''یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟'' بالکا بھائی نے رات کے گہرے اندھیرے میں اپنے دل سے پوچھا۔

''کوئی مقدس سی بات'' اس کے دل نے جواب دیا۔

''کیا میرے اندر کوئی بھوت پریت گھس آیا ہے یا کوئی ڈائن؟'' اُس نے ڈر کر پوچھا۔

''جہاں مہاراج کا پاٹھ ہوتا ہے وہاں کوئی بھوت پریت نہیں آ سکتا نہ کوئی ڈائن'' اس کے دل نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''پھر یہ کون ہے؟'' اس نے گھبرا کر سوال کیا۔

''شاید کوئی پری کوئی حور'' اس کے من نے کہا۔اور رات کے گہرے اندھیرے میں اس کے دل نے ایک چراغ جلا دیا۔

اس رات بالکا بھائی کو پہلی بار ایسا محسوس ہوا کہ اس کے بچپن کے جسم پر پہلی مرتبہ جب بزرگی کا چولا ڈالا گیا تھا وہ گھبرایا نہیں تھا۔وہ چولا بڑا تھا مگر اس کے بچپن کے جسم نے اسے اچھی طرح پکڑ کر سنبھال لیا تھا۔مگر اب اس کے الہڑ جوان جسم سے اس چولے کے کنارے نہیں سنبھالے جا رہے تھے۔ بالکا بھائی کو بزرگی کے اس چولے پر بڑا غصہ آیا اور الہڑ جوانی پر اسے بے حد رنج ہوا۔

کچھ دن گزرے تھے کہ بالکا بھائی کا ویرو کے ساتھ اچانک سامنا ہو گیا۔یہ وہی ویرو تھی جس نے بالکا بھائی کے پاؤں پر سے پرساد اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لیا تھا۔ویرو ایک بھٹیارن کی بھٹی کے پاس کھڑی ہو کر مکئی کے دانے بنوا کر اپنی جھولی میں ڈلوا رہی تھی کہ بالکا بھائی اس کے پاس سے گزرا اور اس نے جھولی سے بھنے ہوئے دانوں کی ایک مٹھی نکال اس کے آگے کر دی۔ بالکا بھائی نے بہت سوچا کہ وہ یہ دانے لے یا نہ لے لیکن بے خیالی میں ہی اس نے دونوں ہاتھ آگے کر دیے اور اس نے ویرو کے ہاتھ سے اسی عقیدت کے ساتھ لے لیے جیسے کوئی دونوں ہاتھوں میں پرساد لیتا ہے۔اس روز بالکا بھائی کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ بھنی ہوئی مکئی سے ایسی خوشبو اٹھ سکتی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ کسی کا انگ انگ جھوم اٹھے۔

ایک روز بالکا بھائی شری گرو گرنت صاحب کے حضور میں بیٹھ یکسونیت سے پاٹھ کر رہا تھا کہ اسے لگا کہ اس کی پشت پر کوئی پُور جھلا رہا ہے۔وہ جب پاٹھ کر کے اٹھا تو اس نے دیکھا کہ ویرو اس کی پیٹھ کے پیچھے کھڑی پُور جھلا رہی ہے اور اس رات سے اس طرح ہو گیا کہ بالکا بھائی جب سوتا تو اس کی نیند ویرو کے کسی نہ کسی خواب میں سر پر پُور کرتی رہتی۔

بالکا بھائی کو محسوس ہونے لگا کہ سنکرانتی والی رات اس کے دل میں جو چراغ جلا تھا اس کی لو تیز ہوتی جا رہی ہے۔گرودوارے کے پیچھے ویرو کی ایک سہیلی کا گھر تھا۔کئی بار رات کو گاؤں کی لڑکیاں وہاں مل کر چرخا کاتتی۔لڑکیاں گیت گاتی، نہ چرخے کا تار ٹوٹتا نہ گیت کی لے۔ یہ گیت سنتے سنتے وہ سرشار ہو جاتا ٹھیک اسی طرح جس طرح جب دیال جی کی آنند منڈلی گرودوارے آ کر شبد کرتن کرتی تھی۔

وہ ویرو کی آواز پہچانتا تھا۔جس طرح ویرو چرخے کا لمبا تار نکالتی تھی اسی طرح وہ گیت کے سر بھی اونچا اٹھاتی تھی۔ایک دن مست مگن وہ ویرو کا گیت سن رہا تھا کہ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے لڑکیوں کی آواز تو اس گیت میں ملی ہوئی ہو پر اس میں ویرو کی آواز نکل گئی ہو۔معلوم نہیں وہ کہاں اٹھ کر چلی گئی تھی اور یہ سوچتے ہی بالکا بھائی کا دل ٹوٹنے بکھرنے لگا۔

تبھی اس کی کوٹھڑی کی کھڑکی کو کسی نے کھٹکھٹایا، ایک بار دو بار۔بالکا بھائی نے جب کھڑکی سے باہر دیکھا تو باہر ویرو کھڑی تھی۔ اس نے جب دروازے کی کنڈی کھولی تو اسے محسوس ہوا آج کوٹھڑی میں ویرو نہیں آئی لڑکیوں کی محفل کا ایک گیت اٹھ کر آ گیا ہو۔اس کی الہڑ جوانی کے دل میں آیا کہ وہ اپنے گلے میں پڑے بزرگی کے چولے کو پھاڑ کر اتار دے۔اس کی سوچ کی قوت نے جواب دے دیا۔ پھر اسے لگا کہ آج اس کی کوٹھڑی میں ویرو نہیں امتحان کا وقت آ گیا ہے اور الہڑ جوانی نے اپنے گلے میں پڑے ہوئے بزرگی کے چولے کے سبھی کنارے زور سے پکڑ لیے۔

''اس وقت ویرو تمہیں ڈر نہیں لگا؟''

''ڈر کس سے؟''

''اس اندھیرے سے۔''

''میں کوئی دور سے آئی ہوں یہاں پیچھے سے ہی تو آئی ہوں''

''اور مجھ سے؟''

ویرو نے نظر بھر کر بالکا کی طرف دیکھا اور سرد آہ بھر کر خاموش ہوگئی۔

''تجھے ڈر نہیں لگتا مگر مجھے لگتا ہے؟''

''کس سے؟''

''شاید اپنے آپ سے۔''

اس بار ویرو ہنس پڑی اور کہنے لگی:

یہ لو پکڑو ''مروندے''۔ میں آج سارا دن دانے بھناتی رہی اور بیچ میں گڑ ڈالتی رہی۔ کچھ مروندے میں اپنی سہیلیوں کو دے آئی ہوں اور کچھ تمہارے لیے لائی ہوں۔ ''لو پکڑو میں جا رہی ہوں تم یہ کھاتے رہو اور ڈرتے رہو۔'' مروندے تھما کر وہ انہیں پاؤں واپس لوٹ گئی۔

بالکا بھائی کو محسوس ہوا کہ مروندے تو میٹھے ہوں گے مگر ویرو آج کڑوی تھی۔ بہت کڑوی۔

چارپائی کے سرہانے بیٹھے اس نے تمام رات گزار دی۔ کئی بار اٹھ کر لوٹے میں سے پانی لے کر کلہ کیا پر ساری رات یہ محسوس ہوتا رہا جیسے اس کے گلے میں کوئی کچھ کڑوا گھول رہا ہو۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے دل نے جو چراغ جلایا تھا، آج مریادہ کی گہری سانس سے اس چراغ کی لو تھرتھرانے لگی تھی۔

کئی روز گزر گئے ویرو دوبارہ گرو دوارے نہیں آئی۔ سنکراتی آئی، اماوس آئی مگر ویرو نہیں آئی۔ بالکا بھائی سوچتا رہا ویرو ایک بار آ جائے بس ایک بار۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں ویرو کے دونوں ہاتھ پکڑ کر مہاراج کے آگے دعا کرے گا چار ہاتھوں میں سے دعا کرے گا کہ ہے سچے بادشاہ تم جانی جان ہو ہر ایک دل کی جانتے ہو۔ ہم پانچ عناصر کے قالب، ہماری غلطی کو معاف کر دو۔ کوئی راستہ نکال دو۔ ہمارا میل کرا دو۔

جب کبھی بالکا بھائی کو اس کے بوڑھے باپ کا خط آتا اس میں خیر و عافیت پوچھنے کے بعد ہر بار نصیحت لکھی ہوئی ہوتی تھی کہ قلیل غذا لینا، کم سونا، اور مریادہ کی روشن پیشانی پر کبھی کلنک نہ لگنے دینا۔

بالکا بھائی کو اپنے والد سے بہت عقیدت تھی۔ ان کے کہے ہر لفظ کو بہت اہمیت دیتا تھا مگر آج جب وہ ویرو کے پیار کو ٹٹولتا تو اس کا رنگ اسے خالص سرخ دکھائی دیتا۔ کلنک کہیں ڈھونڈنے پر بھی نہ ملتی۔ بالکا بھائی کو محسوس ہوا کہ ایک سنکرانتی کی رات جو اس کے دل میں چراغ جلا تھا اس کی لو اب پورے شباب پر پہنچ گئی ہے۔

پھر ایک روز ویرو آ گئی۔

یہی رات کا وقت تھا۔ اسی طرح اس کی کھڑکی کو کھٹکھٹایا۔ اسی طرح بالکا بھائی نے دروازے کی کنڈی کھولی مگر آج ویرو کے ہاتھ میں کوئی مروندا نہیں تھا، آج وہ خود ہی مروندا بن کر آئی تھی۔ بالکا بھائی نے اپنا سارا انتظار ویرو کے قدموں کے آگے بچھا دیا اور اس کی بازو تھام کر کہنے لگا۔

''ویرو آج ہم رب سے دعا کریں گے کہ۔۔۔''

ویرو نے بات کاٹتے ہوئے کہا:

''میں بھی آج اسی لیے آئی ہوں۔ بس پھر نہیں آؤں گی۔ آج میں رب سے دعا کروں گی تم بھی میرے لیے دعا کرنا'' اور ویرو نے اپنے چہرے پر بہہ رہی آنسوں کی دھار کو پونچھتے ہوئے کہا۔

''میرا رب معاف کرنے والا ہے وہ مجھے ضرور معاف کر دے گا وہ میری یہ خواہش ضرور پوری کرے گا۔''

''تمہاری کیا خواہش ہے ویرو؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ مجھے اور کیا چاہیے؟ میں تو یہی چاہتی ہوں کہ میں تمہیں بھول جاؤں۔''

''کیا کہہ رہی ہو ویرو؟''

''اب مجھے وہاں جانا ہے جدھر میرے ماں باپ نے میری نسبت طے کی ہے۔ اس لیے میں آج رب سے یہ مانگنے آئی ہوں کہ تمہیں میرے دل سے نکال دے۔''

''ویرو ایک بات کہوں؟''

''کہو۔۔۔''

''اس کی جگہ یہ دعا نہیں ہو سکتی کہ رب سوہنا ہم دونوں کو ملا دے۔''

''نہیں۔۔۔ یہ دعا نہیں ہو سکتی۔ شاید ہو بھی سکتی ہے اگر تم کہو تو۔''

''ہو سکتی ہے تو چل یہ دعا ہی کریں۔''

''چلو۔۔۔ مگر پہلے ایک بات سن لو میری۔ میں جاٹوں کی بیٹی ہوں میرے ماں باپ راضی خوشی مجھے تمہیں نہیں سونپیں گے۔ انہوں نے جاٹو کے گھر ہی میرا رشتہ جوڑا ہے۔''

''پھر؟''

''پھر تو مرزا کی طرح آج رات مجھے نکال کر لے چلو مگر اچھے برے کی میں ذمہ دار نہیں ہوں گی اور اگر تمہیں موت سے ڈر لگتا ہے تو۔۔۔''

''موت سے میں نہیں ڈرتا ویرو مگر۔۔۔''

''مگر کیا؟''

''ہماری مریادہ کے ماتھے پر کلنک لگ جائے گی۔ میں اس عہدے پر ہو کر گاؤں کی لڑکی بیٹی۔۔۔''

''میں نے اس لیے کہا تھا کہ یہ دعا نہیں ہو سکتی چلو اٹھو مہاراج والا کمرہ کھولو۔''

بالکا بھائی نے گرو مہاراج والا کمرہ کھولا اور اپنے کانپتے ہاتھ جوڑے۔ ویرو گرو مہاراج کی حضوری میں کھڑی ہو کر ارداس کرنے لگی۔

بڑی دیر کے بعد ویرو نے آنکھیں کھولیں۔ اپنی دونوں ہتھیلیاں کھول کر اس نے بالکا بھائی کی اُور اس طرح دیکھا جیسے پرساد مانگ رہی ہو۔ اور بالکا بھائی نے اپنے دل کا سارا قرار ویرو کی ہتھیلی میں ڈال دیا۔

ویرو نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا اور بالکا بھائی اندر اندھیرے میں من میں جلے اس چراغ کے پاس کھڑا رہا جس کو مریادہ کی پھونک نے ہمیشہ کے لیے بجھا دیا تھا۔

آنسو

تابش خانزادہ
(لاس اینجلس)

معلوم نہیں اب سے پہلے میں نے اس جانب توجہ نہیں دی تھی یا میرے چھ سالہ بیٹے نے یہ حرکت آج پہلی بار کی تھی۔ دراصل میں نے ابھی اُسے ڈنر کے بعد اپنی پلیٹ کا کھانا ختم کیے بغیر کچرے میں پھینکتے دیکھا تھا۔ مجھے غصّہ تو آیا لیکن اسے ڈانٹنے کی بجائے میں نے کہا، چلو بیٹے میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔ لیکن کہانی تو آپ مجھے سونے کے وقت سناتے ہوتے ہیں ابّو۔ ابھی تو میں نے اپنی پسند کا ٹی وی پروگرام دیکھنا ہے، پھر میں کچھ دیر کے لیے نٹنڈو پر ماریو کھیلوں گا، پھر دانت صاف کروں گا، پھر امّی کے ساتھ سٹوری بک پڑھوں گا، پھر طوبیٰ اور امّی کو چومنے کے بعد آپ کے پاس کہانی سننے آؤں گا۔ مربوب نے مجھے اب سے سونے تک کا تمام شیڈول بتایا تو میں نے اس کی انگلی پکڑ کر اپنے قریب صوفے پر بٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ نہیں، یہ ذرا دوسری قسم کی کہانی ہے، اس لیے ابھی سُن لو۔

ایک تھا غریب لڑکا، بس تمہاری عمر کا ہوگا جو ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک چھوٹے سے کچے مکان کے ایک کمرے میں اپنے پانچ بھائی بہنوں اور ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ کچا مکان کیسا ہوتا ہے، ابّو؟ مربوب نے میری بات کاٹ کر پوچھا تو میں نے بتایا، مکان کی دیواریں اور فرش سنگ مرمر کی بجائے کچی مٹی سے بنے اور مکان فرنیچر سے خالی ہوتے ہیں۔ کیا اُن کے گھر میں قالین بھی نہیں ہوتے؟ اس نے دوبارہ حیرت سے سوال کیا تو میں نے جواب دیا۔ نہیں، بیٹے اُن کے ہاں چٹائیاں تھیں۔ یہ چٹائیاں کیا ہوتی ہیں، ابّو؟ اس نے دوبارہ پوچھا تو میں نے جواب دیا، کھجور کے پتّوں سے بُنی چٹائیاں، غریبوں کا قالین ہوتی ہیں، بیٹے۔ اور ہاں، دیکھو اب تم درمیان میں مت بولنا، اس طرح کہانی کا تسلسل ٹوٹتا ہے۔ جی اچھا، اب نہیں بولوں گا، اس نے مجھے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تو میں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ بالکل تمہاری عمر کا ایک غریب لڑکا تھا، جو ایک چھوٹے سے کچے مکان کے ایک کمرے میں اپنے پانچ بھائی بہنوں اور ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ گھر والوں کی معاشی حالت بہت پتلی تھی، مزدور باپ کی کمائی اتنی نہُں تھی کہ گھر کے اخراجات آسانی سے چل سکتے، اور ماں، بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ کشیدہ کاری سے کچھ پیسے کماتی تھی تب بھی گھر کے اخراجات کی گاڑی بڑی مشکل سے رینگتی تھی۔ کبھی کبھار تو انہیں کھانے کو باسی روٹی کے ساتھ پیاز تک میسر نہیں ہوتے تھے۔ اس نے میری جانب دیکھ کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، لیکن میری نظروں کا مطلب سمجھ کر خاموش رہا اور میں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

ایک روز گرمیوں کی کڑی دوپہر کے وقت اس غریب لڑکے کو بہت زور کی بھوک لگی تو اُس نے اپنی ماں سے کھانا مانگا۔ ماں نے اُسے سفید ململ کا ایک کپڑا دیتے ہوئے کہا، محلّے میں جب کسی کے ہاں مرغی پکتی ہے تو وہ اس کی کھال اُتار کر گھر کے پاس کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیتے ہیں۔ تم گھر کے آس پاس والے کوڑے کے ڈھیروں پر جا کر دیکھو اگر کہیں مرغی کی کوئی کھال پڑی نظر آئے تو اس کپڑے میں لپیٹ کر، کسی کو بتائے بغیر چپکے سے مجھے لا دو، اتنی دیر تک میں تمہارے لیے کھانا تیار کرتی ہوں۔ وہ غریب لڑکا بھاگ کر ایک کوڑے کے ڈھیر سے مرغی کی ایک کھال اُٹھا لایا۔ ماں نے کھال دھوئی پھر نوچ نوچ کر اس کے پر صاف کرنے کے بعد اُسے ایک چھری سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر نمک مرچ کے ساتھ ہانڈی میں ڈال کر لکڑی کے چولہے پر پکایا۔ غریب لڑکے نے باسی روٹ کے ساتھ مرغی کی کھال والا سالن کھاتے ہوئے پوچھا، امّی مرغیاں کون لوگ کھاتے ہیں؟

ماں نے جواب دیا، امیر لوگ کھاتے ہیں، بیٹا۔ لوگ امیر کیسے بنتے ہیں، امّی؟ لڑکے کے معصوم سوال پر ماں نے جواب دیا۔ لوگ پڑھ لکھ کر امیر بنتے ہیں، بیٹا۔ لڑکے نے کہا، اچھا، تو میں پہلے پڑھوں گا، پھر امیر بنوں گا اور پھر آپ کو بہت سی مرغیاں کھلاؤں گا۔

مجھے وہ غریب لڑکا آج اس لیے یاد آیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب مس نے تمہیں اپنی پلیٹ کا کھانا کچرے کی باسکٹ میں پھینکتے ہوئے دیکھا تھا، بیٹا۔ کھانا اللہ کی نعمت ہے، اُسے بِن کھائے پھینک دینا کفرانِ نعمت ہوتا ہے۔

اچھا اب کے بعد نہیں پھینکوں گا، اُس نے وعدہ کیا۔ پھر بولا، اُس غریب لڑکے کا کیا بنا تھا، ابّو؟

میں نے جواب دیا، وہ غریب لڑکا تعلیم حاصل کرنے کے بعد امریکہ چلا گیا تھا۔

وہ حسرت سے بولا، میں نے آج تک کوئی غریب لڑکا نہیں دیکھا، میں کسی غریب لڑکے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

تم اُسے دیکھ رہے ہو، میں نے اس کی جانب اپنی بانہیں وا کرتے ہوئے کہا، میں وہ غریب لڑکا تھا، بیٹے۔ مربوب میری بانہوں کے ہالے میں رونے لگا اور میں نے بھی اُس کے سامنے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کتابیں

اپنی کتابیں دوسروں کو نہ دیں کیونکہ وہ آپ کو واپس نہیں کریں گے۔
میری لائبریری میں وہ کتابیں ہیں جو مجھے دوسروں نے دی ہیں۔

اناطول فرانس

گلشن کور

دیوی ناگرانی (ممبئی)
ترجمہ : عامر صدیقی

اسے میں کیا نام دوں کہانی، آپ بیتی، بیتی یادیں، جگ بیتی یا الفاظ کا بنا ہوا نازک رشتوں کا ایک جال کہوں، جو حالات کے مدنظر اپنی سہولت کے حساب سے بُن لیا جاتا ہے یا ادھیڑ لیا جاتا ہے۔ جب گلشن کور سے اسکی یادوں کی چادر میں ٹانکے ہوئے ان ستاروں کی بات سنی تو سوچا خوشی غمی، جدائی ملن کے اس جذباتی سنگم کو لفظوں کی زبان دوں۔ اس کی داستان سنتے ہوئے دل میں یہی آیا، کہ جیسے رشتے ناطے، سوداگر کے سودے ہو گئے ہیں، بکاو یا خریدے ہوئے۔ بکاؤ جس کا ناطہ خریدار کے ساتھ بن جاتا ہے یا یوں کہیں بندھ جاتا ہے، کیونکہ وہ مالک ہوتا ہے اور خریدے ہوئے وجود کا اصلی حقدار، ہر معاملے میں اسے استعمال کرنے کا حق اسے حاصل ہوتا ہے، کام لینے کا، اپنے ارمانوں کو پورے کرنے کا، ہر طور سے استعمال کرنے کا!

اور اسی دور میں۔۔۔ زمین کی دراڑوں کے ساتھ دلوں میں دراڑیں پڑتی رہیں، بڑھتی رہیں، چوڑی ہوتی رہیں۔ ہندو، سکھ، مسلمان، سبھی ایک دوسرے کے دشمن بن گئے، لوٹ مار کا کہرام برپا ہوا، جس میں قربان ہوتی رہی عورت کی عصمت۔ کھلے میدانوں میں بے سہارا، بے چھت لوگ بیٹھے ہوئے دیکھے جاتے۔ ایک ملک اب دو ممالک میں تقسیم ہو چکا تھا۔ سامراجی ہم آہنگی کے نام پر جیسے ایک دوسرے کو مار کاٹ کے، اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے ہوں۔

ایسے وقت میں۔۔۔ زرینہ آپا کے منہ سے سنا کہ مسلمان گھرانے کی ایک لڑکی کی شادی میں ناچ گانے میں بھنگ ڈالتے ہوئے کچھ سکھ تلواریں لے کر ٹوٹ پڑے، یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کس کا سر کدھر گرا، اور کس کا دھڑ کدھر۔ بس خون کے تالاب بہہ چلے۔

ایسے میں۔۔۔ مائیں چیختی، بلکتی رہیں اور کچھ تو اپنے بیٹوں کو دودھ کی قسم دے کر خود کو مار ڈالنے کے لئے مجبور کرتیں یا انہیں کسی کنویں میں پھینک دینے پر زور دیتیں۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ مسلمان بھی سیخ پا تھے اور ان کو قتل کرتے ہوئے یہ نہیں جانتے تھے کہ انکے وار کے سامنے کون آیا؟ سکھ ہندو یا ان کا ہی کوئی مسلمان بھائی۔ سکھ عورتوں کو گھر سے گھسیٹ کر زیادتی کے بعد گھر کے افراد کے سامنے ہی، تمام کر دیا جاتا۔ ایسے دردناک اور دل دہلا دینے والے مناظر کو دیکھ کر کوئی کیا کرتا، کیا بولتا؟ فقط درد کو دل میں دبا کر، آج نم آنکھوں سے وہی تماشائی اپنی آپ بیتی کی دردناک داستان سناتے ہیں!

''ہاں تو گلشن بٹیا، آنکھوں دیکھے حالات کا منظر تھا، لیکن آنکھ رونا بھول گئی۔ منہ میں آواز گھٹ کر رہ گئی۔ اف کرنا قیامت بن جاتا تھا۔ دیس کی فصیلیں پھلانگنا آسان، لیکن دلوں کی بہت ہی مشکل ہو گئی تھیں ان دنوں!''

''لیکن آپا، ایسی حالت میں آپ سرحد کے اس پار سے اِس پار کیسے آئیں؟'' گلشن کور نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو خوفزدہ انداز میں گھماتے ہوئے پوچھا۔

اب وہ اتنی بھی چھوٹی نہ تھی، اسے کچھ کچھ یاد آجاتا کہ وہ کس طرح ان سب حالات سے بچ بچا کر اپنی چاچی سرجیت کور اور دیگر لوگوں کے ساتھ امرتسر میں آکر بسی اور بچپن سے آج تک یہیں رچ بس گئی ہے۔ انکا کیا ہوا جو اپنوں سے بچھڑ کر پیچھے رہ گئے۔ اختصار سے پوچھنے کے باوجود زرینہ آپا کی بیان بازی نے تو کئی وارداتوں کو زندہ کر دیا تھا۔

پھر بھی۔۔۔ گلشن کور متجسس تھی، یہ جاننے کے لئے کہ یہ زرینہ آپا آخر کون ہے؟ اور دونوں سے انکے یہاں ایسے نکی ہوئی ہے، جیسے کوئی نزدیکی رشتے دار ہو۔ پر یہ ممکن کسی حال میں نہ تھا۔ اسکا پہناوا، بات چیت کا لہجہ، امرتسر کے کسی بھی عام آدمی سے مماثلت نہیں کھاتا تھا۔ سرجیت چاچی نے ایک آدھ بار اڑتے اڑتے، ان کے پڑوسی ہونے کے ناطے ذکر کیا تھا۔ اور یہ بھی ٹھیک سے نہیں بتایا کہ وہ کون ہے، کس کی تعلق دار ہے؟ سبھی سوال دل کے کسی کونے میں سہمے سہمے سے تھے۔۔۔!

ایک بات جو واضح طور پر سامنے تھی، وہ تھی چاچی کے آنچل کا پیار دلار، جسے پا کر گلشن ایک کلی سے پھول کی طرح کھل اٹھی تھی۔ ایک آدھ بار لوگوں کو کہتے سنا تھا، ''گلشن کور کا حسن، کچھ الگ رنگ لئے ہوئے ہیں۔ کسی امیر گھرانے کی امیر زادی کا جلوہ ہے اسکے انداز میں، اسکی آن میں، اسکی بان میں۔'' تب وہ کچھ بھی نہیں سمجھی تھی، ان باتوں کا مفہوم۔

''گلشن بٹیا، تم مجھے ''آپا'' نہ کہا کرو، تم ''دادی جان'' بھی کہہ سکتی ہو۔''

''لیکن ایسا تو۔۔۔۔''

بات کو درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے زرینہ آپا نے کہا، ''رشتوں کی بات نہیں میری لال پری! میری عمر اور ان چاندی جیسے بالوں کو دیکھتے ہوئے ''دادی'' کہنا، کہلوانا جائز بنتا ہے۔ اور تم بھی تو میری پوتی کی عمر کی ہو، اسی لئے کہہ رہی تھی۔''

''اچھا آپا، آپ اپنی اس پوتی کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے آئیں؟ کیا اسے وہیں غیروں کے درمیان رہنے کے لئے چھوڑ آئیں؟ کیا نام ہے اسکا؟''

پل بھر میں گلشن نے ان گنت سوال، زرینہ آپا کے سامنے دھر دیئے۔

ایسے میں۔۔۔ کیا کہتی زرینہ آپا، کیا بتاتی وہ؟ کیسے اپنا سینہ چیر کر کہتی کہ۔۔! ایک ایسا سچ جو نہ اگلتے بنتا تھا، نہ نگلتے۔

''آپ بتائیں نہ آپا، اسکا نام کیا ہے؟ وہ کہاں ہے؟ چاچی نے ایک دو بار آپ کا اور انکا ذکر ادھورے لفظوں میں زرینہ بانو کے نام سے کیا ہے۔ بہت یاد کرتی ہے وہ آپ کو۔'' کہہ کر گلشن، زرینہ آپا کی طرف دیکھنے لگی۔

اور جیسے نیند سے جاگ اٹھی زرینہ آپا! زرینہ بانو کا ذکر سنتے ہی ہڑبڑا کر بول پڑی، ''گلشن۔ اسکا نام ہے گلشن بانو، ارے۔۔۔ سارا بانو ہے!''

''سارا بانو، کتنا سندر نام ہے آپا۔۔۔ کہاں ہے وہ؟'' کہتے ہوئے

گلشن کور نے زرینہ آپا کی چنری کو ہلکے سے یوں لہرایا کہ چنری سر سے اتر کر اسکی چھاتی پر آ ٹھہری، جو دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔

''وہ اب جانے کہاں کھو گئی ہے بٹیا، اسکو تلاش کرتے ہوئے میں اس دیس کو چھوڑ کر اس دیس میں آئی ہوں۔''

''کیا مطلب۔۔۔آپا؟ آپکی سارا بانو کیا سچ میں کھو گئی ہے؟''

''ہاں بٹیا، اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری عمر کی کمر دوہری ہو گئی ہے۔سات سال وہاں پاکستان کی گلی گلی کی خاک چھانی، پر وہ نہیں ملی۔''

''سات سال سے آپ اسے ڈھونڈ رہی ہیں؟ اب وہ کتنے سال کی ہوئی ہوں گی آپا؟''

گلشن کور کے آواز میں کھلبلی سی مچی تھی۔سوالوں کا سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا۔

''یہی کوئی پندرہ سولہ سال کی ہوئی ہوگی میری بچی، کچھ تجھ جیسی، تیری عمر کی! ماں کا آنچل چھوٹا تو میں نے گود میں سمیٹ لیا۔لیکن اب، جب اللہ میاں کے پاس جاؤں گی تو کیا جواب دوں گی اسکی ماں نور بانو کو۔۔۔'' کہتے ہوئے زرینہ بانو اپنی چھاتی پیٹنے لگی۔

تقسیم کے زمانے میں جھیلی گئیں، اذیت بھری یادیں، وقت بیوقت جب بھی ذہن میں کوندتی ہیں، تب وطن میں بھی بے وطنی کا احساس زندہ ہو اٹھتا ہے۔جب خون پکارنے لگتا ہے، تب اپنے لوگ زمین کی جڑوں سے اکھڑ کر بے درد ہواؤں کے رخ کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔جیسے زرینہ بانو اپنی پوتی کی یادوں کی ڈوری تھامے، اچانک امرتسر آن پہنچی، بغیر کسی اطلاع کے۔۔۔! سرجیت کور اسے دیکھ کر زرد پتے کی طرح سہم گئی، جیسے بہار میں خزاں کی کوئی آہٹ سن لی ہو۔آنکھوں سے نیند نادردی ہو گئی۔ایک نامعلوم ڈر اسکے دل کے کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔وہ زرینہ بانو سے آنکھیں چرانے لگی، اس سے کترانے لگی۔اکثر سامنا نہ ہو اس لئے زیادہ وقت گردوارے میں گزارتی۔گھر میں رہ جاتے دو افراد، زرینہ بانو اور گلشن۔

اس بات کا احساس زرینہ بانو کو بھی ہوا۔تبھی چرمراہٹ کی آواز سے دروازہ آنگن کے اندر کھلا اور سرجیت کور گردوارے کی سیوا سے نجات پا کر گھر لوٹی۔گلشن کور، چاچی کو دیکھ کر اٹھی اور اسکے ہاتھ سے لنگر سے لائے ہوئے پرساد کے ''دونے'' اور کھانے کا سامان لے کر رسوئی میں جاتے جاتے کہنے لگی۔

''چاچی کھانا پروس دوں، آپا بھی صبح سے بھوکی بیٹھی ہیں، صرف چائے پر ٹکی ہوئی ہے اور اپنی کھوئی ہوئی پوتی سارا بانو کے درد کی داستان بتا بتا کر بے سدھ ہوئے جا رہی ہیں۔''

''گلشن بیٹی، دو طشتریوں میں پرساد بانٹ کر تم دونوں کھا لو۔میں وہیں کھا کر آئی ہوں۔'' کہہ کر سرجیت کور، وہیں کھٹیا پر کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹنے لگی۔

گلشن نے کھانا پروس کر لانے سے پہلے ایک ہلکی سی رضائی چاچی کے تھکے بدن پر پھیلا دی۔چاچی کا دل اسے دعائیں دیتا ہوا نیند کی آغوش میں جانے لگا۔دوپہر کے دو تین بج رہے تھے، نیند تو آنی ہی تھی۔۔۔!

لیکن ایسا چاہ کر بھی نہ ہوا۔سرجیت کور نے آنکھیں تو بند کر لیں، لیکن بند آنکھوں میں جو سائے تیر آئے، ان سے اسکا بدن تھرا اٹھا تھا۔یہ تو بھلا ہو گلشن کا جو اس پر رضائی کی تہہ چڑھا گئی، لیکن یادوں کے نکیلے بھیدی، جو آنکھوں کی نیند چگ رہے تھے، انہیں کون سمجھائے! ماضی کے سائے صدا بن کر کانوں میں گونجنے لگے۔سات آٹھ سال پرانے عکس، سندھ سے ہند میں آنے کی تیاری والے ماحول کو پھر سے زندہ کرنے لگے۔

''ارے سرجیت بہن، ہم سالوں سے پڑوسی بن کر رہے ہیں۔ایک دوسرے کے مائی باپ ہی ہیں۔بس اب نگوڑے وقت نے فاصلے بڑھا کر ہمیں پچھاڑنے کی ٹھان لی ہے۔''

''ہاں زرینہ بیگم یہ تو ہے۔اب کے بچھڑے تو جانے پھر کب ملیں گے، ملیں گے بھی یا نہیں، کون جانے؟ سردار نے تو کل صبح سویرے ہی نکلنے کی ٹھانی ہے۔پاکستان کی بارڈر پھلانگ کر بھارت بس جانے کی بات بنی ہے۔صبح ہم دونوں ہی نکل جائینگے۔تم سے بھی شاید ہی مل سکیں، اسے ہی آخری ملاقات سمجھنا۔''

اتنا کہہ کر سرجیت، زرینہ بیگم کے گلے لگ کر اپنے آنسو قمیض سے خشک کرنے لگی۔

''نہیں نہیں سرجیت، یوں نہ کہو، ہمیں ملنا ہے، بچھڑنا نہیں۔تمہیں میری ایک امانت اپنے ساتھ لے جانی ہے۔اس وقت میرا یہاں سے ہلنا محال ہے۔''

''سرتاج کی باندی جو ہوں۔اپنی مرضی سے جا نہیں سکتی، لیکن میری گلشن بانو کو تو تُو اپنی بنا کر ساتھ لے جا سکتی ہے۔اسکی تو ماں نہیں ہے، اب تُو ہی اسکی ماں بن جا اور میرے جگر کے ٹکڑے کو اپنے گھر آنگن میں جا کر روپ دینا۔اگر زندگی نے وقت اور موقع دیا تو ضرور ملیں گے۔اب چلتی ہوں۔''

''پر زرینہ بیگم۔۔۔میں ہندو۔۔تو۔۔۔''

''ارے بس بھی کر، کہا نہ وہ تیری ہے۔تو جو چاہے اسکا کر۔اپنا نام دے یا نیا نام کرن رکھ، اسے اپنے ساتھ لے جا یا یہاں مرنے کیلئے چھوڑ جا، یہ تیری مرضی ہے، میری نہیں۔۔۔'' کہتے ہوئے زرینہ بانو، ہوا کی رفتار سے گھر سے باہر نکل گئی۔

اور پلک جھپکتے رہ گئی سرجیت کور اپنے ہی گھر میں، ویران دیواروں کے درمیان، تھرتھراہٹ محسوس کرتے ہوئے، ایک لرزش بھرا احساس محسوس کرتے ہوئے۔وہ بے اولاد تھی، لیکن سینے میں ممتا نہیں تھی، ایسی بات نہیں تھی۔بس ڈر تھا کہ ذات پات کی دیواریں کہیں اس رشتے کو اونچ نیچ کے ترازو میں نہ تول بیٹھیں۔مذہب کی قربان گاہ پر گلشن بانو کے معصوم بچپن کو کہیں کوئی آنچ نہ آ جائے۔ماحول ہی ایسا تھا کہ۔۔۔سکھ اور مسلمان اک دوسرے کے کٹر دشمن ہو گئے تھے۔بات بات پر تلواریں چمکتیں اور درد، چپ سادھے، سسکتا رہتا ان سنے ہوئے خون کے دھبوں کو دیکھ کر، جو ایک ہی رنگ کے تھے۔سرخ! سبھی کا خون لال ہے تو کیوں کسی کے درد سے خون میں ابال نہیں آتا؟ کیوں درد کو دیمک لگی ہے کہ دیکھ کر بھی کسی کا دل نہیں پسیجتا؟ کیوں انسانیت اپنے آپ کو یتیموں کی جانب دھکیل رہی ہے۔

کھاٹ پر لیٹی سجیت جانتی تھی کہ رضائی تو صرف بدن کو ڈھانپ

رہی تھی، اسکا دل تو کل کے فسادات کی نیلی یادوں سے تار تار ہوا جا رہا تھا۔۔۔!

''اری سرجیت کور، تو کیوں سوئی ہے؟ دن کی روشنی کو رات کی کالک سمجھ بیٹھی ہے کیا؟ اٹھ، تیرے آنگن میں اجالا اب بھی باقی ہے۔ ساری کی ساری تاریکیاں میں نے اپنے آنچل میں سمیٹ لی ہیں!'' کہتے ہوئے اس نے درد بھری آواز میں گلشن کور کی جانب دیکھتے ہوئے ایک حکم دیا۔

''ارے بیٹا گلشن، تین طشتریوں میں کھانا بانٹ لینا۔ تیری امی سرجیت بھی ہمارے ساتھ کھائے گی۔ آج کا دن ملن کا جشن ہے، دھرتی آسمان سے مل رہی ہے! ہاں۔۔۔ آجا تو بھی آجا۔ سرجیت تو بھی اٹھ۔''

اب گلشن کو رسوچ کے دریا میں بہنے لگی۔ وہ حیرانی سے زرینہ آپا کے کہے گئے الفاظ سے، کسی ادھیڑ بن میں الجھ گئی، جس میں پیار بھی تھا، دلار بھی، درد بھی اور دوا بھی! سرجیت کور سے بھی نہ سہا گیا نہ رہا گیا، اٹھ کر کھاٹ پر بیٹھی اور بھی نم پلکیں اٹھا کر زرینہ بانو کی طرف دیکھنے لگی۔ گہرائی تک اسکی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرنے لگی تھی کہ زرینہ بانو کیا واقعی ملن کا جشن منانے کی بات کر رہی ہے یا اسکے بعد کی جدائی کا اعلان کر رہی ہے؟ زمین آسمان کے ملن کی بات وہ چاہ کر بھی سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ۔۔۔ زرینہ بانو کی پوتی گلشن بانو کو جب دونوں میاں بیوی اپنے ساتھ امرتسر لے آئے تو سردار نے سبھی سے کہا کہ وہ انکے بھائی کی بیٹی ہے، گلشن کور۔ کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ انکی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور پھر گردوارے میں نام کرن کے اعلان سے انکے سونے بنجر سینے میں جیسے شبنم کی نمی برسنے لگی۔ ممتا کا آنگن پھلنے پھولنے لگا، گلشن کو سینچتے سینچتے اس خوشبودار پھول کی مہک انکے دلوں میں رچ بس گئی۔

''میں آپ کو امی کہہ کر پکاروں گی اور انہیں بابا کہہ کر۔ یہ چاچی کہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' گلشن کور نے ضد کی۔ عمر بھی تو ایسی تھی، سات آٹھ سال کی۔

''نہیں تم مجھے چاچی ہی کہو گی۔ تمہاری آواز میں مجھے چاچی کہنا، امی جیسا ہی لگتا ہے۔ سردار کو بھلے تم بابا بلاؤ سرجیت نے دلیل دے کر اپنے طریقے سے گلشن کو منا لیا۔ اس کا ایک سبب تھا، جو دل میں ڈر بن کر سما گیا تھا۔

ڈر یہی تھا۔۔۔ کبھی نہ کبھی تو حالات بدلیں گے، وقت بدلے گا اور خون اپنا رنگ دکھائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو گلشن پھر سے زرینہ بانو کے گھر کا گلشن بنی، تو وہ یقیناً خزاں کے سوکھے پتوں کی طرح چرمرا جائے گی۔

اور پھر موسموں کا روپ دھار کر دن، مہینے سال گذرنے لگے۔ تین سال کے بعد گلشن کے بابا پرلوک سدھارے اور سرجیت نے گلشن کی سسکیوں کو سینے میں سنجویا، اسے دوگنا پیار دلار دیکر وہ گرو کی شرن میں آن بسی۔ گردوارے کو دوسرا گھر بنا لیا۔ دن رات دن کی سیوا اسکی آرادھنا بن گئی۔ یہ دیکھ کر پنچوں نے گردوارے میں ہی اسے ایک کمرہ دے دیا، جہاں دونوں ماں بیٹی مناسب رہن سہن اور حفاظت کے ساتھ زندگی گزارنے لگیں۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں کے سائے دار لمحات کے درمیان، گلشن بھی اب بچپن سے جوانی کے چوکھٹ پر آ کھڑی ہوئی۔ سولہ سال کی ہوتے ہی کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔

اور ایک دن اچانک۔۔۔ زرینہ بانو کا خط سرجیت کور کے نام گردوارے کے پتے پر ملا، جس کے مطابق، وہ اس سے ملنے کچھ سکھوں کے ساتھ اسی گردوارے میں آ رہی ہے۔ سرجیت کی سیواؤں کی مہک کسی سرحد کی محتاج نہ تھی۔ اور اکثر اسکی شہرت امرتسر کے اس گردوارے کے ساتھ منسلک رہتی۔ زرینہ بانو کا دل گواہی دیتا رہا کہ یہی اسکی گلشن بانو کی ماں ہے۔

ماضی کے گلیاروں سے ہوتی ہوئی سرجیت کور کی یادوں کی پرچھائیاں، اسے حال میں لے آئیں۔ زرینہ بانو کی آواز ایک خوشنما خبر کی طرح ہوا کی ترنگ بن کر لہرا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کھاٹ پر بیٹھی اور زرینہ بانو کی جانب بھیگی پلکوں سے دیکھتی رہی۔

زرینہ بانو نے ایک شوخ مسکراہٹ کے ساتھ کھانے کی طرف اشارہ کیا تو سرجیت کو جیسے ہوش آیا۔

''گلشن بیٹی روٹی تو لے آئی ہو، لیکن دال اندر ہی بھول گئیں۔ کیا اپنی آپا کو روکھی روٹی پروس دو گی؟'' کہتے ہوئے سرجیت کور اپنی کھاٹ سے اٹھ کر زرینہ کے برابر بیٹھ گئی۔

''اری دیا۔۔۔'' کہتے ہوئے گلشن کور، رسوئی گھر کی طرف بھاگی۔

''سرجیت اب چلو، اب نوالے ادلا بدلی کرو اور جشن مبارک کو انجام دو۔'' کہتے ہوئے زرینہ بانو نے پہلا نوالہ گلشن کور کے منہ میں ڈال دیا اور دوسرا سرجیت کور کے منہ میں۔ سرجیت کور اور گلشن نے بھی وہی رسم نبھائی۔ اس خوشی کے سامنے درد کی لمبی چوڑی فصیلیں بونی ہو گئیں!

سبھی کے چہروں پر مدھر مسکان دکھنے لگی۔

''اری سرجیت ایک بات تو بتا، جتنا سندر نام گلشن کور تو نے اسکا رکھا ہے، اسکے سامنے تو اسکا حسن بھی پھیکا پڑ رہا ہے۔''

''ہاں زرینہ بیگم، اس پار کے گلشن کا رنگ، اس پار کی گلشن کے حسن کے سامنے پھیکا ہی پڑتا ہے۔ اس پار کے اس گلشن کی خوشبو میری سانسوں میں کچھ یوں بسی ہے کہ اب لگتا ہے کہ اسکے بنا بھی کیا کوئی زندگی ہو گی؟'' اور وہ اپنی کہی ہوئی بات کا رنگ زرینہ بانو کی آنکھوں میں دیکھنا چاہ رہی تھی۔

''خوش نصیب ہو سرجیت کور، اس کی پرورش میں تم نے اپنے واہ گرو کی کل کل بہتی گربانی بھی گھول دی ہے۔ ہاں گلشن کور سچ میں تیرے آنگن کا پھول ہے، جو ہر مذہب سے پرے، سچ کی پناہ میں پنپ رہا ہے۔'' کہہ کر زرینہ آپا نے گلشن کور کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

''زرینہ بانو۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔'' سرجیت روہانسی ہو گئی

''ارے جشن مبارک کے بعد ایسے آنسو نہیں بہاتے پگلی۔ یہی واہ گرو تمہارا مالک ہے۔ میں اگلے ہفتے ''سرتاج'' کی پناہ میں چلی جاؤں گی۔ تم گلشن کور کے ساتھ، خوش رہو، آباد رہو۔'' زرینہ بانو نے سرجیت کو گلے لگا لیا۔

''دادی جان۔۔۔ آپ کچھ دن اور رک جائیں ہمارے پاس۔'' گلشن کور کے اس کومل جملے نے زرینہ بانو کو گدگدا دیا۔ اس جملے میں رشتوں کی مہک تھی، اور اپنائیت کا احساس تھا، جسے وہ جینا چاہتی تھی، بُنجونا چاہتی تھی۔

یادوں کے گھاؤ

شیخ بشیر احمد
(سری نگر)

کچھ دیر بعد وہ اپنے کمرے میں اسی جگہ آ کر بیٹھ گیا جہاں وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھنے کا عادی تھا۔ سامنے اس کے ایک چھوٹا سا لکڑی کا صندوق تھا اور اس پر قلم دان کے علاوہ کاغذ کا ایک پلندہ بے ترتیب بکھرا پڑا ہوا تھا۔ کمرے میں رقت آمیز ماحول تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے دیواروں سے مایوسی اور وحشت ٹپک رہی ہو۔ دفعتاً صندوق پر پڑے کاغذ کے اوراق خود بخود پھڑ پھڑانے لگے۔ قلمدان میں قلم جنبش کرنے لگا۔ وہ ایک عجیب مخمصے میں پڑ گیا۔ بدحواس ہو کر ایک لمحہ میں نہ جانے وہ کتنی باتیں سوچ گیا۔ کچھ دیر بعد اس جانی کیفیت سے باہر نکل آیا تو اسے بیوی کی دائمی جدائی کے غم کے ساتھ اپنی معشوقیہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ تب اچانک اس کا دیا ہوا وہ نام جو اس کی بیوی نے اسے ایک عرصہ پہلے اس کی کہانی کے لیے عنوان تجویز کیا تھا یہ دیکھ کر اس کا چہرہ کملایا اور وہ سوچ میں پڑ گیا کہ ایک مدت سے اس نے اس کی زلفوں کی چھاؤں میں اتنا نام نمو کمایا تھا۔ جتنا برسوں میں کوئی اس کا ہم عصر کما نہیں پایا تھا مگر یہ سوچ کر اس کے دل پر ایک ہلکی سی چوٹ لگی کہ اتنا کچھ پانے کے باوجود بھی اس نے زندگی کا جو خاکہ اپنے ذہن میں ترتیب دے رکھا تھا اور جب ان نامکمل خاکوں کو رنگ بھرنے کا موقع قریب آیا تبھی وقت نے اچانک ایسا پلٹا کھایا کہ اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ سارے سپنے اور خواب بکھر گئے اور زندگی کی بساط الٹ کر رہ گئی جس کی کسک میں وہ ساری عمر جلتا رہے گا۔

جانے وہ کس آب وگل سے بنی تھی۔ زیادہ لکھی پڑی نہ تھی مگر اس کی شخصیت بڑی دل نواز تھی۔ دراز قد، سپاٹ گول چہرہ، کالے خوبصورت فریم کی دبیز شیشوں والی عینک سے جھانکتی ہوئی بادامی آنکھیں جن میں تمناؤں کا ایک سمندر تھا اور حسرتوں کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

بھلا مصیبت کی گھڑی میں وہ اس واقعہ کو بھول کیسے سکتا جو اتنی مدت کے بعد بھی اس کے ذہن میں تازہ تھا جب اتفاق سے ایک روز وہ اس کے کمرے میں آئی تو باتوں باتوں میں اس نے اندازہ کر لیا کہ وہ اس کے سوا اور کسی کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے اور ایک عرصے سے ان کے درمیان معاشقہ چل رہا ہے۔ یہ سوچ کر وہ احساس کمتری کا شکار ہوئی اور نہ ہی اس کے دل میں کوئی گرہ پڑی۔

وقت کا پہیہ چلتا رہا۔ اس نے ان کے میل ملاپ کو کوئی اہمیت نہ دی اور نہ ہی ان کے پیار میں حائل ہوئی۔ حالانکہ وہ عورت ذات تھی اور اپنے ہوتے ہوئے کسی سوتن کو برداشت کیسے کر سکتی تھی اور پھر اس کے پیار و لگاؤ پر اس کا غصہ کرنا بجا تھا مگر وہ سمجھدار تھی۔ اس کے اطوار میں کوئی فرق نہ آیا اور نہ ہی اس پر اپنی محبت لوٹانے میں کوئی تبدیلی لائی۔ جبکہ اس کی خواہش پوری کرنے کے لیے اسے جینے کا حوصلہ دیتی رہی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اپنی آرزو اور اپنے پیار کو پانے کی خواہش میں کہیں اس کا خواب ادھورا رہ گیا تو اس کا وجود بھی برقرار نہیں رہ پائے گا۔

یوں وقت گزرتا رہا۔ رفتہ رفتہ دن، مہینوں، سالوں میں بدل گئے اپنے ادھورے خواب کی تکمیل میں وہ ایک کے بعد ایک کامیابی حاصل کرتا رہا اور اتنا آگے بڑھ گیا کہ اس کی کامیابی پر اپنے پرائے کو رشک آنے لگا۔

پھر جب پہلی بار اچانک وہ اس کی معشوقیہ سے ملی تھی تو اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس کا ماتھا چوما اور سینے سے لگا لیا تھا۔ پھر بے تکلف ہو کر اس کی انگلیاں دھیرے دھیرے اس کا بدن چھونے لگی تو چند لمحوں کے بعد وہ آنکھوں میں شوخیاں بھر کر بولی تھی۔

یقین نہیں آ رہا ہے کہ اتنے برسوں کے بعد آج یہ موقع مجھے نصیب ہوا کہ میں اس سے ملی اور اس کا آپ نے تعارف کرایا۔ دل میں جو شک کا کیڑا کبھی کبھی تنگ کر رہا تھا اس کے کاٹنے سے نجات مل گئی۔ اتنی خوشی ہوئی ہے کہ "یادوں کے گھاؤ" اسے اس خوبصورت نام سے نوازوں۔

یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا اور اس کی ہر بات کان لگا کر سنتا رہا۔ ساتھ ہی اسے لگا کہ جیسے وہ برسوں پرانا دل کا غبار نکال کر ہلکا ہونا چاہتی ہو۔

"پہلی بار میں کچھ اور ہی سمجھی تھی عورت ذات ہوں نا غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ تو صرف ایک جنون ہے برسوں سے آپ نے پال رکھا ہے۔ آپ شہر کے معروف کہانی نویس ہیں جس نے لکھنا پڑھنا اپنا بچھونا بنایا ہے اور افسانوں اور کہانیوں کو اپنا معشوقیہ۔۔۔ مجھے تو اسی پل اس پر پیار آنے لگا جب پہلی بار اسے دیکھا تھا" یہ کہتے ہوئے اس کی انکھیں ہنس پڑیں۔

پھر جیسے ہی اس کے ذہن میں معشوقیہ کی یاد مان پڑی تو اچانک بیوی کی یاد آئی۔

چند دن پہلے کا ایک واقعہ رہ رہ کر اس کے ذہن میں بجلی کی مانند کوند رہا تھا جسے یاد آتے ہی نہ جانے کیا سوچ کر ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ اس میں اپنی انکھوں کو مسل کر چھت کی جانب دیکھا اور اسے یاد آیا۔

ظہر کا وقت تھا اور پاس کی کسی مسجد میں لاؤڈ سپیکر پر آذان ہو رہی تھی۔ جسے سن کر اس نے مسجد جانے کا ارادہ کر لیا اور اٹھ کھڑے ہو کر اپنے کمرے سے باہر نکل آیا جو ہی برامدے میں اپنا پہلا قدم رکھا تو اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

برآمدے میں وہ دیوار کے ساتھ پشت لگائے اور اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھائے کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ لگا کہ جیسے خدا سے دعا مانگ رہی ہو۔

"یا اللہ! تو بڑا رحیم و کریم اور بڑا کارساز ہے تو مجھ پہ اپنا رحم فرما"

اس کی آواز میں دھیما پن اور تھکان جھلک رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس نے ازراہ مذاق مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے؟ آج تمہیں خدا بہت یاد آ رہا ہے۔''

اس کی بات سنتے ہی وہ خاموش ہوگئی لیکن وہ خاموش نہیں ہوا۔

''چہارسُو''

دوبارہ ہمدردی جتاتے ہوئے بولا۔

''یوں اس طرح تمہارا یہاں بیٹھنا زیب نہیں دیتا کوئی دیکھے تو کیا سمجھے گا۔''

مجھے یہاں بیٹھنے کا کوئی شوق نہیں معدے میں تیزاب جمع ہونے سے بے چینی سے محسوس کر رہی ہوں اور جی متلانے لگا ہے۔ متلی آنے کے خوف سے یہاں بیٹھی ہوں کہ یہاں سے باتھ روم جانے میں بھی تکلیف نہ ہوگی۔

یہ کہتے ہوئے اس نے بڑی بیچارگی سے اس کی جانب دیکھا اور اپنی پلکوں پر ائے آنسوؤں کو مسکراہٹوں میں چھپانے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس کی افسردگی جیسے کچھ بیان کر رہی تھی۔

آپ پریشان نہ ہوں خدا نے چاہا تو ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ تب تک آپ نماز پڑھ کر آئیں اور اپنی دعاؤں میں مجھے یاد کر لیں۔

اس کے دل میں آیا کہ اس سے کہہ دے ''رہنے دو اپنی اس بے تکی بات کو تجھے دعاؤں میں شامل نہ رکھوں تو کسے رکھوں گا'' مگر اس کے منہ سے کوئی بات نکل نہ سکی صرف بدبدا کر رہ گیا۔

یہ سننے سے پہلے ہی وہ اداس من لیے گھر سے نکل پڑا۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ جب قسمت بگڑ جاتی ہے تو زندگی کے معمولات بگڑنے میں وقت نہیں لگتا۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ مسجد سے گھر لوٹ آیا تو چاروں جانب کچھ عجیب سا ماحول تھا جو اس کے لیے ناقابل قبول تھا اور اس کا ذہن یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ وہ حیران بنا اسے دیکھتا رہا اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

سامنے بستر پر وہ دنیا و فیہا سے بے خبر دراز پڑی تھی۔ اس کے چہرے کی تازگی کھوئی ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر مہر سکوت لگی تھی۔ اس کی جھکی انکھوں کی چمک ماند پڑی تھی اور پلکوں پر آنسو کے دو قطرے ابھی ابھی لرزاں تھے شاید وہ اس کے اندر چھپی کسی بے بسی کی غمازی کر رہے تھے۔

اس سے یہ رقت آمیز منظر دیکھا نہ گیا اور ساتھ ہی اس کے اس امید کو دھکا لگا کہ کل تک جو ہمیشہ آنکھیں بچھائے اس کی راہ تکتی رہتی تھی آج وہیں اس نے ان پر اپنی پلکوں کی چادر میں چھپائے رکھا تھا۔

اسے ایک نزدیکی ہسپتال میں داخل کر لیا گیا جہاں وہ لگ بھگ ایک ہفتہ تک موت سے جنگ لڑتی رہی۔ ڈاکٹر آتے اور تشخیص کرتے، دوائیں دیے جاتے تھے لیکن اس کی حالت جوں کی توں بنی رہی نہ کوئی افاقہ ہوا اور نہ ہی دوا نے کچھ اثر دکھایا۔

وہ ایک سیاہ بدترین رات تھی اور اس کے لیے دوسری راتوں سے قدر مختلف تھی۔ آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی دیر تک بستر پر لیٹے وہ بار بار کروٹیں لیتا رہا اس کے دل میں کوئی ٹھہرا ہوا خوف مچل رہا تھا جو اس کی بے چینی اور بے قراری کو مزید بھڑکا رہا تھا اور اسے رات بھر سونے نہیں دے رہا تھا۔ مانا کے پچھلی راتیں اس نے خبر گیری میں گزاری تھی اور آج گھر میں سونے کی نیت کی تھی۔

اسی اضطراب میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ لیکن رات کے کوئی دو بج رہے تھے ہوں گے کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ اچانک اس کی نیند ٹوٹ گئی دیکھا اس کے بیٹے کا فون آیا تھا۔ گھبرا کر اس نے پہلے اس کا حال پوچھا۔ پھر اس کی ماں کی خیریت دریافت کی۔ بیٹے نے جواب میں ایسی اندوہ ناک خبر سنائی کہ جس نے اس کے ہوش اڑا دیے۔ آخر اس کی بیوی اس دار فانی سے کوچ کر گئی تھی۔

یکلخت اس کی نظروں میں اپنی بیوی کا چہرہ گھوم گیا جسے وہ از حد پیار کرتا تھا اور اپنے وجود کا ہی ایک انگ مانتا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا اس کے نگاہوں کے سامنے اس کی موت کی پرچھائیاں لرزنے لگی جو زندگی کے جنگ لڑتے لڑتے ہار گئی تھی اور موت کے ویرانے میں کھو گئی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو گیا اور وہ لرز اٹھا۔

اسے لگا جیسے آسمان ٹوٹ کر اس پر گر پڑا ہو اور وہ لڑھک کر نیچے آ گیا اور پھر اسے ہوش نہیں رہا۔ جب ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو کسی سڑک کے بیچ چوراہے پر کھڑا پایا اور اب اس کا سب کچھ اجڑ چکا تھا۔ اس کی زندگی میں اندھیرا پھیل گیا تھا اور اس کے وجود میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا دل دہل اٹھا، آنکھوں سے بے تحاشہ آنسوؤں کا سیلاب نکل پڑا اور اس کی چیخ حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ یکلخت اکیلے پن اور تنہائی کے خوف سے وہ ایک نامعلوم کرب میں مبتلا ہو گیا۔۔۔

دکھ تو اسے صرف اس بات کا تھا کہ زندگی کے آخری پڑاؤ پر وہ اس کا ساتھ دے نہ سکی اور نہ ہی اپنا وعدہ وفا پورا کر سکی۔ زمان کی رات اسے اب تک یاد ہے جب پہلی بار اس نے اس کی صورت دیکھی دیکھتے ہی وہ دنگ رہ گیا۔ ذرق برق لباس پہنے، سر پر دوپٹہ اوڑے اور سونے کے زیورات سے لدی پھندی گردن جھکائے مسند پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر جب اس کا گھونگٹ اٹھایا تو لگا جیسے چودھویں کا چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا ہو۔ فضاؤں میں کیف و مستی کی گھٹائیں سی چھا گئی اور وہ مسحور ہو کر دیکھتا رہا۔ اس کی زندگی میں شامل ہوتے ہی اس نے اپنا سب کچھ اس پر لٹا دیا اور لٹاتی رہی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس کی ہمسفر، ہم خیال، ہم رکاب اور ہم نوا بن گئی۔ اس طرح ایک دوسرے کی قربت پا کر انہیں جو سکھ ملتا تھا اس کا ایک ایک لمحہ ایک ایک پل ان کی راہوں میں پھول کھلاتا رہا۔

چالیس سال کی ساجھی داری کوئی معمولی بات نہیں۔ اتنے برسوں کا ایک طویل عرصہ نہ جانے کیسے دن گنتے گزر گیا کہ انہیں زمانے کی رفتار کا کچھ اندازہ بھی نہ چلا۔ کب ہنستے کھیلتے جوانی گزر گئی کب بڑھاپہ آیا انہیں کوئی ہوش نہ رہا۔ ان کی آنکھوں میں خواب پلتے رہے اور خواہشیں جوان ہوتی گئی اور جب ان خوابوں اور سپنوں کی تعبیر دیکھنا باقی تھی تو اچانک اس کی بیوی کی موت نے اس کی کمر اس قدر توڑ کر رکھ دی کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس اور بیزار ہو گیا۔ اس سے اس کے وجود میں پرانی یادوں کی کیلیں ٹھوک کر اسے تڑپنے کو چھوڑ دیا اور یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ایسے جینے سے تو اچھا ہے کہ موت کو گلے لگا کر ساری الجھنوں پریشانیوں اور مصیبتوں سے نجات پائے مگر جب معصوم بچوں کا خیال آیا تو وہ بے سہارا و بے یارو

مددگار نظر آنے لگے اور ان کے مستقبل کی فکر اسے بری طرح ستانے لگی۔

آج جس جگہ پر وہ چپ چاپ گم سم بیٹھا تھا وہ دور دور تک سارا منظر بھائیں بھائیں کرتا نظر آ رہا تھا اور غم زدہ اداسی ذرا ذرا سے لگ کر اونگھ رہی تھی۔

وہ مُردوں میں لیٹی تھی۔ دور دور تک وہاں نئی پرانی اور شکستہ قبروں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ سامنے ہی اس کی قبر تھی جس میں وہ کئی دن پہلے دفنا دی گئی تھی۔ اس کی قبر پر ایک بڑا کتبہ تھا جس پر ایک قرانی آیت کے نیچے اس کا نام و پتہ اور تاریخ وفات کندہ تھی۔

غمگین اور بوجھل دل لیے وہ کئی گھنٹے وہاں بیٹھا رہا۔ بس چپ چاپ خاموشی سے اس کی قبر کو ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ اس کا دل مضطرب تھا اور دماغ میں جذبات کا ایک تلاطم سا اٹھ رہا تھا۔ یادوں نے اتنا زور پکڑ لیا تھا کہ اس کی یاد مسلسل آ رہی تھی اس کا جی وہاں سے اٹھنے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا۔

شام کا اندھیرا سورج کی آخری کرنوں کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا وقت جیسے ٹھہر سا گیا تھا پھر جب بھاری من لیے وہ وہاں سے اٹھا اور اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی تو اس نے دیکھا کہ رات کا اندھیرا پھیلنے والا ہے اور دور دور تک صرف سناٹا ہی سناٹا ہے۔

سامنے چاروں طرف جو نئی پرانی اور ٹوٹی ہوئی قبریں تھیں ان کے سڑے گلے کتبوں کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ کچھ کتبے اچھی حالت میں تھے اور ان پر طرح طرح کی عبارتیں درج تھیں۔ کسی پر کل نفس ذائقہ الموت اور کسی پر کوئی شعر جیسے ''آئے تھے ہم مثل بلبل سیر گلشن کر چلے۔۔۔ لے لو مالی باغ اپنا ہم تو اپنے گھر چلے'' وغیرہ کندا کیے ہوئے تھے اور کچھ خبریں ایسی بھی تھیں جن کی لحد دب چکی تھی اور اب ان کے صرف وہاں قبروں کے نشان باقی رہ گئے تھے۔

ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اس پر شدت غم سے غنودگی سی طاری ہو گئی۔ اچانک اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور ہلکی سی جھپکی سی سوار ہوئی۔ پھر نیند میں اس نے دیکھا کہ لگا جیسے ساری قبریں ایک ساتھ ہلنے لگی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب شق بھی ہو گئیں اور پھر ان قبروں میں سے کفن پوش نکل کر سب کے سب ایک ہی نعرہ لگا رہے تھے۔ انفسی۔۔۔ انفسی۔۔۔!

یہ دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ ایک ہوکا عالم تھا۔ اسے یہ بات غیر یقینی لگ رہی تھی مگر جب اسے بہت سے بھولے بھالے چہرے دکھائی دیے جنہیں اس نے اپنی زندگی میں دیکھا تھا اور جو نہ جانے کی اتنی طویل مدت کے بعد بھی اب تک ذہن کے گوشے میں ابھی محفوظ تھے۔ اچھا اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس شور شرابے میں اس کی قبر کہیں کھو گئی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں سوچ و فکر کی ویرانیاں اور قدموں میں لغزش پیدا ہوئی۔ وہ قبرستان میں پاگلوں کی طرح اس کی قبر ڈھونڈتا رہا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کی نگاہیں تھک گئیں آنکھیں دکھنے لگی اور دل اچاٹ سا ہو گیا تب بھی اسے اسکی قبر کہیں دکھائی نہ دی۔

مایوس اور تھک کر وہ اب وہاں زیادہ دیر تک رکنا نہیں چاہتا تھا آگے بڑھنا ہی چاہا تھا کہ اتنے میں اچانک ایک کفن پوش عورت کہیں سے نمودار ہو کر دور کھڑی ہوئی۔ اس نے اسے فوراً پہچان لیا ایک لمحہ کے لیے وہ ٹھٹک گیا پھر جو ہی وہ آگے بڑھا تو اس جانی پہچانی عورت نے اسے وہاں پر رکنے کا اشارہ کیا اور مری مری سے آواز میں بولی۔

''وہیں کھڑے رہو میری بات کو غور سے سنو یہ بات کہیں بھول سکتی ہوں کہ ایک عرصہ تک میں تمہاری شریک حیات رہی ہوں۔ مجھے یاد ہے اتنے سالوں میں ایک پل بھی ایسا نہیں گزرا جو میں تمہاری سنگت سے دور رہی مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ یہ جدائی ہمارے مقدر میں لکھی ہوئی تھی۔ اب بہتر یہ ہے کہ تم مجھے بھول جاؤ اور پھر تم اکیلے نہیں۔ گھر میں تمہارے بچے تمہارا انتظار کر رہے ہیں انہیں تمہاری ضرورت ہے۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے بھی ان کی فکر ستا رہی ہے''

یہ کہتے ہوئے وہ خاموش ہوئی اور یکا یک مٹیالے رنگت کے اندھیرے میں کہیں روپوش ہو گئی۔ پھر جیسے ہی چاروں جانب دھند گہرا گئی ایک اندھی آئی اور چلی گئی پلک جھپکتے ہی ایک ایک کر کے سارے ہڈیوں کے ڈھانچے کفن پوش اپنی اپنی قبروں میں اتر گئے اور سارے قبرستان پر دوبارہ ہو کر عالم طاری ہو گیا۔

وہ کچھ سوچے اور کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر قبرستان سے باہر نکل آیا تو ماتھے پر پسینہ تھا دل کی دھڑکنیں تیز اور آنکھوں میں خوف سا مترشح تھا۔

یادوں کے دہکتے آتشدان میں خود کو جلاتا راستے میں چلتے چلتے وہ اس کی یادوں میں کھو کر اندر ہی اندر گیلی لکڑی کی مانند سلگ رہا تھا اور سرچکی کے پارٹ کی طرح چکرا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ خود کو سنبھالتا ہوا جب گھر کی دہلیز پر پہنچا تو اس نے کھڑکی کے شیشوں سے اندر کمرے میں جھانک کر دیکھا وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا جب کمرے میں بچوں کو بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کرتے ہوئے پایا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ کمرے میں آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

اچانک کھڑکی سے ہوا کا ایک ایسا جھونکا کمرے میں آیا جس میں زعفران اور فینائل کی مہک رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ چونک پڑا جیسے گہری نیند سے جاگ گیا ہو۔ اسے لگا پاس ہی کوئی غیر مرئی چیز اس کے گرد منڈلاتی ہوئی اپنا دائرہ تنگ کرنے لگی ہے جس سے نجات پانے کی کوئی صورت اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔

دفعتاً اس کے سامنے صندوق پر پڑے کاغذ کے اوراق خود بخود پھڑ پھڑانے لگے۔ قلمدان میں قلم جنبش کرنے لگا وہ ایک عجیب مخمصے میں پڑ گیا۔ بدحواس ہو کر ایک لمحے میں نہ جانے کتنی باتیں سوچ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس ہیجانی کیفیت سے باہر نکل آیا۔ اس کی اواز بھرا گئی اور آنکھیں ڈبڈبا کر رہ گئیں پھر جیسے ہی اس کی بیوی کی دائمی جدائی کے غم نے اگھیرا تو اس کے ساتھ اپنی معشوقیہ کی یاد بھی تازہ ہو گئی اور اس کا دیا ہوا وہ نام بھی یاد آیا جو اس کی بیوی نے اسے ایک عرصہ پہلے اس کی کہانی کے لیے عنوان تجویز کیا تھا۔ ''یادوں کے گھاؤ''

اچانک کاغذ کھسکنے کی مہین سی اواز اس کا دھیان اپنی طرف کھینچ لیا جسے اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگی ہوں۔ یکا یک اس کے اندر ایک غیر مرئی قوت پیدا ہو گئی اس نے ہاتھ میں قلم پکڑ کر لکھنا شروع کیا اور لکھتا گیا جو کام اس نے ادھورا چھوڑا تھا۔۔۔

'' برگ وثمر ''

سلیم سرفراز
(اسنسول)

دشت سے خاک بہ سر آگئے ہیں
ہم ہیں شرمندہ کہ گھر آگئے ہیں

محفلِ عیش سجی ہے لیکن
ہم یہاں دیدۂ تر آگئے ہیں

جب ہوئی ترکِ سفر کی خواہش
دور اشجار نظر آگئے ہیں

داد بھی کوئی نہیں دیتا ہے
یہ کہاں اہلِ ہنر آگئے ہیں

جب بھی جلنے پہ چراغ آیا ہے
بیچ میں شمس وقمر آگئے ہیں

آشنا کوئی نہیں ملتا ہے
بے خیالی میں کدھر آگئے ہیں

جب بھی چلنے کا ارادہ باندھا
کتنے ہی راہ گزر آگئے ہیں

پھر نہ نکلی کوئی ملنے کی سبیل
ہم اِدھر ہیں وہ اُدھر آگئے ہیں

اب کی رت میں شجرِ دل پہ سلیم
کچھ نئے برگ وثمر آگئے ہیں

○

عظیم بخت
(بھکّر)

اس لیے بھی نوید کوئی نہیں
کیونکہ اب پُر امید کوئی نہیں

جو ہیں شامل ایوان بالا میں
ان کے جیسا یزید کوئی نہیں

ہے عدالت امیر لوگوں کی
مفلسوں کی شنید کوئی نہیں

روٹھ جائے گی ایک دن یونہی
زندگی سے بعید کوئی نہیں

سب مسائل کا حل محبت ہے
اور محبت مزید کوئی نہیں

ہم کو فرصت نہیں محرم سے
ہم غریبوں کی عید کوئی نہیں

○

فیصل امام رضوی
(ملتان)

ہم فقیروں کی بھلا کیا گزر اوقات ہوئی
سو گئے خاک پہ سر رکھ کے جہاں رات ہوئی

گام گام اس کو تلاشا ہے مگر دنیا میں
ویسے چہرے سے دوبارا نہ ملاقات ہوئی

اگلی منزل کا خدا جانے مگر دنیا میں
میں نے جو بازی بھی کھیلی ہے مجھے مات ہوئی

آج بھی خواب میں دیکھا ہے کسی کو روتے
آج بھی خواب میں اک گُل سے مری بات ہوئی

اب تو عادت ہے کہ تنہائی میں رہ لیتا ہوں
خواہشِ محفلِ جاں، گردشِ حالات ہوئی

○

کومل جوئیہ
(ملتان)

حقوق کے لئے یہ خودسری نہیں کروں گی
اے سر کے تاج!! تری منکری نہیں کروں گی

میں تھوک سکتی ہوں شہرت کہ میری عزت پر
جو حرف آیا تو میں شاعری نہیں کروں گی

مجھے نہ بھیجنا تحفے میں اب لباس کوئی
میں اپنے عشق کی قیمت کھری نہیں کروں گی

مجھے قبول نہیں آگ ۔۔۔ تیل کا رشتہ
معاف کیجئے میں دوستی نہیں کروں گی

بہت سے کام بھی ہیں گھر کے اور مسائل بھی
میں ہجر!! تیری جنوں پروری نہیں کروں گی

وہ جس سے شیشہء حرمت پہ چوٹ پڑتی ہو
میں ایسا کام کہا ناں کبھی نہیں کرونگی

میں اپنی بیٹیوں کا سائبان ہوں۔۔۔کومل
میں فاقہ کاٹ لوں گی، نوکری نہیں کروں گی

○

ثاقب ہارون کاٹھمنڈو
(نیپال)

ظلامِ لیل میں مہتاب ڈھونڈنے سے رہے
ہم ان پہاڑوں میں اب خواب ڈھونڈھنے سے رہے

ہزار کوششیں کیں بوڑھی ہو گئیں آنکھیں
شکست وریخت کے اسباب ڈھونڈھنے سے رہے

ہماری قوم جو پیاسی تھی دم ہی توڑ گئی
مہیب صحرا میں ہم آب ڈھونڈھنے سے رہے

جو نیکو کار تھے دنیا میں پا گئے منزل
گناہ گار تو سب باب ڈھونڈھنے سے رہے

مرے تو شافیِ مطلق نچوڑ دے دامن
مریض قطرۂ عناب ڈھونڈھنے سے رہے

قلم کی آن و قرطاس کی حفاظت میں
نگارشات کو ارباب ڈھونڈھنے سے رہے

لحاظ پاس مروت شعور سب بے کار
دوائے فطرتِ سیماب ڈھونڈھنے سے رہے

ہجوم وقت میں اس طرح کھو گئے ثاقب
خود اپنے آپ کو احباب ڈھونڈھنے سے رہے

○

عنبر
(جودھ پور)

اپنی صورت میں وہ نظر آیا
کیا کہوں کب سے یہ ہنر آیا

ہر کی فصل پکڑنے والی ہے
یاد کے پیڑ پر ثمر آیا

شب کی دہلیز ہو گئی روشن
دیکھنا کون بام پر آیا

رات دریا میں کون ڈوبا ہے
دیکھنے کس کو شہر بھر آیا

ہم سفر چھانو کا تصور تھا
میں کڑی دھوپ سے گزر آیا

قربتوں کا کرشمہ ہے عنبر
رنگ پیڑوں کا جھیل پر آیا

○

عمران راقم
(کلکتہ)

تمہارا کیا ہمارا درد سر ہو — تجارت میں خسارا دردسر ہو
سمندر کا شکارا درد سر ہو — ندی کا بھی کنارا دردسر ہو
فلک کا بھی ستارا دردسر ہو — نشیمن پر شرارا دردسر ہو
کہیں کشتی کا یارا درد سر ہو — کہیں ٹوٹا شکارا درد سر ہو
فقط گوشہ ہی گوشہ میں جو دیکھوں — رسالے کا شمارا دردسر ہو
کہیں رنگیں فضا تنہائیوں میں — بظاہر بھی نظارا درد سر ہے
کنایہ وہ تری کس کو بتاؤں — نظر کا وہ اشارا دردسر ہو
بہت ہی عیش ہے ہم کو یہاں پر — وہاں پل پل گزارا درد سر ہو
مقید سانپ کی خاطر ہی پل پل — سپیرے کا پٹارا درد سر ہو
سکوں اک پل نہیں دیتا کبھی بھی — تری آنکھوں کا تارا درد سر ہو
کہیں تشبیہ ہے راقم غزل میں — کہیں پر استعارا درد سر ہو

○

انیس الرحمٰن
(سکھر)

راستوں سے بے خبر ہیں آپ بھی — کیسے میرے چارہ گر ہیں آپ بھی
مسئلے بڑھتے چلے جاتے ہیں اب — کس طرح کے راہبر ہیں آپ بھی
رات دن ہی پینترے بدلا کریں — اِس قدر تو باہنر ہیں آپ بھی
خوش مزاجی کا صلہ دکھ ہی تو ہیں — جس میں میرے ہم سفر ہیں آپ بھی
روندکر بڑھتے چلے جاتے ہیں سب — یعنی بس اک رہ گزر ہیں آپ بھی
غم گساروں، مخلصوں کے باب میں — اِک انیسِ معتبر ہیں آپ بھی

○

اسلام عظمی
(لاہور)

کوئی دیکھے نہ دیکھے اِک تماشا روز ہوتا ہے — گھڑی بھر کے لیے یہ شہر صحرا روز ہوتا ہے
کسی کے خونِ ناحق پر بھی اَب آندھی نہیں اٹھتی — کوئی حیراں نہیں ہوتا کہ ایسا روز ہوتا ہے
خدا اُن مرنے والوں کو سکونِ دائمی بخشے — وہ جن کے نام پر بستی میں جھگڑا روز ہوتا ہے
جہاں پر چومتا ہے آسماں دھرتی کی پیشانی — وہاں بجھتا ہوا سورج ستارہ روز ہوتا ہے
کبھی سوکھا کبھی پانی کی زد پر شہر رہتا ہے — عذابِ ناگہانی کا اشارہ روز ہوتا ہے
ہمیں یہ ریت جیسی دلدیں رستہ نہیں دیتیں — چلے آؤ، اُدھر سے تو اشارہ روز ہوتا ہے
کسی بینا کی دانائی کی باتیں ہوں نہ ہوں عظمی — یہاں اندھوں کی بینائی کا چرچا روز ہوتا ہے

○

اکمل شاکر

(پسنی)

وہ اجنبی ہے اگر ساتھ میرے آئے گا — خدا بھی معجزہ ایسا مجھے دکھائے گا
ہمیشہ میں نے اداسی میں دن گزارے ہیں — خوشی کا دن بھی بہت جلد دوست آئے گا
میں اپنے آپ سے لڑ کر ہی جیت جاؤں گا — تو ایسی جنگ میں لازم شکست کھائے گا
پرندہ اپنا ٹھکانہ بدل ہی دیتا ہے — کہ گھونسلے میں وہی سانپ پھر سے آئے گا
وہ پھول اب بھی کتابوں میں روز رکھتا ہے — کہ بکھرے فرش پہ خوشبو کو کون اٹھائے گا
میں تیری یاد میں جاگا ہوا مسافر ہوں — اداسی تان کے سوتا ہوں چین آئے گا
میں تیرے پیار کے ٹیبل پہ ایسے رکھا ہوں — مجھے تو کوئی بھی دیکھے گا وہ اٹھائے گا
سنا ہے شہر میں شاکر پرست ہیں سارے — ہر اک اس کی غزل اور گیت گائے گا

○

مادھو کوشک

(چندی گڑھ)

نہیں امید سے روشن جہان چھوٹا سا — ہمیں ملا نہ کہیں آسمان چھوٹا سا
دلوں میں اتنی جگہ ہے جہاں سما جائے — مگر نصیب نے بخشہ مکان چھوٹا سا
اسی نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی سب کے — جو لگ رہا تھا ہمیں امتحان چھوٹا سا
ہزاروں جھوٹے گواہوں پہ خوب بھاری ہے — اس ایک شخص کا سچّا بیان چھوٹا سا
بڑی سے خوب بڑی واردات کے پیچھے — بچا رہے گا ذہن میں نشان چھوٹا سا
سبھی کے منہ کا نوالا اسی نے چھین لیا — شہر کو جو بھی ملا حکمران چھوٹا سا

○

عزیز عادل

(مردان)

پسند تجھ کو نہیں تھے جو انفعال کے پھول — لبوں پہ رکھتا گیا اس لیے کمال کے پھول
سو یوں کیا کہ غزل میں پرو لیا اُن کو — چنے تھے جتنے ترے ایک اک سوال کے پھول
چھپائے رکھو پسِ خاکِ بے زبانی سدا — بساند دیتے ہیں آلائشِ ملال کے پھول
ہمارے دھیان کے سرسبز لالہ زاروں میں — لہک رہے ہیں سرِ آرزو جمال کے پھول
ورق ورق میں دفینے ہیں زخمی لمحوں کے — ورق ورق پہ چمکتے ہیں ماہ و سال کے پھول
سوا اپنے خون سے سیراب کر رہا ہوں انھیں — نمو پذیر نظر میں ہیں اک وبال کے پھول
یہ آگہی و خرد کے عذاب سہتے ہیں — ہماری مثل اذیت شناس حال کے پھول
سوان کے دھوکے میں ہرگز نہ آیئے عادلؔ — ریا سرشت بہت ہیں زمانہ حال کے پھول

○

محبوب خان اصغر

(حیدرآباد، دکن)

خود سری کا رنگ اس کا اور گہرا ہوگیا
احمقوں کی بھیڑ میں وہ سب سے اونچا ہوگیا

آسمانِ علم و حکمت پر ہے کالی کہکشاں
ہر طرف اک غلغلہ سا ہے سویرا ہوگیا

دفن کرکے چاند کو تارے یہ باور کرگئے
ہم سے ہیں تزئینِ شب ہم سے اجالا ہوگیا

یہ جو ہے باشندگانِ سرزمینِ مصلحت
ان منافق صورتوں کا رنگ پیلا ہوگیا

تیرنے لگتے ہیں پتھر جھیلتی رہتی ہے جھیل
محوِ حیرت عقل و دانش ہے کہ یہ کیا ہوگیا

روز و شب لاکھوں کروڑوں بدنما سایوں کے بیچ
ہے جسے ادراکِ حق وہ شخص تنہا ہوگیا

اس قدر گھٹیا ہوئی ہے ترجیحاتِ منصفی
جو بہت پیچھے کھڑا تھا بس وہ اگلا ہوگیا

ساتھ اہلِ علم کے اصغر کھڑا ہے ان دنوں
اشتہاری بستیوں میں شور برپا ہوگیا

○

سبھاش گپتا شفیق

(ہوشیارپور)

جائزہ ہر گڑھی حالات کا لیتے رہنا
ہاتھ پر ہاتھ دھرے چین سے بیٹھے رہنا

گھر کی دیوار کو باہر سے سجا لیتا ہوں
اور مقدر میں ہے اندر سے اکھڑتے رہنا

اک بھرم سا ہے جو تم اسکو بنائے رکھنا
میرے نزدیک سے شرما کے گزرتے رہنا

بات کرنا یا نہ کرنا یہ ہے مرضی تیری
یہ گزارش ہے مرا فون اٹھاتے رہنا

کوئی دھرتی کے خداؤں سے نہ شکوہ کرنا
آسمانوں کی طرف ہاتھ اٹھائے رہنا

○

علی شاہد دلکش

(کوچ بہار)

سر زمیں بیتِ مقدس کے مکینوں کو سلام
اے فلسطین ترے شہر کی گلیوں کو سلام

پاک دامن جو بے رحمی سے کچل ڈالے گئے
اُن کِھلے پھول کی معصوم سی کلیوں کو سلام

غاصبوں سے لڑے جی جاں سے نڈر ہو کے سبھی
جاں ہتھیلی پہ لیے سارے شہیدوں کو سلام

ہیں ڈٹے ظلم کے طوفان میں جتنے بھی شجر
عزم آہن لیے مضبوط درختوں کو سلام

ظلم کے خون سے بچے ہوئے جتنے بھی شہید
ان فلسطین کے معصوم فرشتوں کو سلام

بیت اقدس کے لیے دست دعا ہے جو اُٹھا
قبلہ اول سے محبت بھرے جذبوں کو سلام

تیز اور تند ہوا میں بھی ہے روشن جو چراغ
ظلم کی آندھی میں ان جلتے چراغوں کو سلام

خوں محبانِ فلسطین کا ناحق جو بہا
ناز بردار شہیدوں کے عقیدوں کو سلام

اولیں قبلہ پہ سر سب کا جو شاہدؔ ہے جھکا
مسجدِ اقصیٰ کی اطہر گلی کوچوں کو سلام

○

-ناول-

خاکِ شفا

پیرزادہ آلِ انوار
(میانی)

قسط.....۱۷

''ہاں میاں سالارِ جنگ بہادر۔۔۔ کچھ ہمیں بھی تو بتلاؤ۔۔۔ قطرے پر گہر ہونے تک۔۔۔ کیا بیتی۔۔۔؟''

''ایک غلط فہمی۔۔۔ یہیں دو رکر لیجیے۔۔۔ گہر وہر کچھ نہیں۔۔۔ قطرہ۔۔۔ ابھی تک قطرہ ہی ہے۔۔۔ اور۔۔۔ وقت اسی طرح نامہربان رہا۔۔۔ تو۔۔۔ کبھی بھی۔۔۔ حرفِ غلط کی مانند۔۔۔ صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔۔۔!''

''اللہ کا نام لو میاں۔۔۔ اللہ کا۔۔۔!''

''وہ تمہارے پاکستان کے۔۔۔ فوجی صدر گذرے ہیں نا۔۔۔ جن کے نام کے ساتھ۔۔۔ مومن وغیرہ کی فضول خرچی۔۔۔ کثرت سے ہوا کرتی تھی۔۔۔!''

''ضیاء الحق کی بات کر رہے ہو۔۔۔؟''

''اللہ تمہارا بھلا کرے۔۔۔ آئے بھلے ہی وہ ڈنڈے کے زور پر تھے۔۔۔ مگر۔۔۔ کلاً مضبوط رکھنے کے لیے۔۔۔ ہر فنکشن میں یہ نعت ضرور پڑھواتے تھے:

یہ سب تمہارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے
سو جناب۔۔۔ اپنوں کی تمام تر کرم فرمائیوں کے باوجود۔۔۔ میرے مولا نے۔۔۔ اس حقیر فقیر۔۔۔ پر تقصیر کی بات۔۔۔ ہمیشہ بگڑتے بگڑتے بنائی ہے۔۔۔ بقول پروین شاکر:

کبھی عرش پر کبھی فرش پر کبھی ان کے در کبھی دربدر
غمِ عاشقی تیرا شکریہ ہم کہاں کہاں سے گذر گئے''

''بات تو پتے کی کی ہے تم نے۔۔۔ مجھے بھی رام ریاض یاد آ گئے ہیں:

ہاتھ خایل ہو تو دانائی کا اظہار نہ کر
ایسی باتوں کا بڑے لوگ بُرا مانتے ہیں''

''میاں۔۔۔ بڑے لوگوں کی ایسی کی تیسی۔۔۔ ٹکے بھاؤ بکتے دیکھے ہیں میں نے۔۔۔ خود ساختہ بڑے۔۔۔!''

''پہیلیوں میں بات کرنے سے بہتر ہے۔۔۔ سیدھے سیدھے مطلب کی بات کی جائے۔۔۔ مطلب کی۔۔۔!''

''مطلب سے کیا مراد ہے آپ کی۔۔۔؟''

''یہ ہی۔۔۔ دلی۔۔۔ میرٹھ۔۔۔ سردھنا۔۔۔ میوات۔۔۔ بمبئی۔۔۔ کلکتہ۔۔۔ لاہور۔۔۔ اور۔۔۔ کراچی۔۔۔ کی خاک چھان کر۔۔۔ کیا ہاتھ لگا۔۔۔؟''

''ٹھن ٹھن گوپال۔۔۔!'' (دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے نچاتے ہوئے)

''میری سمجھ میں۔۔۔ یہ بات نہیں آ رہی۔۔۔ کہ۔۔۔ دلی میں سب کچھ ہوتے ہوئے۔۔۔ جگہ جگہ کی خاک چھاننے کی ضرورت کیا تھی۔۔۔؟''

''شعر و شاعری سے شغف ہے۔۔۔ یا۔۔۔ امریکہ آ کر۔۔۔ سب بھول گئے۔۔۔؟''

''امریکہ اپنی جگہ۔۔۔ شعر و شاعری۔۔۔ اپنی جگہ۔۔۔!''

''پھر تو بشیر بدر کو بھی جانتے ہوں گے۔۔۔؟''

''یقیناً جانتے بھی ہیں۔۔۔ اور۔۔۔ گاہے گاہے پڑھتے۔۔۔ اور۔۔۔ سنتے بھی ہیں۔۔۔!''

''ایک شعر بشیر بدر نے ہمارے حسبِ حال کہا ہے۔۔۔!''

''وہ کیا۔۔۔؟''

''محبوب کا گھر ہو کہ بزرگوں کی زمینیں
جو چھوڑ دیا پھر اُسے مڑ کر نہیں دیکھا''

''آگے کیا ارادے ہیں۔۔۔؟''

''آگے۔۔۔ آگے۔۔۔:

بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے بھی تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں''

''آپ لوگوں کو وقت کا اندازہ ہے۔۔۔ کہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ کھانا کئی بار گرم کر چکی ہوں۔۔۔ مگر۔۔۔ آپ لوگوں کی باتیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔۔۔ اُدھر بھابھی اور بچہ بھی۔۔۔ اپنا سا منہ لیے بیٹھے ہیں۔۔۔!''

''ایک بات کہوں۔۔۔؟''

''آپ تو ایسے دریافت کر رہے ہیں۔۔۔ جیسے میرے منع کرنے سے۔۔۔ باز آ جائیں گے۔۔۔!''

''یہ عمران صاحب جو ہیں۔۔۔!''

''عمران صاحب۔۔۔ (بات کاٹتے ہوئے) پورے سات سال چھوٹا ہے مجھ سے۔۔۔ اور۔۔۔ آپ ایسے مخاطب کر رہے ہیں۔۔۔!''

''حالات نے سچ مچ۔۔۔ عمران کو۔۔۔ ہم سے بڑا بنا دیا ہے۔۔۔ یقین نہیں آتا۔۔۔ تو۔۔۔ کل میرے آفس جانے کے بعد۔۔۔ عمران کے ساتھ نشست کر کے دیکھنا۔۔۔ خود پتہ چل جائے گا۔۔۔ یہاں کون سا شعر آنا چاہیے میاں۔۔۔؟'' (عمران کو مخاطب کرتے ہوئے)

''یہاں۔۔۔ اُوں۔۔۔ یہاں تو داغ صاحب ہی کارگر ہوں گے:

بزمِ گلشن میں نا کھلنا گل تر کی صورت
جاؤ بجلی کی طرح آؤ نظر کی صورت''

''یہاں تم نے داغ صاحب کا نام لے کر شعر پڑھا۔۔۔ پچھلا شعر پڑھتے وقت تم نے۔۔۔ شاعر کا نام نہیں لیا۔۔۔!''

''وہ ابنِ صفی کا شعر تھا۔۔۔!''

''ابنِ صفی۔۔۔ وہ۔۔۔ جاسوسی ناول والے۔۔۔؟''

''جی۔۔۔ جی۔۔۔ وہی۔۔۔ جاسوسی ناول والے۔۔۔!''

''وہ کب سے شاعر ہو گئے۔۔۔؟''

''آغاز شاعری سے ہوا ابنِ صفی صاحب کا۔۔۔ بعد میں۔۔۔ نثر کی جانب رجحان ہو گیا۔۔۔!''

''میرے لیے۔۔۔ اطلاع سے کم نہیں۔۔۔ یہ بات۔۔۔!''

☆

''میں نے کہا سنتی ہو۔۔۔ صابرہ۔۔۔ سو گئیں۔۔۔؟''

''ایسے میں نیند کہاں آتی ہے۔۔۔!''

''پریشان ہونے سے فائدہ۔۔۔؟''

''کچھ باتیں انسان کے بس میں نہیں بھی ہوتیں۔۔۔!''

''عمران کی وجہ سے پریشان ہو۔۔۔؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔۔۔ ناز و نعم میں پلا بھائی۔۔۔ گودوں میں کھِلایا بچہ۔۔۔ اس قدر ہزر ایبل کنڈیشن میں۔۔۔ کوئی بھی دیکھتا۔۔۔ تو۔۔۔ بے چین ہو جاتا۔۔۔!''

''فکر کیوں کرتی ہو۔۔۔ نیچے ہم ہیں۔۔۔ اوپر خدا ہے۔۔۔ کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔۔۔ ان شاءاللہ۔۔۔!''

''تمہاری سینسیارٹی پر مجھے پورا یقین ہے۔۔۔ مگر۔۔۔!''

''اگر۔۔۔ مگر۔۔۔ کو ذہن سے نکال دو۔۔۔ عمران جس طرح تمہیں عزیز ہے۔۔۔ اُسی طرح۔۔۔ میرے لیے بھی اہم ہے۔۔۔ کوئی بھی قدم اُٹھانے سے پہلے۔۔۔ ہمیں عمران کے ارادوں۔۔۔ اور۔۔۔ ترجیحات کو۔۔۔ مدِ نظر رکھنا ہوگا۔۔۔!''

''اوکے۔۔۔ آئی انڈر سٹینڈ''

''کمنگ ویک اینڈ پر میں عمران کو سیر کے بہانے باہر لے جاؤں گا۔۔۔ کھلی آب و ہوا۔۔۔ اور۔۔۔ کھلے ماحول میں۔۔۔ گفتگو کرنا۔۔۔ نسبتاً آسان ہوگا۔۔۔ اس دوران۔۔۔ تم اپنی بھابھی۔۔۔ کیا نام ہے اُس کا۔۔۔؟''

''رضیہ۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ رضیہ۔۔۔ تم اس دوران رضیہ کے ذہن کو ٹٹول کر دیکھو۔۔۔!''

''مثلاً۔۔۔ کس حوالے سے۔۔۔ کیا گفتگو کرنی چاہیے رضیہ سے۔۔۔؟''

''مثلاً۔۔۔ مثلاً۔۔۔ یہ ہی۔۔۔ کہ۔۔۔ وہ۔۔۔ کراچی سے ہزاروں میل دور۔۔۔ ایک اجنبی ملک میں۔۔۔ کیا اُمیدیں۔۔۔ کیا ارادے۔۔۔ اور کیا ایکس پیکٹیشن لے کر آئے ہیں۔۔۔؟''

''اس طرح کی گفتگو سے قبل۔۔۔ بے تکلفی کا ایک ماحول۔۔۔ انڈر سٹینڈنگ کا ایک لیول۔۔۔ تو۔۔۔ ڈیولپ کرنا پڑے گا نا۔۔۔!''

''شیور۔۔۔ میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔۔۔!''

''ابھی تک نہ تو ہمیں عمران کی کوالیفیکیشن کا علم ہے۔۔۔ نا۔۔۔ اکنامک اسٹیٹس کے بارے کچھ پتہ ہے۔۔۔!''

''بہت ویلڈ پوائنٹ اٹھایا ہے تم نے۔۔۔ اس وقت مجھے تیسری دنیا کے ان لوگوں پر افسوس ہو رہا ہے۔۔۔ جو خواتین کو۔۔۔ ناقص العقل۔۔۔ یا۔۔۔ خدانخواستہ مردوں سے کم تر گردانتے ہیں۔۔۔!''

''فار گیٹ ایٹ۔۔۔ کمنگ ٹو دا پوائنٹ۔۔۔!''

''میرے خیال میں۔۔۔ رضیہ کی ایجوکیشن کے حوالے سے جاننا بھی ضروری ہے۔۔۔؟''

''سٹیٹ اوے۔۔۔ تو۔۔۔ دریافت نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ کہ بھئی۔۔۔ تمہاری تعلیم کیا ہے۔۔۔ اور۔۔۔ تم۔۔۔ کس طرح کی جاب کر سکتی ہو۔۔۔ اٹس ٹیک اے ٹائم۔۔۔!''

''اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔ آئی ایگری۔۔۔ تم رضیہ پر فوکس کرو۔۔۔ میں۔۔۔ عمران کو ریڈ کرتا ہوں۔۔۔!''

''تھینکس گاڈ۔۔۔ (شوہر کا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے) تم کتنے اچھے ہو ایوب۔۔۔!''

''رئیلی۔۔۔!'' (قریب ہوتے ہوئے)

''سنو۔۔۔!''

''ہوں۔۔۔!''

''اِدھر آؤ نا۔۔۔'' (گلے میں بازو ڈالتے ہوئے)

''ناٹ ایٹ آل۔۔۔!''

''پلیز۔۔۔!''

''تمہارے اندر کا بچہ کب بڑا ہوگا۔۔۔؟''

''تم سچ مچ چاہتی ہو۔۔۔؟''

''کیا۔۔۔؟'' (انگلیوں سے چھاتی سہلاتے ہوئے)

''میرے اندر کا بچہ بڑا ہو جائے۔۔۔؟''

''ڈونٹ بی سلی۔۔۔!'' (نائٹ بلب آف کرتے ہوئے)

☆

''برادرِ من۔۔۔ جس دن سے آپ لوگ آئے ہیں۔۔۔ میں۔۔۔ اور۔۔۔ تمہاری ہمشیرہ۔۔۔ چین کی نیند نہیں سو سکے۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔۔۔ کہ۔۔۔ ہم بے بس ہیں۔۔۔ یا۔۔۔ بے یار و مددگار ہیں۔۔۔ خدا کا دیا سب

کچھ ہے۔۔۔مگر۔۔۔ جب تک آپ کے ارادے ۔۔۔ترجیحات ۔۔۔اور مستقبل کے حوالے سے آگاہی نہ ہو۔۔۔تب تک ہمارے لیے۔۔۔کوئی بھی قدم اٹھانا ممکن نہیں۔۔۔ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں۔۔۔کہ۔۔۔آپ کا قیام عارضی ہے۔۔۔یا۔۔۔مستقل۔۔۔ بلکہ ہم تو اس امر سے بھی لاعلم ہیں۔۔۔ کہ۔۔۔آپ یوں اچانک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔۔۔ امریکہ کیوں چلے آئے۔۔۔؟''

''میں خود نہیں جانتا۔۔۔ کہ۔۔۔ ہم لوگ۔۔۔ امریکہ کیوں آگئے۔۔۔اور۔۔۔آگئے ہیں۔۔۔تو۔۔۔کرنا کیا ہے۔۔۔ میری کیفیت ۔۔۔مجھ سے بہتر بشیر بدر بیان کررہے ہیں:

زندگی تُو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمین
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے''

''مایوسی کی باتیں نہ کرو۔۔۔کسی غیر کے گھر نہیں۔۔۔بہن کے گھر آئے ہو۔۔۔بہن بھی وہ۔۔۔جو تمہیں۔۔۔بھائی کم۔۔۔بیٹا زیادہ سمجھتی ہے۔۔۔!''

''یہ ہی حوصلہ۔۔۔یہ ہی یقین۔۔۔مجھے یہاں تک لے آیا۔۔۔!''

''میں نے آج کا دن۔۔۔آؤٹنگ کا پروگرام۔۔۔سیر وتفریح کی غرض سے نہیں۔۔۔تمہارے حالات سے آگاہی۔۔۔اور۔۔۔اُن کا حل تلاش کرنے کے لیے بنایا ہے۔۔۔!''

''یہ تو آپ کا بڑاپن ہے۔۔۔وگرنہ۔۔۔ایسے موقع پر۔۔۔ابّا میاں اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

بنی کے چہرے پہ لاکھوں نثار ہوتے ہیں
بنی جب بگڑتی ہے تو دشمن ہزار ہوتے ہیں''

''خدا نہ کرے۔۔۔کبھی ایسی نوبت آئے۔۔۔چھوڑ و ان باتوں کو۔۔۔کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔۔۔!''

''کیا بتاؤں۔۔۔اور۔۔۔کیا نہ بتاؤں۔۔۔اپنا تو حال فیض صاحب کے اس شعر کی مانند ہے۔۔۔:

زندگی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں''

''تم اکیلے تھے۔۔۔ جب اور بات تھی۔۔۔ اب ہم ہیں۔۔۔ یعنی۔۔۔میں۔۔۔تم۔۔۔تمہاری ہمشیرہ۔۔۔تمہاری شریک حیات۔۔۔خدا نے چاہا۔۔۔تو۔۔۔مل جل کر۔۔۔گاڑی کھینچ لیں گے۔۔۔!''

''کراچی میں ہمارا گھر۔۔۔ تابش دہلوی صاحب کے پڑوس میں تھا۔۔۔وہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

زندگی مرگِ مسلسل ہے مگر اے تابش
ہائے وہ لوگ جو جینے کی دعا دیتے ہیں''

''میاں۔۔۔کیا بتاؤں۔۔۔اور۔۔۔کیا نہ بتاؤں۔۔۔عجب۔۔۔گو مگو کی کیفیت میں ہوں۔۔۔کوئی صاحب۔۔۔حسیب سوز کے نام کے شاعر گزرے ہیں۔۔۔کیا خوب منظر کشی کی ہے۔۔۔میری حالتِ زار کی:

یہاں مضبوط سے مضبوط لوہا ٹوٹ جاتا ہے
کئی جھوٹے اکٹھے ہوں تو سچا ٹوٹ جاتا ہے''

''بتانا تو پڑے گا۔۔۔ آج بتاؤ۔۔۔ کل بتاؤ۔۔۔ یا۔۔۔ پرسوں۔۔۔ بتائے بنا کوئی چارہ نہیں ہے۔۔۔ پہلے یہ بتلا دو۔۔۔ کہ۔۔۔سچا کون ہے۔۔۔اور۔۔۔جھوٹا کون۔۔۔؟''

''ایک تو ہوگئیں ہماری پھپھو صاحبہ۔۔۔!''

''اچھا۔۔۔دوسری۔۔۔؟''

''دوسری ہوگئیں۔۔۔وہ۔۔۔نام تو سنا ہوگا۔۔۔صفیہ آپا۔۔۔!''

''اچھا۔۔۔!''

''تیسرے ہوگئے۔۔۔ماموں شفیق۔۔۔!''

''ٹھیک۔۔۔آگے چلو۔۔۔آگے۔۔۔!''

''میاں۔۔۔وہ گیت نہیں سنا آپ نے۔۔۔؟''

''کون سا۔۔۔؟''

''کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں۔۔۔اور۔۔۔کونسا۔۔۔؟''

''چلو۔۔۔اب سن لیا۔۔۔پھر۔۔۔!''

''پھر یہ کہ۔۔۔!'' (آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں)

''عمران۔۔۔عمران۔۔۔جوان آدمی۔۔۔روتے ہوئے۔۔۔اچھے نہیں لگتے۔۔۔!''

''روکہاں رہا ہوں۔۔۔ یہ تو۔۔۔ میرے اندر کا دُکھ۔۔۔ آنسو بن کر۔۔۔آنکھوں کے ذریعے بہہ نکلا ہے۔۔۔بقول آپ کے رام ریاض:''

پانی پہ تصویر اُتارا کرتے تھے
ہم تالاب میں پتھر مارا کرتے تھے
اگلے لوگوں نے بھی وقت گذارا ہے
سوچتا ہوں کس طرح گذارا کرتے تھے

''یہ۔۔۔شاعری وغیرہ۔۔۔تمہارے مزاج کا حصہ ہے۔۔۔یا۔۔۔ حالات کا جبر۔۔۔؟''

''ساغر صدیقی کی زبان میں سن لیجیے:''

کس شہرِ منافق میں تم آگئے ساغر
اِک دوجے کی ہر شخص خطا ڈھونڈ رہا ہے

''میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔۔۔!''

''اپنوں نے اتنے دکھ دیے۔۔۔ کہ۔۔۔ زندگی سے دل اُچاٹ ہو گیا۔۔۔!''

''پھر۔۔۔؟''

''پھر کیا۔۔۔نیند کی گولیاں کھا کے۔۔۔انٹا غفیل ہو گئے۔۔۔!''

''افوہ۔۔۔نوبت یہاں تک آ گئی تھی۔۔۔!''

''وہ۔۔۔تو۔۔۔شکر خدا کا۔۔۔کہ۔۔۔ابّا میاں پہلی فلائٹ لے کر کراچی پہنچے۔۔۔اور۔۔۔پانی کی طرح۔۔۔پیسہ بہا کر۔۔۔جان بچائی۔۔۔ وگرنہ۔۔۔کیفی اعظمی کے شعر کی تفسیر بن گئے ہوتے:''

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی
تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

☆

''دلہا بھائی۔۔۔مجھے افسوس ہے۔۔۔گذشتہ رات۔۔۔میری وجہ سے آپ کی طبیعت ناساز ہوئی۔۔۔!''

''اگر تم نے۔۔۔میرے نام کے ساتھ۔۔۔دلہا کا لاحقہ۔۔۔پھر سے لگایا۔۔۔تو۔۔۔مزید خراب ہو جائے گی۔۔۔!''

''کیوں۔۔۔اس میں۔۔۔کیا برائی ہے۔۔۔؟''

''بھلے آدمی۔۔۔یہ بیسوی صدی ہے۔۔۔اور۔۔۔مقام ہے۔۔۔ یونائیٹڈ سٹیٹ۔۔۔جدید۔۔۔اور۔۔۔روشن خیال۔۔۔لوگوں کا ملک۔۔۔ یہاں۔۔۔اس طرح کے تکلفات کے لیے۔۔۔قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔۔۔ اصولی طور پر۔۔۔تو۔۔۔تمہیں میرا نام لینا چاہیے۔۔۔یہاں کے لوگ۔۔۔ بہن۔۔۔بھائی۔۔۔بہنوئی کا نام لے کر پکارتے ہیں۔۔۔بعضے بعضے گھروں میں۔۔۔تو۔۔۔اولاد اکثر۔۔۔ماں باپ کا۔۔۔نام۔۔۔پیٹر۔۔۔ جارج۔۔۔ماریا۔۔۔الزبتھ۔۔۔وغیرہ۔۔۔لے کر پکارتے ہیں۔۔۔تم۔۔۔ مجھے۔۔۔ایوب نہ سہی۔۔۔ایوب بھائی کہہ کر۔۔۔بلایا کرو۔۔۔!

''آپ کا حکم۔۔۔سر آنکھوں پر۔۔۔!''

''اللہ سلامت رکھے۔۔۔تمہیں بھی۔۔۔اور۔۔۔تمہارے سر کو بھی۔۔۔رات کی بات پوری کرو۔۔۔!''

''ابّا میاں۔۔۔تو۔۔۔ہر قیمت پر۔۔۔مجھے۔۔۔واپس اپنے ساتھ دلّی لے جانا چاہتے تھے۔۔۔مگر۔۔۔میں نے دوٹوک انداز میں ابّا میاں کو بتلا دیا۔۔۔کہ۔۔۔مر جاؤں گا۔۔۔ناکامی کا طوق لے کر۔۔۔دلّی نہیں جاؤں گا۔۔۔!''

''تجویز۔۔۔ابّا میاں کی بھی بری نہیں تھی۔۔۔مگر۔۔۔میری رائے میں۔۔۔تمہارا فیصلہ زیادہ مناسب تھا۔۔۔!''

''شکریہ۔۔۔(لمبا سانس لے کر) بہت سوچنے۔۔۔سمجھنے۔۔۔ اور۔۔۔غور کرنے کے بعد۔۔۔قرعۂ فال۔۔۔ممدو میاں کے نام نکلا۔۔۔!''

''یہ ممدو میاں کون ہیں۔۔۔؟''

''ابّا میاں بتلاتے ہیں۔۔۔کہ۔۔۔ممدو میاں ایک زمانے میں ہمارے گھریلو ملازم رہ چکے تھے۔۔۔شادی کے بعد۔۔۔اُن کے سسر نے۔۔۔ لال کنواں دہلی میں۔۔۔ایک بیٹھک کرائے پر لے کر۔۔۔انہیں بیٹری کا کام شروع کرا دیا۔۔۔چنٹ چلاک۔۔۔تو۔۔۔ممدو میاں پہلے ہی تھے۔۔۔بیٹری کے کاروبار میں۔۔۔اور بھی جو ہر نکھر کر سامنے آئے۔۔۔رُپلّی۔۔۔دور و پلّی کو للکنے والے ممدو میاں۔۔۔دیکھتے ہی دیکھتے۔۔۔سینکڑوں۔۔۔ہزاروں میں کھیلنے لگے۔۔۔لوگوں کی حیرت انتہا کو تب پہنچی جب۔۔۔تقسیم ہند کے بعد۔۔۔ممدو میاں نے کراچی آ کر۔۔۔چند سالوں میں بیٹری کے کارخانہ کی جگہ۔۔۔سگریٹ فیکٹری لگا لی۔۔۔اور۔۔۔راتوں رات ممدو میاں سے۔۔۔ سیٹھ احمد علی اینڈ سنز بن کر۔۔۔لاکھوں میں کھیلنے لگے۔۔۔بقول حسرت موہانی:''

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

''ایک ممدو بھائی پر کیا موقوف۔۔۔سینکڑوں۔۔۔ہزاروں ممدو میاں کی۔۔۔لاٹری نکلی ہے۔۔۔پاکستان کو۔۔۔تو۔۔۔ہم لوگوں نے۔۔۔حلوائی کی دکان سمجھ رکھا ہے۔۔۔جہاں ہر کوئی۔۔۔نانا جی کی فاتحہ کرنے میں مگن ہے۔۔۔!''

''ابّا میاں بتلا رہے تھے۔۔۔کہ۔۔۔جس رات انہوں نے ممدو میاں کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔۔۔وہ رات کروٹیں بدلتے گزری۔۔۔طرح طرح کے۔۔۔اندیشے۔۔۔اور۔۔۔وسوسے۔۔۔سر ابھار رہے تھے۔۔۔ خدا معلوم۔۔۔ممدو سے۔۔۔ممدو سیٹھ۔۔۔اور۔۔۔ممدو سیٹھ سے۔۔۔سیٹھ محمد علی اینڈ سنز بننے کے بعد۔۔۔ابّا جان کو پہچانتا بھی ہے۔۔۔کہ۔۔۔ نہیں۔۔۔پہچاننے کی صورت میں۔۔۔خدا معلوم۔۔۔ان کا ردّ یہ کس نوعیت کا ہوگا۔۔۔سب سے بڑھ کر یہ۔۔۔کہ۔۔۔مدعا بیان کرنے پر ممدو میاں کا ردِ عمل کیا ہوگا۔۔۔کہتے ہیں۔۔۔کہ۔۔۔تمام رات میر تقی میر۔۔۔سر پر ہتھوڑا برساتے رہے:''

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

''لالو کھیت سے۔۔۔پیر الٰہی بخش کالونی کا سفر۔۔۔دو اجنبیوں کے درمیان کٹا۔۔۔تمام راستے۔۔۔ابّا میاں۔۔۔منہ ہی منہ میں۔۔۔خاص ورد کرتے رہے۔۔۔اس سے قبل۔۔۔ابّا میاں کو۔۔۔اس قدر پریشان۔۔۔کم از کم۔۔۔میں نے تو نہیں دیکھا تھا۔۔۔ممدو میاں کا دفتر کیا تھا۔۔۔کسی راجے۔۔۔مہاراجے۔۔۔کے محل سے کم نہ تھا۔۔۔ایک دفعہ کو ابّا میاں بھونچکاں ہو کر۔۔۔دفتر کے باہر۔۔۔مین گیٹ پر لگا۔۔۔سائن بورڈ دیکھتے۔۔۔اور۔۔۔حیران ہوتے رہے۔۔۔!''

''منّے۔۔۔آؤ لوٹ چلیں۔۔۔!''

''کیوں۔۔۔ممدو میاں سے ملے بغیر۔۔۔کیوں لوٹ چلیں۔۔۔؟''

''دیکھ نہیں رہے ہو۔۔۔!'' (جعلی حروف میں سیٹھ محمد علی اینڈ سنز کے سائن بورڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے)

''جی دیکھ رہا ہوں۔۔۔اور۔۔۔پڑھ بھی رہا ہوں۔۔۔!''

''بیٹا۔۔۔ہم سیٹھ ہیں۔۔۔نہ۔۔۔سا ہوکار۔۔۔پھر بھی۔۔۔اللہ نے بڑی عزت دی ہے۔۔۔میں نہیں سمجھتا۔۔۔کہ۔۔۔ذرا سے مفاد کی خاطر اُسے داؤ پر لگایا جائے۔۔۔!''

''آپ یہیں ٹھہریے۔۔۔ میں جاتا ہوں۔۔۔ ممدو میاں سے ملنے۔۔۔!''

''ایسا غضب نہ کرنا۔۔۔!''

''کیوں۔۔۔کیا حرج ہے۔۔۔میرے جانے میں۔۔۔!''

''اپنی ذات تک۔۔۔تو۔۔۔شاید۔۔۔ میں برداشت کرلوں۔۔۔ مگر۔۔۔تمہارے ساتھ۔۔۔کسی قسم کی بدتہذیبی میرے لیے۔۔۔قطعی طور پر۔۔۔ناقابل برداشت ہوگی۔۔۔!''

''نہ معلوم کیوں۔۔۔میرا دل کہتا ہے۔۔۔کہ۔۔۔ممدو میاں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔۔۔جس سے آپ کو صدمہ پہنچے۔۔۔!''

''سوچ لو۔۔۔!''

''جی۔۔۔سوچ سمجھ کر ہی میں نے عرض کیا ہے۔۔۔!''

''اگر یہ بات ہے۔۔۔تو۔۔۔خدا کا نام لے کر چلتے ہیں۔۔۔!''

دوا کی تلاش میں رہا ہوں دعا کو چھوڑ کر
میں چل نہ سکا دنیا میں خطاؤں کو چھوڑ کر
حیراں ہوں میں اپنی حسرتوں پہ اقبالؔ
ہر چیز خدا سے مانگ لی مگر خدا کو چھوڑ کر

☆

''السلام علیکم۔۔۔!''

''وعلیکم السلام۔۔۔!''

''سیٹھ محمد علی کا دفتر یہ ہی ہے۔۔۔!''

''سکول۔۔۔مسکول۔۔۔گیا ہے۔۔۔یا۔۔۔اماری طرح۔۔۔!''

(ایک ہاتھ کا انگوٹھا دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر چسپاں کرتے ہوئے)

''الحمداللہ۔۔۔سکول بھی گئے ہیں۔۔۔اور۔۔۔کالج بھی۔۔۔!''

''سکول بی گیا ہے۔۔۔اور۔۔۔کالج بی۔۔۔تو۔۔۔پھر۔۔۔خانہ خراب کے پُتر۔۔۔یہ۔۔۔سامنے لگا۔۔۔بورڈ کیوں نہیں پڑھتا۔۔۔؟''

''جی۔۔۔جی۔۔۔پڑھا ہے۔۔۔بلکل پڑھا ہے۔۔۔!''

''پڑھا ہے۔۔۔تو۔۔۔ہمارا مغز کا ہے کو خراب کرتا ہے۔۔۔؟''

''وہ دراصل۔۔۔ہمیں۔۔۔سیٹھ صاحب سے ملنا تھا۔۔۔!''

''سیٹھ صاحب۔۔۔تمہاری طرح۔۔۔فالتو آدمی نہیں ہے۔۔۔!''

''کیوں۔۔۔وہ۔۔۔لوگوں سے نہیں ملتے۔۔۔؟''

''ملتا ہے۔۔۔ برابر ملتا ہے۔۔۔مگر۔۔۔اُس کو ملتا ہے۔۔۔جس نے پہلے سے ٹیم لیا ہو۔۔۔!''

''آپ یہ کارڈ۔۔۔سیٹھ صاحب کو پہنچا دو۔۔۔ بڑی مہربانی ہو گی آپ کی۔۔۔!''

''اوخانہ خراب کا پُتر۔۔۔ہمارا بات۔۔۔تمہاری سمجھ میں۔۔۔کیوں نہیں آتا۔۔۔!''

''وہ دراصل۔۔۔!''

''وہ سامنے بورڈ پر نمبر لکھا ہے۔۔۔سیٹھ صاحب کے سیکرٹری کو فون کرو۔۔۔وہ جب ٹیم دے۔۔۔تو۔۔۔آجاؤ۔۔۔!''

''خان صاحب۔۔۔!''

''اب کیا بات ہے۔۔۔؟''

''وہ۔۔۔میرا مطلب ہے۔۔۔آپ نے کبھی کسی پر احسان تو کیا ہو گا۔۔۔!''

''وہ خوچہ۔۔۔کیا ہے۔۔۔کیوں نہیں کیا۔۔۔وہ اپنا۔۔۔وزیر خان ہے نا۔۔۔ایک بار اُس کا نسوار کا ڈبی گم ہو گیا۔۔۔پورا دو دن۔۔۔ہم نے۔۔۔ اُس خانہ خراب کو۔۔۔ اپنا ڈبی سے نسوار کھلایا۔۔۔ اور۔۔۔ ایک بار۔۔۔ تو۔۔۔!''

''ایک احسان ہم پر بھی کردو۔۔۔ آپ کی۔۔۔ بڑی مہربانی ہو گی۔۔۔!'' (درمیان سے بات کاٹتے ہوئے بڑے پیر صاحب نے خان صاحب کو رام کرنے کی کوشش کی)

''بولو کیا ہے۔۔۔؟''

''یہ کارڈ سیٹھ صاحب کی میز پر رکھ آؤ۔۔۔ بس۔۔۔ کہنا کچھ نہیں۔۔۔!''

''اوہ خانہ خراب کے پُتر۔۔۔لاؤ۔۔۔کدھر ہے۔۔۔کارڈ۔۔۔؟''

☆

''کیا ہوا۔۔۔؟''

''سیٹھ صاحب بولا۔۔۔مہمان کو اُدھر روکو۔۔۔!''

''بس۔۔۔یہ ہی کہا سیٹھ صاحب نے۔۔۔اور۔۔۔کچھ نہیں۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔اور۔۔۔کچھ۔۔۔نہیں بولا سیٹھ صاحب نے۔۔۔!''

''چلو ٹھیک ہے۔۔۔ آپ کا بہت شکریہ۔۔۔!'' (واپسی کے لیے مڑتے ہوئے)

''اوخانہ خراب کے پُتر۔۔۔تم کدھر جاتا ہے۔۔۔اِدھر بیٹھو۔۔۔!'' (اپنی کرسی پیش کرتے ہوئے)

''اب کیا فائدہ بیٹھنے کا۔۔۔!''

''او خانہ خراب کے پُتر۔۔۔سیٹھ صاحب بولا۔۔۔مہمان کو اُدھر روکو۔۔۔ہم خود آ کر ملے گا۔۔۔!''

''یہ کہا۔۔۔سیٹھ صاحب نے۔۔۔!''

''ہم پارسی۔۔۔تو۔۔۔نہیں بولا۔۔۔!''(سیٹھ صاحب کو دیکھ کر خان کا جملہ ادھورہ رہ گیا)

☆

''شوکت۔۔۔ شوکت۔۔۔ ویسے جی۔۔۔ جی۔۔۔ کرتا رہتا ہے۔۔۔کام کے وقت خدا معلوم کہاں۔۔۔دفع ہو جاتا ہے۔۔۔!''

''جی۔۔۔سر۔۔۔جی۔۔۔کیا حکم ہے۔۔۔؟''

''دیکھو۔۔۔ یہ تمام فائلیں سمیٹو۔۔۔اور۔۔۔آج کی تمام مصروفیات منسوخ کر دو۔۔۔!''

''منسوخ کر دوں۔۔۔مگر۔۔۔سر۔۔۔!''

''اونچا سننے لگے ہو۔۔۔؟''

''نہیں سر۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ تو۔۔۔ یہ عرض کر رہا تھا۔۔۔کہ۔۔۔!''

''کچھ کہنے۔۔۔سننے کی۔۔۔قطعاً۔۔۔ضرورت نہیں۔۔۔آج کے دن میں دستیاب نہیں ہوں۔۔۔ نہ فون پر۔۔۔ اور۔۔۔ نہ۔۔۔ ذاتی طور پر۔۔۔!''

''جی۔۔۔جی۔۔۔بہتر۔۔۔''(جانے کے لیے مڑتا ہے)

''اور سنو۔۔۔!''

''سر۔۔۔!''(پلٹتے ہوئے)

''چائے بھجواؤ۔۔۔سپیشل۔۔۔!''

''جی سر۔۔۔ابھی بھجواتا ہوں۔۔۔!''

''سپیشل کا مطلب سمجھتے ہو نا۔۔۔؟''

''جی۔۔۔سر۔۔۔سمجھتا ہوں۔۔۔!''

'اور ہاں۔۔۔!''

''سر۔۔۔!''(ایک بار پھر پلٹتے ہوئے)

''گھر فون کر کے کہو۔۔۔سیٹھ صاحب کے۔۔۔خاص مہمان تشریف لائے ہیں۔۔۔کھانا یہیں کھائیں گے۔۔۔!''

''جی سر۔۔۔ابھی کرتا ہوں۔۔۔!''

''اور سنو۔۔۔!''(دروازے کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے)

''سر۔۔۔!''

''یہ بھی کہنا۔۔۔کہ۔۔۔غفور سے کہہ کر گیسٹ روم کی صفائی ضرور کرالیں۔۔۔!''

''او۔کے۔۔۔فوراً کہتا ہوں۔۔۔!''

''ارے۔۔۔آپ ابھی تک کھڑے ہیں۔۔۔!''

''تشریف رکھیے۔۔۔پلیز۔۔۔!''

''ضرور۔۔۔ضرور۔۔۔!''(کرسی کی جانب جھکتے ہوئے)

''گناہ گار نہ کیجیے۔۔۔پیر صاحب۔۔۔آپ کے بیٹھنے کی جگہ۔۔۔ یہاں نہیں۔۔۔ یہاں ہے۔۔۔!''(میز کے دوسری جانب اپنی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

''ارے نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ آپ اپنی جگہ۔۔۔ بیٹھئے۔۔۔ میں۔۔۔اپنی جگہ بیٹھتا ہوں۔۔۔!''

''دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے۔۔۔ چاند دن کو۔۔۔سورج رات کو نکل آئے۔۔۔مگر۔۔۔آپ کے بیٹھنے کی جگہ۔۔۔یہی رہے گی۔۔۔(پیر صاحب کو اپنی کرسی میں بٹھاتے ہوئے) ایک درخواست اور کرنا چاہوں گا۔۔۔!''

''ضرور۔۔۔ضرور۔۔۔کیوں نہیں۔۔۔!''

''آپ کی زبان سے۔۔۔ اپنے لیے۔۔۔ لفظ۔۔۔ آپ۔۔۔ میرے لیے۔۔۔باعث ندامت ہے۔۔۔آپ کے روبرو۔۔۔میں۔۔۔سیٹھ ہوں۔۔۔نا۔۔۔محمد علی۔۔۔صرف ممدو ہوں۔۔۔ممدو۔۔۔آپ کا خادم۔۔۔ آپ کا۔۔۔غلام۔۔۔!''

''ممدو میاں۔۔۔(جیب سے رومال نکال کر آنکھیں صاف کرتے ہوئے) آپ نے تو ہمیں۔۔۔اپنا۔۔۔مطیع کر لیا۔۔۔خدا جانتا ہے۔۔۔اتنی عزت۔۔۔ اتنا احترام۔۔۔ اور۔۔۔ اتنی عاجزی۔۔۔ میں نے عمر بھر نہیں دیکھی۔۔۔خدا سے دعا ہے۔۔۔(دونوں ہاتھوں کو ملاتے ہوئے) تمہارے لیے۔۔۔ اس قدر آسانیاں پیدا کرے۔۔۔ اس قدر آسانیاں۔۔۔ پیدا کرے۔۔۔(الفاظ ادا کرتے ہوئے بڑے پیر صاحب پر رقّت طاری ہو جاتی ہے اور وہ ہچکیوں سے رونے لگتے ہیں)''

''یہ سب۔۔۔آپ کی دعاؤں کا صلہ ہے۔۔۔وگرنہ۔۔۔ میں اس قابل کہاں۔۔۔(جذبات سے مغلوب ہو کر بڑے پیر صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے) آنے سے پہلے اطلاع ہوتی۔۔۔تو۔۔۔ آپ کے شایانِ شان۔۔۔ استقبال کرتا۔۔۔ ایسا استقبال کرتا۔۔۔کہ۔۔۔کراچی میں۔۔۔ اس سے پہلے۔۔۔ کسی کا نہ ہو ہوگا۔۔۔!''

''ممدو میاں۔۔۔ آپ کی۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہاری۔۔۔ عاجزی۔۔۔اور۔۔۔انکساری نے۔۔۔ مجھے۔۔۔ جو۔۔۔تقویت۔۔۔اور طمانیت بخشی ہے۔۔۔ساری دنیا کی دولت۔۔۔مل کر بھی۔۔۔ مجھے۔۔۔نہیں دے سکتی۔۔۔!''

''کراچی۔۔۔ کب تشریف آوری ہوئی۔۔۔؟''(چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے)

''قریب دو ہفتے ہو گئے۔۔۔!''

''اوہ میرے خدا۔۔۔ دو ہفتے سے۔۔۔ آپ کراچی میں قیام فرما ہیں۔۔۔اور۔۔۔ میں محروم رہا۔۔۔!''(دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر کفِ افسوس ملتے ہوئے)

''بس میاں۔۔۔ جس کام کے لیے۔۔۔ جو۔۔۔ وقت مقرر ہوتا ہے۔۔۔ وہ کام۔۔۔ اُسی وقت ہوتا ہے۔۔۔ اللہ کے حکم کے بغیر۔۔۔ پرندہ بھی۔۔۔ پر نہیں مار سکتا۔۔۔!''

'' جی۔۔۔ جی۔۔۔ بے شک۔۔۔ بے شک۔۔۔ درست فرمایا۔۔۔ دہلی میں۔۔۔ سب خیریت ہے نا۔۔۔!''

''ہاں میاں۔۔۔ آپ کی دعا سے۔۔۔ سب خیریت ہے۔۔۔ یہ اپنے ۔۔۔ برخوردار ہیں نا۔۔۔ اپنی پھوپھو کے اصرار پر۔۔۔ لاہور چلے آئے۔۔۔!''

''ماشاءاللہ۔۔۔ بہت خوب۔۔۔ کب کی بات ہے۔۔۔؟''

''کئی سال ہو گئے۔۔۔ کیوں میاں۔۔۔ کب آئے تھے تم لاہور۔۔۔؟''

''اگلے مہینے۔۔۔ چار سال ہو جائیں گے۔۔۔!''

''اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ اس کا مطلب۔۔۔ تو۔۔۔ یہ ہوا۔۔۔ کہ۔۔۔ آپ مستقل طور پر پاکستان آ گئے ہیں۔۔۔!''

''جی۔۔۔ جی۔۔۔ آپ کا اندازہ درست ہے۔۔۔!''(بڑے پیر صاحب نے ہاں میں ہاں ملائی)

''اتنے عرصے میں ایک بار بھی۔۔۔ آپ کو اپنے نے ممدو میاں کی یاد نہ آئی۔۔۔ جتنا میں نے آپ کو گود کھلایا ہے۔۔۔ اتنا شاید ہی۔۔۔ کسی نے کھلایا ہو۔۔۔!''

''بے شک۔۔۔ بے شک۔۔۔ اس میں۔۔۔ تو۔۔۔ دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں۔۔۔ وہ۔۔۔ لوری یاد ہے۔۔۔ جو۔۔۔ تم ۔۔۔ عمران میاں کو سلانے کے لیے۔۔۔ سنایا کرتے تھے۔۔۔!''

''جی۔۔۔ جی۔۔۔ خوب یاد ہے۔۔۔ خوب یاد ہے۔۔۔!''

آمنہ بی بی کے گلشن میں آئی ہے تازہ بہار
پڑھتے ہیں صلی اللہ وسلم آج در و دیوار نبی جی
اللہ اللہ اللہ ھو لا الہٰ الا ھو

بارہ ربیع الاول کو وہ آیا در یتیم
ماہ نبوت مہر رسالت، صاحب خلق عظیم نبی جی
اللہ اللہ اللہ ھو لا الہٰ الا ھو

حامد و محمود اور محمد دو جگ کا سردار
جان سے پیارا راج دلارا رحمت کی سرکار نبی جی
اللہ اللہ اللہ ھو لا الہٰ الا ھو

یٰسین و طٰہٰ کملی والا قرآن کی تفسیر حاضر و ناظر،
شاہد و قاسم آیا سراج منیر نبی جی
اللہ اللہ اللہ ھو لا الہٰ الا ھو

اول و آخر سب کچھ جانے دیکھے بعید و قریب
غیب کی خبریں دینے والا اللہ کا پیارا حبیب نبی جی
اللہ اللہ اللہ ھو لا الہٰ الا ھو

دور بلائیں کرنے والا امت کا غم خوار
حافظ و حامی، شافع و نافع رحمت کی سرکار نبی جی
اللہ للہ اللہ ھو لا الہٰ الا ھو

پیاری صورت ہنستا چہرہ منہ سے جھڑتے پھول
نور کا پتلا چاند سا مکھڑا حق کا پیارا رسول
نبی جی اللہ اللہ اللہ ھو لا الہٰ الا ھو

کفر و شرک کی کالی گھٹیائیں ہو گئیں ساری دور
مشرق و مغرب و دنیا اندر ہو گیا نور ہی نور نبی جی
اللہ اللہ اللہ ھو لا الہٰ الا ھو

جبریل آئے جھولا جھلانے لوری دے ذیشان
سو جا سو جا رحمت عالم میں تیرے قربان نبی جی
اللہ اللہ اللہ ھو لا الہٰ الا ھو

''ہاں۔۔۔ تو۔۔۔ عمران میاں۔۔۔ مستقل قیام لاہور میں ہے آپ کا۔۔۔ یا۔۔۔ کراچی میں۔۔۔؟''

''جی۔۔۔ وہ۔۔۔ میں۔۔۔!''

''پہلے لاہور میں تھا۔۔۔ اب کراچی آ گئے ہیں۔۔۔!''(عمران کی ہچکچاہٹ کو بھانپ کر لقمہ دیتے ہوئے)

''اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ ماشاءاللہ۔۔۔ کسی قسم کا۔۔۔ کوئی مسئلہ۔۔۔ کوئی کام۔۔۔ کوئی حاجت ہو۔۔۔ تو۔۔۔ میرے لیے۔۔۔ سعادت سے کم نہ ہو گی۔۔۔ بلکہ۔۔۔ میں۔۔۔ تو۔۔۔ کہوں گا۔۔۔ کہ۔۔۔ آپ۔۔۔ میرے پاس ہی آ جائیے۔۔۔ سب کچھ۔۔۔ آپ کا ہے۔۔۔ سب کچھ۔۔۔!''

''اللہ سلامت رکھے۔۔۔تمہیں۔۔۔اور۔۔۔تمہارے بچوں کو۔۔۔ بس۔۔۔کچھ ایسا کرو۔۔۔کہ۔۔۔عمران میاں کی۔۔۔روزی کا باعزت وسیلہ ہوجائے۔۔۔!''

''لاحول ولاقوۃ۔۔۔لعنت ہے مجھ پر۔۔۔اور۔۔۔میرے خاندان پر۔۔۔بس۔۔۔یوں جایئے۔۔۔جس کرسی پر۔۔۔آپ تشریف فرما ہیں۔۔۔ ایسی ہی ایک کرسی پر۔۔۔کل سے ۔۔۔عمران میاں۔۔۔ براجمان ہوں گے۔۔۔آپ کی اجازت سے۔۔۔عمران میاں۔۔۔کہیں اور۔۔۔رہنے کے بجائے۔۔۔میرے گھر۔۔۔میرا مطلب ہے۔۔۔اپنے گھر رہیں گے۔۔۔!''

''جیتے رہو۔۔۔ممدو میاں۔۔۔ جیتے رہو۔۔۔اللہ رب کریم۔۔۔ تمہیں اتنا نوازیں۔۔۔کہ۔۔۔تم۔۔۔رکھ۔۔۔رکھ کر۔۔۔بھولو۔۔۔!''

☆

''تمہارا۔۔۔تو۔۔۔جیک پوٹ لگ گیا۔۔۔!''

''ایسا ویسا۔۔۔ یوں کہیے۔۔۔ ۔۔۔ الہ دین کا چراغ ہاتھ لگ گیا۔۔۔الہ دین کا۔۔۔!''

''اچھا۔۔۔الہ دین کا چراغ۔۔۔وہ کیسے۔۔۔؟''

''دوسرے دن سے۔۔۔ممدو میاں کے ساتھ والے کمرے میں۔۔۔ ہمارے لیے۔۔۔ نئی نکور میز کرسی۔۔۔ ٹیلی فون۔۔۔ چپڑاسی۔۔۔ چوکیدار۔۔۔کلرک۔۔۔خزانچی۔۔۔منیجر۔۔۔سب آگے پیچھے۔۔۔کوئی سلام کر رہا ہے۔۔۔کوئی چائے لا رہا ہے۔۔۔کوئی سگریٹ کے برانڈ کی بابت دریافت کر رہا ہے۔۔۔اور۔۔۔تو۔۔۔اور۔۔۔تیسرے دن۔۔۔منیجر صاحب چلے آ رہے ہیں ہاتھ میں ایک فارم پکڑے۔۔۔میرے سامنے فارم بڑھاتے ہوئے بولے:

سر۔۔۔اس خانے میں۔۔۔اپنی تنخواہ بھر دیجیے۔۔۔!''

''میں نے حیران ہوکر کہا۔۔۔اپنی تنخواہ میں کیسے بھر سکتا ہوں۔۔۔'' میرے جواب پر بولے:

''سیٹھ صاحب کا حکم ہے۔۔۔!''

''اچھا۔۔۔تو۔۔۔بھر دی تم نے۔۔۔!''

''آپ تنخواہ بھرنے کی بات کر رہے ہیں۔۔۔میری۔۔۔تو۔۔۔سٹّی گم ہوگئی تھی۔۔۔!''

''پھر۔۔۔؟''

''میں نے منیجر صاحب سے۔۔۔ صاف ۔۔۔ صاف ۔۔۔ کہہ دیا۔۔۔یہ میں نہیں کر سکتا۔۔۔ممدو میاں۔۔۔سوری۔۔۔یہ کام سیٹھ صاحب کا ہے۔۔۔جو۔۔۔فیصلہ سیٹھ صاحب کریں گے۔۔۔مجھے منظور ہوگا۔۔۔!''

''پھر کتنی تنخواہ مقرر کی سیٹھ صاحب نے۔۔۔؟''

''میاں۔۔۔کام دھیلے کا نہیں۔۔۔اور۔۔۔تنخواہ پورے پانچ صد روپے۔۔۔!''

''اُس زمانے میں۔۔۔ پانچ سو روپے۔۔۔ ہینڈسم اماؤنٹ تھی۔۔۔!''

''وہ۔۔۔تو۔۔۔ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔۔۔ مسئلہ یہ گھمبیر تھا۔۔۔ کہ۔۔۔ پانچ سو روپیہ مہینہ ۔۔۔ میں خرچ کہاں کروں۔۔۔ رہائش۔۔۔ کھانا۔۔۔پینا۔۔۔چائے۔۔۔سگریٹ۔۔۔حتیٰ کہ۔۔۔آنا۔۔۔جانا۔۔۔ سب۔۔۔فری تھا۔۔۔!''

''ماننا پڑے گا۔۔۔کہ۔۔۔قسمت کے دھنی ہو تم۔۔۔!''

''ہائے۔۔۔نا یاد کرایئے۔۔۔'' ناصر کاظمی یاد آنے لگے ہیں:

گذر گئے ہیں جو خوشبوئے رائیگاں کی طرح
وہ چند روز ، میری زندگی کا حاصل تھے

تو۔۔۔دلہا بھائی۔۔۔سوری۔۔۔سو۔۔۔ بھائی جان۔۔۔ایک ماہ تک۔۔۔کام کے نام پر۔۔۔ تنکا بھی نہ توڑا۔۔۔ دوسرا مہینہ شروع ہوتے ہی۔۔۔ممدو میاں نے بلا بھیجا۔۔۔ممدو میاں کا پہلا سوال تھا۔۔۔کہ۔۔۔میں دفتری کام میں دلچسپی لے رہا ہوں۔۔۔کہ۔۔۔نہیں۔۔۔ جواب میں عرض کیا۔۔۔ابھی تک مجھے کوئی کام نہیں دیا گیا۔۔۔میری بات سنتے ہی فون پر منیجر صاحب کو طلب کر کے ہدایت دی۔۔۔کہ۔۔۔منیجر صاحب۔۔۔مجھے۔۔۔بطور اسسٹنٹ۔۔۔اپنے ساتھ۔۔۔کام پر لگائیں۔۔۔فیکٹری۔۔۔مارکیٹ۔۔۔ گودام۔۔۔جہاں بھی جائیں۔۔۔مجھے نہ صرف ساتھ لے کر جائیں۔۔۔ بلکہ ۔۔۔ہر کام کی باریکیاں بھی سکھائیں۔۔۔بقول ضیا عظیم آبادی:''

منزل ملے ملے نہ ملے یہ الگ بات ہے
لیکن ہمارے جسم پر گردِ سفر تو ہو

''تو پھر ۔۔۔ جناب کے حصہ میں منزل آئی۔۔۔ یا۔۔۔ گردِ سفر۔۔۔؟''

''منزل جناب۔۔۔منزل ۔۔۔ وہ بھی۔۔۔شادی خانہ آبادی کی شکل میں۔۔۔!''

''شادی۔۔۔تمہاری۔۔۔؟''

''جناب شادی۔۔۔ اور۔۔۔ ہماری۔۔۔ سیٹھ محمد علی صاحب نے۔۔۔ ماہ بدولت کو۔۔۔اپنی فرزندی میں لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔۔۔ تو۔۔۔ابّا میاں نے۔۔۔خوشی ۔۔۔خوشی ۔۔۔رشتہ منظور کرتے ہوئے۔۔۔ شادی کی تاریخ۔۔۔پکّی کر دی۔۔۔!''

''شادی سے قبل۔۔۔سوسائٹی میں۔۔۔ نیا گھر خریدا گیا۔۔۔ بیٹی کو جہیز میں دینے کے لیے۔۔۔ اس کے علاوہ۔۔۔ نئی گاڑی۔۔۔ اور۔۔۔ نیا کاروبار۔۔۔دے کر۔۔۔ہم میاں بیوی کو۔۔۔کُلّی طور پر خود مختار کر دیا۔۔۔!''

خواجہ حیدر علی آتش کی زبان میں:

ہوائے دور مے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

☆

''سب کچھ اتنا زبردست ۔۔۔ اور ۔۔۔ شاندار چل رہا تھا ۔۔۔ تو ۔۔۔ کہانی میں ۔۔۔ یوٹرن ۔۔۔ کب ۔۔۔ اور ۔۔۔ کیونکر در آیا ۔۔۔؟''

''آہ ۔۔۔ کہانی میں ۔۔۔ یوٹرن ۔۔۔ اُس وقت آیا ۔۔۔ جب ہم نے ۔۔۔ قائداعظم کا فرمان ۔۔۔ لے کے رہیں گے پاکستان کو ۔۔۔ دے کے رہیں گے پاکستان میں بدلنے کی ٹھانی ۔۔۔!''

''بات واضح نہیں ہوئی ۔۔۔!''

شاید نئے سفر کی کہانی لکھیں گے لوگ
پانی کو خون، خون کو پانی لکھیں گے لوگ

''کس سفر کی جانب اشارہ ہے جناب کا ۔۔۔؟''

''جناب اشارہ کرنے والے ہیں انجم بارہ بنکوی ۔۔۔ اور ۔۔۔ داستان ہے ۔۔۔ ہماری تباہی کی ۔۔۔!''

''تمہاری تباہی ۔۔۔ مطلب ۔۔۔؟''

ہماری سے مراد ۔۔۔ کوئی ایک فرد نہیں ۔۔۔ پورا معاشرہ ہے ۔۔۔ وہ معاشرہ ۔۔۔ جس کا شمار ۔۔۔ بانیانِ پاکستان میں ہوا کرتا تھا ۔۔۔ وہ معاشرہ ۔۔۔ جو وطن عزیز کا ۔۔۔ سب سے پڑھا لکھا ۔۔۔ ہنر مند ۔۔۔ اور ۔۔۔ روشن ۔۔۔ فکر ۔۔۔ و ۔۔۔ روشن خیال ۔۔۔ معاشرہ کہلاتا تھا ۔۔۔!''

''بات کچھ کچھ سمجھ آنے لگی ہے ۔۔۔!''

''سب کچھ ۔۔۔ بڑی سبک روی سے ۔۔۔ آگے ۔۔۔ اور ۔۔۔ آگے ۔۔۔ بلکہ ۔۔۔ بلندی ۔۔۔ کی جانب گامزن تھا ۔۔۔ کہ ۔۔۔ کسی شاطر ۔۔۔ بلکہ ۔۔۔ فاطر ۔۔۔ دماغ نے ۔۔۔ سب کچھ ہڑپنے ۔۔۔ یا ۔۔۔ ملیا میٹ ۔۔۔ کرنے کی غرض سے ۔۔۔ ہجرت کے حوالے کی پھلجڑی ۔۔۔ قوم کے ۔۔۔ لونڈے لپاڑوں کو ۔۔۔ تھما دی ۔۔۔ ہم بھی ۔۔۔ اُس پھلجڑی کی ۔۔۔ چٹاپٹ سے ۔۔۔ متاثر ہونے والوں کی اوّل صف میں شامل تھے ۔۔۔ ہمارے سر میں بھی ۔۔۔ اپنا آپ منوانے کا بھوت ۔۔۔ کچھ اس طور سوار تھا ۔۔۔ کہ ۔۔۔ تن ۔۔۔ من ۔۔۔ دھن سے ۔۔۔ اُن دیکھے ۔۔۔ اور ۔۔۔ انجانے ۔۔۔ خواب کی تعبیر ۔۔۔ تلاش کرنے میں ۔۔۔ مگن ہو گئے ۔۔۔ بات سینکڑوں سے شروع ہو کر ۔۔۔ ہزاروں ۔۔۔ لاکھوں تک جا پہنچی ۔۔۔ یہ ایسا اونٹ تھا ۔۔۔ جس کا سر ۔۔۔ تو ۔۔۔ ہماری مرضی ۔۔۔ و ۔۔۔ منشا سے ۔۔۔ خیمے میں داخل ہوا ۔۔۔ سارا ۔۔۔ کا ۔۔۔ سارا اونٹ ۔۔۔ کب ۔۔۔ اور ۔۔۔ کس طور ۔۔۔ خیمے میں براجمان ہوا ۔۔۔ اس کی ہمیں ۔۔۔ خبر تک نہ ہوئی ۔۔۔ کیا فانی کو ہم سے پہلے ۔۔۔ ہمارے حالات کی ۔۔۔ بھنک لگ گئی تھی:''

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

''اُس روز ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ اُس روز سے پہلے ۔۔۔ عین مغرب کے بعد ۔۔۔ شکیل ۔۔۔ منیر ۔۔۔ عتیق ۔۔۔ اور ۔۔۔ امتیاز ۔۔۔ اچانک ۔۔۔ ہمارے گھر آن دھمکے ۔۔۔ دریافت کرنے پر ۔۔۔ صرف اتنا بتلایا ۔۔۔ کہ ۔۔۔ پولیس کی آنکھ سے اوجھل ہونے کے لیے ۔۔۔ ایک رات ہمارے مہمان رہیں گے ۔۔۔ کون سی خاطر تھی ۔۔۔ جو ۔۔۔ اس ایک رات میں ۔۔۔ ہم نے اُن کے لیے ۔۔۔ دسترخوان کی زینت نہ بنائی ہو ۔۔۔ کون سا خلوص ۔۔۔ اور ۔۔۔ کونسی اپنائیت تھی ۔۔۔ جو اُس ایک رات میں ۔۔۔ ہم نے ۔۔۔ اُن کی خدمت میں ۔۔۔ پیش نہ کی ہو ۔۔۔ مگر صبح دم ۔۔۔ جس طور ہمیں ۔۔۔ بے دم کر کے ۔۔۔ ہماری ٹانگوں سے جان لیوا مواد باندھ کے ۔۔۔ ہمیں بنک لے جایا گیا ۔۔۔ جس طور ۔۔۔ بنک میں موجود خون پینے کی کمائی کو ۔۔۔ بندوق کی نوک پر ۔۔۔ ہتھیایا گیا ۔۔۔ اُس کے جواب میں ۔۔۔ انسانیت کے پاس ۔۔۔ ماتم کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں بچتا ۔۔۔'' بقول حسرت موہانی:

اُس نا خدا کے ظلم و ستم ہائے کیا کروں
کشتی میری ڈبوئی ہے ساحل کے آس پاس

''احباب کی تسلی ۔۔۔ رشتہ داروں کی دلجوئی ۔۔۔ اور ۔۔۔ محلّہ داروں کی اپنائیت ۔۔۔ دل کو ۔۔۔ قرار دینے کے لیے ۔۔۔ قطعی کافی نہ تھی ۔۔۔ ہر تسلی ۔۔۔ ہر دلجوئی ۔۔۔ اور ۔۔۔ ہر اپنائیت پر دل سے ایک ہی آواز نکلتی''

چلئے اب ایسی جگہ جہاں کوئی نہ ہو
اپنا پرایا مہرباں نا مہرباں کوئی نہ ہو

''پرندہ اُڑان بھرنا چاہتا تھا ۔۔۔ نئی زمین ۔۔۔ اور ۔۔۔ نئے آسمانوں کی چاہ میں ۔۔۔ دور ۔۔۔ بہت دور ۔۔۔ نکل جانا چاہتا تھا ۔۔۔ راستہ سجھائی نہ دیتا تھا ۔۔۔ چہار جانب گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ۔۔۔ اُمید کی ایک کرن ۔۔۔ آرزو کی ایک جھلک ۔۔۔ اور ۔۔۔ مرادوں کی سبیل ۔۔۔ پیر سائیں کی شکل میں نظر آئی ۔۔۔ پیر سائیں کی زبان جتنی میٹھی تھی ۔۔۔ چھری اُس سے کئی گنا تیز ۔۔۔ اور ۔۔۔ کئی گنا ۔۔۔ بے رحم ۔۔۔ پر پیر سائیں ۔۔۔ پرندے کی پرواز کو ۔۔۔ نہ صرف سمت ۔۔۔ بلکہ ۔۔۔ منزلِ مقصود تک پہنچانے پر قادر تھے ۔۔۔ مگر ۔۔۔ اُن کا مطالبہ ۔۔۔ بھاری مطالبہ ۔۔۔ کیونکر پورا کیا جائے ۔۔۔ اس کا حل بھی پیر سائیں نے ۔۔۔ قرضہ چکانے کی شرط پر ۔۔۔ مکان اپنے نام کرا کر نکالا ۔۔۔ اور ۔۔۔ یوں ۔۔۔ بے بال و پر پرندوں کو اذنِ پرواز ملا:''

سوزِ غم دے کے مجھے اُس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

۔جوش ملیح آبادی۔

دیارِ مصر

رعنا کوثر
(نیویارک)

خدا کی بنائی ہوئی سرزمین بہت خوبصورت ہے۔ اس پر گھومنے پھرنے کے مواقع اگر ملیں تو دنیا کی سیر انسان کو بہت سارے عجائبات قدرت سے متعارف کراتی ہے۔ مجھے بھی اللہ تعالی اکثر مواقع فراہم کر دیتا ہے۔ مصر کی سرزمین عجائبات اور تاریخ میں ہونے والے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ وہاں جانے کا اتفاق کچھ یوں ہوا کہ ہماری بھانجی عروج نے اپنی امی کے ساتھ مصر کی سیر کرنے کے لیے دارا اسلام گروپ کا انتخاب کیا۔ یہ ایک اچھا انتخاب تھا کیونکہ اس گروپ کی انتظامیہ کی اکثر تعریف سنی تھی اور یہ لوگ گھومنے پھرنے کے شوقین لوگوں کو نہ صرف لے کر جاتے ہیں بلکہ بہت اچھا ٹور کرواتے ہیں۔ لہذا ہم نے بھی حامی بھر لی۔

نیویارک سے قاہرہ کا سفر کر کے جب ایئرپورٹ پہنچے تو منتظمین نے آگے بڑھ کر استقبال کیا اور ہمارا ویزا ایئرپورٹ پر ہی لگوایا۔ جب باہر نکلے تو موسم بہت خوش گوار تھا۔ ہماری ساتھی امینہ جو نیویارک ایئرپورٹ پر ہی ہم کو مل گئی تھی وہ کچھ گھبرا گئی۔ یہ آسمان اور فضا اتنی گرد آلود یا غبار آلود کیوں ہے؟ انہوں نے ہمارے ٹورسٹ گروپ کے منتظم امجد سے پوچھا جو ہم کو لینے آیا تھا۔ یہ نوجوان جو گورا، لمبا اور بہت اچھے لباس میں تھا۔ اس کو کچھ سمجھ نہیں آیا کیونکہ وہ اس فضا کا عادی تھا لیکن جب ہم آدھے گھنٹے کی مسافت طے کر کے صبح کے دس بجے اپنے نہایت خوبصورت Resort پہنچے تو فضا بہت صاف ہو چکی تھی۔ آسمان صاف نظر آ رہا تھا۔ کھلے کمرے اور پرانے زمانے کا فرنیچر Resort تو خوبصورت اور ماڈرن تھا مگر کمرہ تھوڑا پرانا لگ رہا تھا۔

چلو کون سا دن بھر وہاں رہنا تھا۔ سامان کمرے میں رکھ کر ہم سب ناشتے کے لیے چلے گئے۔ سلائس، انڈے، کیک، پیسٹری کو چھوڑ کر ہم کو تو دیسی ناشتہ کرنا تھا جو عربی سوپ عربی پراٹھوں اور مصری کافی پر مشتمل تھا۔ ناشتے کے بعد امجد نے کہا تھا کہ باہر کی سیر کریں گے۔ ایک مسجد دکھانی ہے اور پرانے مصری بازار سے گزریں گے۔ ہمارے گروپ میں تمام لوگوں سے ہوٹل کے لاؤنج میں ملاقات ہو گئی۔ جن میں گیارہ لوگ پاکستانی تھے جو ہماری طرح امریکہ میں آباد ہیں جو کہ مختلف سٹیٹ سے آئے تھے۔ دو افریقن امریکن مسلمان اور ایک سیریا کے میاں بیوی اور ان کی بیٹی دو ہیوسٹن سے تھے یوں سب ملا کر انیس لوگوں کا گروپ تھا۔ اس وقت لابی میں چند لوگوں سے ملاقات ہوئی کیونکہ ابھی سب لوگ آئے نہیں تھے۔ جو چند لوگ تھے وہ سب باہر نکل گئے۔ ہوٹل سے گاڑی میں ایک مسجد پہنچے۔ اس کا نام تو ذہن سے نکل گیا مگر یہ ایک نہایت قدیمی مسجد تھی۔ وہاں نماز مغرب پڑھ کر ہم بازار میں نکل گئے۔ چھوٹی چھوٹی گلیاں پتھر سے بنے ہوئے فرش اور سخت پتھروں سے بنے ہوئے قدیم گھر بازاروں کی رونق کو تو سب ہی جانتے ہیں۔ روشنی، آوازیں، اپنی طرف بلاتے دکاندار، ہر طرف ڈیکوریشن کے سامان، مصری کڑھائی والی قمیض کرتے اور عبائے، مصری زیورات کیا کچھ اس بازار میں نہ تھا۔ ساتھ میں بھاؤ تاؤ بھی جاری۔ ہر چیز ڈالر میں بک رہی تھی۔ ڈالر کے دو کرتے، دس ڈالر کے ڈیکوریشن کا سامان دکاندار ہاتھوں میں پکڑا رہے تھے۔ ہم حیران تھے یہاں کا سکہ تو مصری پونڈ کہلاتا ہے پھر ہر چیز ڈالر میں کیوں بتائی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں سیاح بہت جاتے ہیں اس لیے دکاندار ڈالر ہی بتلا دیتے ہیں۔ جگہ جگہ ہمارا گائیڈ ہمیں کھڑا کر کے شہر کی تاریخی بلڈنگز دکھانے لگتا۔ یہ بادشاہوں اور امراء کے دفاتر تھے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے محلات تھے۔ مصر کے اس بازار میں مجسمے یا قدیم زمانے کے بنائے ہوئے بت بھی تھے اتنے قدیم اور مضبوط کے بس نظر نہیں ٹھہر رہی تھی۔

جب میں قاہرہ کے ایئرپورٹ پر اتری تو یقین نہیں آیا کہ یہ وہ زمین ہے جہاں کے واقعات اور قصے سنتے آئے ہیں۔ یہاں ہمارے نبیوں نے وقت گزارا۔ پانچ ہزار سال پہلے فرعون نسل در نسل یہاں حکومت کرتے رہے۔ یہاں دریائے نیل بہہ رہا ہے۔ ہمارے گائیڈ کا کہنا تھا کہ مصر والے دریائے نیل کے ارد گرد اب تک رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ یہاں سے دور گئے تو اس کی برکت سے محروم ہو جائیں گے۔ گہرے نیلے رنگ کا یہ دریا اپنے عام انداز میں بہہ رہا ہے مگر اپنے اندر بہت ساری تاریخ سموئے ہوئے ہے۔ جب ہم چھوٹے بحری جہاز پر اس نیلے دریا میں سفر کر رہے تھے تو دل کی عجیب کیفیت تھی۔ یہ وہی دریا تھا جہاں حضرت موسی کا گزر ہوا۔ یہ وہی دریا تھا جہاں حضرت موسی کو باسکٹ میں رکھ کر ان کی والدہ نے بہا دیا تھا۔ جب ہم ایک چھوٹی کشتی میں بیٹھ کر اسی دریا میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں گئے تو سراب کا منظر عجیب تھا۔ خشکی اور پانی کا عجیب امتزاج تھا۔ ایک گاؤں جسے عمبین ویلیج کہتے ہیں وہاں پر پرانے مصری آباد ہیں۔ یہ سیاہ فام لوگ ہیں جو کبھی اس گاؤں سے نہیں نکلے۔ شادیاں بھی آپس میں کرتے ہیں اور محبت پیار سے رہتے ہیں۔ پکے وسیع دالان اور کنویں ان گھروں کا خاصہ ہیں۔ جب ہم کشتی سے اترے تو ہماری گائیڈ نے بتایا کہ اس نے ایک گھر میں ہم سب کو لے کر جانا ہے تا کہ ہم یہاں کا لوکل گھر دیکھ لیں۔ وہ گھر پہاڑی کی اونچائی پر تھا۔ اس لیے اس مقصد کے لیے ایک چار سیٹ والا رکشہ کیا گیا جسے وہ لوگ ٹک ٹک کہتے تھے۔ تین چار ٹک ٹک کیے گئے جو ہمیں لے کر چلے۔ پیچھے سے گاؤں کے بچے شور مچاتے آ رہے تھے، بھاگ رہے تھے اور دکانوں سے لوگ نکل کر دیکھ رہے تھے۔ آخر ہم اس گھر کے سامنے پہنچ ہی گئے۔ ٹک ٹک کی سواری بہت مزیدار تھی۔ راستے میں اونٹ بھی نظر آ رہے تھے۔ مصر میں غربت بھی بہت ہے۔ بہت سارے غریب بچے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ جو کہ غریب تو ہیں لیکن بے خوف اور خوب بھاگتے دوڑتے اچھلتے کودتے۔ مجھے یاد آیا کہ جب ہم کشتی میں اس گاؤں میں آ رہے تھے تو بہت سارے چھوٹے بچے جو زبردست تیراک تھے ہماری کشتی کو پکڑ کر عربی میں گانے گا رہے تھے۔ یہ گانے سمجھ میں تو نہیں آ رہے تھے مگر اتنی اچھی اوازیں تھیں اور ایسا ترنم تھا کہ سب نے ان کو خوب پیسے دیے۔

خیر تو بات ہو رہی تھی گاؤں کے اس گھر کی جہاں ہم پہنچے تھے۔ یہ بہت وسیع گھر تھا۔ جہاں ہماری خوب خاطر مدارت ہوئی۔

قارئین میں مصر کی سرزمین کے اسرار تو نہیں کھول سکتی اس کی تاریخ بھی آپ پڑھ سکتے ہیں۔ میں نے جو دیکھا جو محسوس کیا وہی بیان کر رہی ہوں۔

جامعہ الازہر ایک ایسا ادارہ ہے جہاں لوگوں کی زندگی بدل جاتی ہے اگر وہ علم حاصل کرنے کی غرض سے جائیں۔ یہ ایک جانب یونیورسٹی ہے جہاں دنیاوی علوم کی تعلیم کے دروازے کھلے ہیں۔ جب آپ دوسری جانب جائیں تو ایک خوبصورت مسجد کے مینار نظر آئیں گے۔ جب آپ مسجد کے اندر داخل ہوں گے تو وسیع دالان نظر آئے گا۔ اس وسیع و عریض جگہ پر عید بقرعید کی نمازیں ہوتی ہیں۔ اس کے اندر جائیں تو بہت بڑا ہال ہے جہاں لوگ نماز مغرب ادا کر رہے تھے۔ ہمارے گائیڈ نے ایک ممبر دکھایا جو ہزاروں سال پرانا تھا۔ جہاں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ تبدیل نہیں کی گئی تھی۔ اسی حال میں جگہ جگہ طلباء تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مختلف حصے بنائے گئے تھے جہاں بینچوں پر طلباء و طالبات بیٹھے تھے تقریباً پندرہ کے قریب طالب علم اور کرسیوں پر ان کے استاد بیٹھے تھے۔ یہاں قرآن و حدیث کی تعلیم دی جا رہی تھی۔

ہم اس کے بعد گھر آنے کے لیے مصر کے قدیم بازار سے گزرے جہاں بادشاہوں کے قلعے تھے۔ سخت پتھر سے بنے ہوئے۔ اسی بازار سے گزرتے ہوئے ہم ایک مسجد میں عشاء کی نماز ادا کرنے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت کے مسلمان بادشاہ نے مسجد کی تعمیر کرائی مگر مسجد تعمیر ہونے کے بعد ارد گرد کھدائی سے بہت سارے بت نکلے۔ معلوم ہوا کہ یہ مسجد بھی کسی زمانے میں بت خانہ تھی۔ جب اس کی کھڑکیوں سے باہر جھانکو تو یوں لگتا ہے کہ ہر طرف بڑے بڑے بت کھڑے ہیں جو اس زمانے کے بادشاہوں کے تھے۔ رات کو تھک ہار کر سوئے کہ دوسرے دن اہرام مصر دیکھنے جانا تھا۔ صبح ہی صبح پورا گروپ تیار ہو کر بس میں بیٹھا۔ اب تو یہ جگہ شہر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ راستے میں وہ مسجد نظر آئی جو سلطان صلاح الدین ایوبی نے بنائی تھی۔ بلیو میناروں والی ترکش مسجد کی طرح سلطان صلاح الدین ایوبی کا قلعہ بھی وسیع و عریض ہے جو کہ سخت پتھروں سے بنا ہوا ہے۔ آج تک اسی طرح اپنی جگہ پر ہے۔ یہ قلعے جنگ کے دنوں میں اپنے عوام کی حفاظت کرتے تھے۔

اہرام مصر ایک عجوبہ ایک حیرت انگیز شاہکار جس کے اندر مصری اپنی لاشیں رکھتے تھے۔ پانچ ہزار سال پہلے یہ عقیدہ تھا کہ جب مرنے کے بعد خدا کے روبرو پیش ہوں تو اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ اپنے زیورات کے ساتھ۔ اس لیے اس طرح کے اہرام بنائے گئے تھے جو کہ ان کی لاشوں کو خراب نہ کریں۔ اس پر مصالحے لگائے جاتے اور پھر زیورات کے ساتھ یہاں رکھ دیا جاتا۔ یہ لاشیں ابھی تک وہاں ہیں۔ یہ تو بادشاہوں کے اہرام تھے اس لیے اتنے بڑے تھے مگر اس طرح کے چھوٹے اہرام بھی بنائے جاتے۔ ہر کام حیثیت کے حساب سے ہوتا۔ خدشہ یہ تھا کہ یہ زیورات اور خزانے چوری ہو سکتے ہیں اس لیے پہاڑیوں کو کاٹ کر ایسی شکل دی گئی کہ اندر جانا آسان نہ ہو۔ یہ Pyramids بہترین آرٹ کا نمونہ بھی ہیں اور اس زمانے کے کلچر سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ آج تک کھدائی کے دوران اس زمانے کے بادشاہوں کی لاشیں خزانہ سمیت نکل رہی ہیں۔

سب سے حیرت انگیز وہ میوزیم وہ ہے جہاں بادشاہ یا فرعون کے مردہ جسموں کو ایک خاص مصالحہ لگا کر ان کے خزانوں سمیت دفن کر دیا جاتا تھا۔ یہ فرعون کوئی ایک نہیں ہے بلکہ ایک کے بعد ایک مختلف بادشاہ آتے گئے اور حکومت کرتے رہے۔ ان کے بڑے بڑے بت پورے مصر میں موجود ہیں۔ خاص طور سے اس علاقے میں جو ان کا دارالخلافہ تھا اس کے علاوہ ان کے مرنے کے بعد ان کو خاص مصالحہ لگا کر سونے کے تابوت میں بند کر کے ایک مقبرہ بنا کر یا اہرام بنا کر اس میں رکھ دیا جاتا۔ ساتھ ہی سونا چاندی اور موتی ان کے زیورات سب ہی کچھ رکھا جاتا۔ یہ لاشیں اور خزانے جب بھی برآمد ہوئے ان کو باقاعدہ میوزیم میں گلاس فریم میں رکھا جاتا ہے۔ جو آج بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔ یہ بادشاہ اپنے آپ کو خدا بھی کہلواتے تھے کیونکہ یہ عوام کا خاص خیال کرتے تھے مگر بعد میں ایسے بت بھی ہیں جن کے ذریعے یہ ظاہر کیا گیا کہ یہ بھی انسان ہیں تھکتے ہیں بیمار ہوتے ہیں۔

نیشنل میوزیم قاہرہ میں فرعون کا وہ جسم رکھا ہے جو دریا میں غرق ہو گیا تھا۔ وہ بھی اپنے خدوخال سمیت موجود ہے۔ ایک خلقت ان سب کو دیکھنے آتی ہے یہ ایسا عجوبہ ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

قاہرہ میں ہمارے گائیڈ نے ہمیں خوبصورت Resort میں پہنچا کر اعلان کیا کہ اب صبح کے لیے تیاری کر لیں۔ کل ایک اور شہر Lexur کی طرف ہوائی جہاز سے جانا تھا۔ سفر تو ایک گھنٹے کا تھا مگر صبح سات بجے کی فلائٹ تھی۔ چار بجے صبح سب لابی میں موجود تھے۔ ہمارے گائیڈ امجد نے ناشتہ کے بکس سب کو دیئے۔ صبح اٹھنے کی تھکن کسی کو بھی نہ تھی۔ سب خوش تھے۔ جب ہم ائیر پورٹ پہنچے تو وہاں افراتفری تھی کچھ پتہ نہ تھا کہ آپ کا گائیڈ نہ ہو تو فلائٹ ہی چھوٹ جائے۔ ایک بس کے ذریعے Nile Air تک پہنچے اور پھر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جہاز کے اندر۔ چھوٹے سے جہاز نے ہم کو Lexur پہنچا دیا۔

یہ ایک قدیمی شہر ہے جو بادشاہوں کا گڑھ تھا۔ یہاں پر بہت ہریالی اور موسم خوشگوار تھا۔ یہ شہر وہ ہے جس میں بڑے بڑے فرعونوں نے بیٹھ کر حکومت کی۔ ان کے مجسمے ان کے محلات ہمیں حیران کر دیتے ہیں۔ ابھی تو ہم سب کو بھوک لگی ہوئی تھی اس لیے ہمارا گائیڈ ہمیں لے کر ایک پرانے طرز کے ریسٹورنٹ میں لے گیا جہاں گرل چکن اور گرل مچھلی کی چوائس تھی۔ سب نے دل بھر کر کھانا کھایا اور پھر وہاں سے نکل کر ہم سب ہوٹل آ گئے۔ نہا دھو کر آرام کر کے ایک مقبرہ پر پہنچے۔ سو سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے تھے۔ رنگا رنگ تصاویر سے پُر یہ مقبرہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔ یہ تصاویر لال، پیلے اور نیلے رنگوں سے بنائی گئی تھیں کیونکہ اس زمانے میں پتھروں سے رنگ نکال کر تصاویر میں بھرے جاتے تھے۔ یہ تصاویر ان کے دیوی دیویوں کی تھیں۔ یہ ایک پوری سرنگ تھی جس سے نیچے اتر کر بادشاہ کی حنوط شدہ ممی رکھی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس بادشاہ کا مقبرہ ڈھونڈنے میں دس سال لگ گئے۔ جب کھدائی کی اور اندر پہنچے تو خزانہ نظر آیا جو ان کے ساتھ دفنایا جاتا تھا۔ اس میں سونا بھرا ہوا تھا اس کے علاوہ فرنیچر، کھانا، اسلحہ بے شمار کپڑے اور زیورات پائے گئے

کیونکہ بادشاہ کے ساتھ اس کی تمام استعمال شدہ چیزیں بھی دفنا دی جاتی تھیں۔اس کے لیے پوری ایک انیکسی بنائی گئی تھی۔ پہاڑیوں کے درمیان یہ مقبرہ نہ جانے کیسے بنایا گیا ہوگا۔کہاں سے سامان لائے ہوں گے نہ گاڑیاں تھیں نہ سڑک۔ پھر اتنے سامان کو نیچے تہ خانے میں پہنچانا یہ سب کارنامے کیسے انجام دیے گئے یہ کسی کو نہیں معلوم۔دس بجے دن اور نومبر کے مہینے میں دھوپ کی تیزی کاٹتی تھی جب یہ مزدور کام کرتے ہوں گے تو دھوپ کی حدت سے کیسے بچتے ہوں گے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ پہاڑیوں پر جو چھوٹے چھوٹے غار بنے ہوئے ہیں یہ ان مزدوروں کے گھر ہیں جو یہاں کام کرتے تھے۔ان مزدوروں کی صحت اور علاج معالجہ کا خیال رکھا جاتا تھا وہ غلام نہیں تھے نہ ہی ان سے غلاموں والا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی بادشاہ Tut ankh Amen کی جو نو سال کی عمر میں بادشاہ بنا اور ۱۹ سال کی عمر میں وفات پا گیا ۔ اس نے 1333-1323 تک حکومت کی۔ وہاں پر جو بھی تصاویر بنی ہوئی ہیں اس کی موت سے دفن کرنے تک ہیں۔تینتیس سو سال پرانی تصاویر ابھی تک کافی تروتازہ ہیں۔اب چونکہ سیّاح بہت جانے لگے ہیں وہاں کی فضا بدل گئی ہے ان کے جوتوں سے مٹی اندر جاتی ہے۔کاربن ڈائی آکسائیڈ بھی بڑھ گئی ہے لوگ ہاتھ بھی لگاتے ہیں اس لیے پینٹنگ بہت مدہم ہوتی جا رہی ہیں۔

اس بادشاہ کو کوئی جلدی بیماری ہوگئی تھی اس کے بعد اس کا انتقال ہوا۔اس کو تین کفن میں دفنایا گیا ہے۔سب سے آخر میں لکڑی کا تابوت تھا اس کے بعد رنگین گلاس میں جڑاؤ پتھر تھے اور سب سے اندر سونا تھا۔خالص سونے کا یہ تابوت اتنی چیزوں سمیت دفنایا گیا تھا۔اس کے سر پہ اور منہ پر سونے کا ماسک تھا۔ جب لوگوں نے اس مقبرے کی کھدائی کی تو فضا خراب ہونے کی وجہ سے لوگ مر گئے۔ کیونکہ وہ اتنے کفن میں لپٹا ہوا تھا مگر لوگوں میں خوف بیٹھ گیا کہ وہاں کچھ ہے۔اس ہسٹری کو سننے کے بعد جب آپ نیچے تہہ خانے میں جاتے ہیں تو ایک سوکھے کالے آدمی کی لاش نظر آتی ہے باقی سب تو میوزیم میں رکھ دیا جاتا ہے۔ یہاں سے نکل کر ہم بڑی بڑی پہاڑیوں کو دیکھ رہے تھے جن پر صبح کی دھوپ چمک رہی تھی اور وہ سنہرے لگ رہے تھے۔

ہم لوگ اپنی بس میں آ کر بیٹھ چکے تھے اور اب لوگوں کو کچھ خریداری بھی کرنی تھی۔ ہمارے گائیڈ پرنس نے ہم کو قاہرہ میں کچھ نہیں خریدنے دیا تھا۔اس کا کہنا تھا کہ یہاں لوٹ مار بہت ہے۔لوگ جھوٹ بول کر خراب مال دے دیتے ہیں۔ دوسرے شہر میں اچھا مال ملے گا مگر ہم کو قاہرہ بہت سستا لگا تھا مگر ایک دوکان پر کھڑے ہوتے تو دوسرے دوکان والے گھیر لیتے۔اس لیے خود سے فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا۔

پرنس نے ہم سب کو ایک دوکان میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ یہ بہت بڑی اور خوبصورت دوکان تھی جس میں سامان بھی بک رہا تھا اور کاریگر اپنا کام بھی کر رہے تھے۔اس دوکان کو سیّاحوں کے لیے بنایا گیا تھا۔قسم قسم کے بادشاہوں کے مجسمے اور اہرام مصر کے تحفے رکھے تھے۔ سیّاح خریدیں اور گھروں کو لے جائیں۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی کاریگروں پر نظر پڑی جو مختلف جار اور گلدان بنانے میں مشغول تھے۔ایک کاریگر جو لمبا عبایہ اور سر پہ پگڑی باندھے تھا ہم سب کو معلومات فراہم کر رہا تھا۔اس جگہ مختلف پتھر رکھے تھے جس پر یہ کاریگر بڑی مہارت سے کام کر رہے تھے اور اپنے باس کے کہنے پر کام کرتے ہوئے عربی زبان میں لہک لہک کر گانے بھی گا رہے تھے۔ بڑا دلچسپ منظر تھا۔ان سب سے فرصت پائی تو دوکان کے اندر گئے ۔ بہت قیمتی مال پڑا تھا لہٰذا قیمت بھی خوب تھی۔لوگ اپنے خاندان اور دوستوں کے لیے چیزیں خریدنا چاہتے ہیں۔ وہاں سے بہت کم لوگوں نے سامان خریدا۔سب کو قاہرہ یاد آ رہا تھا وہاں اتنا مہنگا سامان نہیں تھا مگر پرنس نے کہیں ٹھہرنے ہی نہ دیا۔حالانکہ دوکان پر بہت خوبصورت گلدان، مجسمے اور بہت کچھ تھا۔

پرنس نے بتایا کہ یہ کاریگر خاندان در خاندان اسی فنکاری کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔انہوں نے یہیں اپنی زندگی گزار دی اور اب بھی یہی کام کرتے ہیں ان کو اور کوئی کام آتا بھی نہیں ہے۔

Lexur ایک پر فضا مقام تھا مگر اس سے بھی خوبصورت آسوان ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

Lexur میں ہی ایک اور تاریخی کہانی تھی۔ایک تھی ملکہ اس کا نام تھا ہیٹ شپسٹ (Hat shep sut) یہ ایک بہت بہادر اور سمارٹ عورت تھی۔ اس کے باپ کا نام تھا King thut mase I یہ فرعون کہلاتے تھے اور نسل در نسل ان لوگوں نے بادشاہت کی۔اس کی بیٹی بہت ذہین تھی وہ چاہتا تھا کہ وہ اس ملک کی ملکہ بنے، اس نے اس کی شادی اس کے سوتیلے بھائی سے کر دی جو King Thut mase III تھا یہ اس وقت صرف بارہ سال کی تھی۔ یہ 1473 B.C کی بات ہے۔ یہ بادشاہ اٹھارہ بادشاہوں میں سے چھٹا بادشاہ تھا۔ان کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا انتقال ہو گیا۔کنگ کا ایک چھوٹا بچہ جو دوسری بیوی سے تھا اس کو کنگ کے بعد بادشاہ بننا تھا۔King Thut mase III کے انتقال کے بعد Hat Shep Sut بادشاہ بن گئی جب تک وہ بچہ بڑا نہ ہو جاتا۔ اس نے بہت پاور فل طریقے سے حکومت کی۔اس کا محل پہاڑیوں کے درمیان ہے۔ بے شمار سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جائیں دو منزلہ عمارت۔عمارت اس لیے کہہ رہی ہوں کہ پتھر کے یہ محل بہت عالیشان نہیں تھے۔ یہ ان کی درسگاہیں اور عبادت گاہیں تھیں ان میں ملکہ اور بادشاہ انصاف بھی کرتے تھے اور ملک بھی چلاتے تھے۔ بے شمار دروازے والی یہ دو منزلہ عمارت اور اس کے پیچھے پہاڑیوں کا منظر بہت خوبصورت تھا۔محل شروع ہونے سے بہت پہلے بڑے بڑے بت اس ملکہ کے بنے ہوئے تھے۔ یہ بت ایک خوبصورت عورت کے چہرے والے تھے مگر اس کی داڑھی تھی اور چوڑے شانے تھے۔ چونکہ اس نے بہت سال حکومت کی اس لیے لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ مرد اور عوت دونوں کے روپ میں خدا کی طرف سے بھیجی گئی ہے تا کہ وہ سب پر حکومت کرے۔اس نے تقریباً بیس سال حکومت کی اور بہت کامیاب رہی۔اس نے بہت بڑے بڑے کام اپنے دور میں کیے اور بہت ہر دلعزیز رہی۔اس کا انتقال تقریباً بیالیس سال کی عمر میں ہوا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ملکہ وہی تھی جس نے فرعون کو حضرت موسیٰ کو رکھنے پر قائل

کیا تھا کیونکہ اس کو بات کرنا آتا تھا۔ وہ اپنی ذہانت سے کسی کو بھی قائل کرسکتی تھی۔ یہ ایک بہت ہی اچھا دن تھا کہ ہم نے ایسے کمالات والے لوگوں کے شاندار کارناموں پر عمارات دیکھیں اور ان کی تاریخی حیثیت محسوس کی۔

ایک اور جگہ ہے جس کا نام آسوان ہے۔ Lexur پر ہمارا چھوٹا خوبصورت بحری جہاز ہم سب کی تفریح کا باعث تھا۔ اس کا نام Salacia تھا۔ یہ تین منزلہ تھا۔ نیچے کی منزل میں ہمارے کیبن تھے۔ ایک سیڑھی اوپر چڑھ کر ریسٹورنٹ اور جیولری کی دوکان اور ایک چھوٹی سی شاپ میں وہاں کا علاقائی سامان تھا بیچنے کے لیے۔ یہاں پر کام کرنے والے بہت خوش باش علاقائی لباس یا پینٹ شرٹ میں ملبوس تھے۔ صبح کے ناشتے پر بہت مزہ آتا تمام گروپ سے ملاقات ہو جاتی۔ سب لوگ نئی صبح نئے ولولے کے ساتھ جمع ہوتے۔ تازہ موسمی کا جوس، امرود کا جوس اور نہ جانے کون کون سے جوس ہوتے۔ عربیوں کا سوپ جو کئی دالوں کو ملا کر بنایا ہوا ہوتا ہم سب شوق سے پیتے۔ نئی نئی چیزیں سب لاتے اور ایک دوسرے کو چکھا کر داد وصول کرتے۔ بیرے دندہی سے چائے اور کافی سرو کرتے۔ اب تو جہاز آسوان کی جانب گامزن تھا۔ رات بھر چلا تھا اور ناشتہ کرتے ہوئے سمندر میں ہچکولے کھاتا جہاز اور بہتا پانی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دوپہر کو ہم آسوان پہنچ چکے تھے۔ یہ بھی تاریخ سے پُر ایک خوبصورت شہر ہے۔ جہاں دریائے نیل ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ یہاں کے Temple یعنی کہ پتھروں سے بنائے ہوئے محلات اور عبادت گاہیں ہیں اور ان کی اپنی کہانی ہے۔ جس دوکان میں جاؤ یہی مشروب پلایا جاتا ہے یہ جڑی بوٹی کو ابال کر سرخ رنگ کا مشروب بن جاتا ہے۔ مزیدار بھی ہوتا ہے اور آپ کے اندر حفاظتی قوت کو بڑھاتا ہے۔ لہٰذا نزلہ زکام اور الرجی سے بچے رہتے ہیں۔ جہاں اتنی دھول اڑتی ہو وہاں یہ مشروب یقیناً الرجی اور چھینکوں سے بچاتا ہوگا۔ اس جڑی بوٹی کو Habascus کہتے ہیں۔

مگر اس ہوٹل میں یہ مشروب نہ تھا بلکہ مختلف جوسز تھے اور ساتھ ہی بہت مزے مزے کے کھانے تھے۔ آج کل کا مسئلہ یہ ہے کہ روایتی کھانے بہت کم ملتے ہیں سب امریکی کھانوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں یا پھر کباب بہت نظر آتے ہیں۔ سیخ کباب، لیمب کباب وغیرہ۔ ہماری بھانجی کو ایک بہت خاص ڈش کی تلاش تھی جو عربیوں کی خاص ڈش ہے۔ اس میں مسور کی کالی دال، چاول اور اوپر سے پیاز کا تڑکہ ہوتا ہے مگر وہ کہیں نہ ملی۔ ہمارے آنے کے بعد وہ دو دن اور مصر میں رکی اور یہ سپیشل ڈش کھا کر ہی آئی۔ ہم کو بھی Cruise میں یہ کھانا مل گیا تھا کیونکہ ایک دن سپیشل روایتی کھانا تھا مگر بقول اس کے یہ بس چل چلاؤ ہے آپ اصلی کھائیں تو بہت مزے کا لگے گا۔

کھانے کے بعد رات کو آسوان گھمانے کے بعد ہمارا گروپ واپس جہاز پر آ گیا تھا۔ اور سب شاپنگ میں مصروف ہو گئے تھے۔ ہم نے تو اس چھوٹی سی شاپ سے کاٹن کے حجاب خریدے۔ ہماری بھانجی اور بہن جیولر سے بحث مباحثہ میں مشغول تھیں ان کا کہنا ہے کہ Cruise پر جیولری میں دھوکہ نہیں ہوتا۔ ہم کو جیولری لیتے ہوئے ڈر ہی لگتا ہے۔ میں اکثر زیورات گما ہی دیتی ہوں خاص طور سے یہ انگوٹھیاں اور کانوں کے بُندے۔ مجھے کہنا ہی پڑا سونے چلو مجھے صبح بہت اچھی جگہ جانا ہے سات بجے اٹھنا ہے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ہم ایسی جگہ پہنچے جہاں دریائے نیل کے کنارے بے شمار چھوٹی بڑی خوبصورت کشتیاں کھڑی تھیں۔ موسم بہت خوبصورت تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

ایک حسین کشتی میں ہمارا گروپ بھی سوار ہو گیا۔ اوپر نیلا آسمان اور نیچے نیلا پانی اور اس پر تیرتی ہماری کشتی۔ اصل میں ہم آسوان میں ایک گاؤں کی طرف رواں دواں تھے۔ اس کا نام Nabiel Village ہے۔ راستہ بہت خوبصورت تھا۔ سنہری پہاڑیاں سراب کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ یہ وہی دریائے نیل تھا جو برسوں سے بہہ رہا ہے۔ نہ جانے کتنے نیک لوگ اس سے گزر چکے ہوں گے میں اور میری بہن سوچ رہے تھے۔ باقی لوگ تصویریں لینے میں مشغول تھے یا پھر جیولری خریدنے میں۔ حسین جیولری کا ٹھیلا بھی لگا ہوا تھا۔ کشتی ایک ہوٹل کے پاس سے گزری تو گائیڈ نے بتایا کہ یہ بہت مہنگا ہوٹل ہے۔ ایک رات کا کرایہ نو سے دس ہزار ڈالر ہے۔ اگاتھا کرسٹی نے یہیں رہ کر اپنا ناول Death on nile لکھا تھا۔ یہاں بہت امیر لوگ آ کر ٹھہرتے ہیں اور دریائے نیل کا نظارہ کرتے ہیں۔

کشتی پر بھی ہم طائرانہ نظر ڈال رہے تھے اس کی چھت رنگین دریوں سے سجائی گئی تھی۔ اندر بھی کاٹن کے قالین بچھے ہوئے تھے۔ اب کشتی ایک اور بلڈنگ کے پاس سے گزر رہی تھی۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ یہ آغا خان کی آخری آرام گاہ ہے۔ آغا خان کو ایک زمانے میں بہت خطرناک جوڑوں کا مرض ہو گیا تھا۔ ان کے ڈاکٹر نے کہا کہ آپ کسی ایسے علاقے میں چلے جائیں جہاں دھوپ ہوا اور فضا خشک ہو۔ وہ آسوان میں آ کر رہنے لگے کیونکہ یہاں سورج کی تیزی بہت ہے۔ ان کی طبیعت بہتر ہوئی لوگوں نے ان کی خدمت بھی بہت کی اور یوں انہوں نے نصیحت کی کہ ان کو یہیں دفنایا جائے۔

کشتی لہروں کے دوش پر رواں دواں تھی۔ نیلا سمندر اور دھوپ کی آمیزش بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ بچے ٹولیوں کی صورت میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار آتے اور عربی میں خوبصورت گانے گاتے جن کے بول تو کوئی بھی سمجھنے سے قاصر تھا مگر سب کو بہت پسند آ رہے تھے۔ سب ان کو پیسے دے رہے تھے۔ خوش باش غریب بچے لہک لہک کر گانے گا رہے تھے۔

اب ہماری کشتی اپنے مقام پر پہنچ چکی تھی۔ آہستہ آہستہ کر کے سب کشتی سے باہر آئے اور ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ وہ ہم کو ایک گھر میں لے جانا چاہ رہا ہے جو کہ ڈیڑھ سو سال پرانا ہے۔ نیو بن ویج کے جنوب میں واقع ہے اور سوڈان کے شمال میں ہے۔ یہاں کے لوگ بہت ہی پرانی تہذیب سے وابستہ ہیں جس میں پرانے مصری بادشاہ بھی شامل ہیں۔ یہ ہمیشہ نیل کے کنارے رہتے آئے ہیں ان کی اپنی زبان ہے جس کو نبین کہتے ہیں اور ان کا رہن سہن بہت ہی مختلف ہے۔ ہزاروں سال پرانی تہذیب سے وابستہ یہ لوگ آج بھی خاموشی سے اپنا کلچر قائم رکھے ہوئے ہیں۔ تقریباً دو ہزار نبین مصر میں آباد ہیں۔ اور اپنی تہذیب کو لے کر

چل رہے ہیں۔حالانکہ ان پر بے شمار مسائل آئے اس جگہ پہنچ کر جو مزہ آیا وہ سب کو یاد رہا چونکہ ہم سب کو ایک خاص گھر میں جانا تھا جو پہاڑی کی اونچائی پر تھا اس لیے ہمارے گائیڈ نے چھ سیٹر رکشے تلاش کیے جس کو وہ لوگ ٹک ٹک کہہ رہے تھے ۔مزا آ گیا۔ ہر رکشے میں چھ سوار۔اونچی اونچی سڑکوں سے یہ ٹک ٹک گزر رہی تھی۔ راستے میں بے شمار رنگ برنگے گھر نظر آ رہے تھے۔ یہاں پر ہر کوئی اپنا گھر رنگوں سے سجاتا ہے۔ ہماری ٹک ٹک شور مچاتی گزر رہی تھی۔رنگ برنگی دوکانیں دستکاری باہر لٹکی ہوئی۔رنگ برنگے کپڑے، مٹی والی سڑکیں، ٹک ٹک کے پیچھے شور مچاتے بچے۔ بالآخر ہم اس گھر میں پہنچ گئے۔گھر بہت اونچائی پر تھا اور اسی پر سے پورا شہر نظر آ رہا تھا۔اب ہم گھر میں داخل ہو گئے تھے۔دہلیز سے اندر داخل ہوئے بہت بڑا صحن تھا۔ ہم سب رنگا رنگ کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ایک چوکور میز پر کا جو اور میوے اور مشروب رکھے تھے۔ایک چوڑی سی کرسی پر پرنس بیٹھ گئے تھے۔سب ہنس رہے تھے کہ بادشاہی کرسی پر تو گائیڈ بیٹھ گئے۔اذانیں ہو رہی تھیں۔سب اذان ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے گھر کا رقبہ بہت بڑا تھا۔اندر داخل ہوتے ہی ایک نیلے رنگ کا کنواں تھا جس سے ایک بچہ پانی نکال رہا تھا۔سیڑھیاں چڑھ کر بہت بڑا صحن تھا اور اس کے پیچھے تین کمرے۔ایک کمرہ ان کے بزرگوں کا تھا جس میں ان کے علاقائی کپڑے ٹنگے ہوئے تھے اور چھوٹا سا بیڈ تھا۔کھانا پک رہا تھا کوئلے جل رہے تھے۔ کمروں کی چھتوں پر لال رنگ تھا اور دروازے نیلے رنگ کے تھے۔ایک پرانا کچن جیسا کا ویسا تھا اس میں پرانے زمانے کا ایک اوون تھا۔ کیتلی، پتیلیاں اور ایک چولہا تھا۔ دروازوں کے اوپر کسی جانور کے سینگ ٹنگے تھے۔مغرب ہو چکی تھی سب نماز کی تیاری کر رہے تھے۔غسل خانے جدید طرز کے تھے اور پیچھے کچن بھی نیا بنا دیا گیا تھا جہاں دو عورتیں کام کر رہی تھیں۔ایک کا نام فاطمہ تھا جو کالے سکارف اور عبایے میں تھی اور دوسری رنگین میکسی میں۔ان لوگوں نے ہم کو شام کے قہوے کے ساتھ تل کا حلوہ، گلگلے اور اوون میں پکی روٹیاں ایک تھالی میں پیش کیں۔ان کا گھر بہت رنگا رنگ تھا دیواروں پر رنگا رنگ برتن ٹنگے تھے ۔باسکٹیں لٹکی تھیں ہر جگہ نقش ونگار تھے۔ان کے بچے بہت شوق سے ہم لوگوں کے ساتھ تصاویر کھنچوا رہے تھے۔ یہ سب گہرے کالے رنگ کے لوگ ہوتے ہیں۔ سوڈان کی سرحد یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ بچے اندر کمرے میں نماز پڑھ رہے تھے۔لڑکیوں نے سخت چوٹیاں باندھی ہوئی تھیں اور لڑکے عبایے میں تھے۔ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ اس گاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے ہیں۔سب کے گھر بے تکلفی سے آنا جانا ہے۔آپس میں شادیاں ہوتی ہیں کوئی بھی اپنے قبیلے سے باہر شادی نہیں کرتا ہے۔یوں یہ لوگ ایک بڑے خاندان کی طرح ساتھ رہتے ہیں۔نماز پڑھ کر ہم سب وہاں سے روانہ ہوئے۔ بہت محبت سے ان لوگوں نے ہم کو رخصت کیا۔یہ ایک یادگار سفر تھا۔کشتی سے رات کو آسوان واپس آ گئے۔

بحری جہاز ہم کو لے کر Lexur کی طرف روانہ ہوا۔اس رات جہاز کے عملے نے ایک خوبصورت تقریب کا انتخاب کیا ہوا تھا۔مصری اپنے سفید لبادے میں عربی میوزک پر دف بجا رہے تھے۔دوسرے آلات میوزک بھی تھے۔ دھن بہت خوبصورت تھی۔اس دن جہاز کے عملے نے بھی گہرے رنگ کے عبایے پہنے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک مسلم میاں بیوی تھے جو کے نارتھ کیرولینا سے آئے تھے۔ یہ ایک افریقن جوڑا تھا مگر ان کی محبت مثالی تھی۔خاتون چلنے پھرنے میں بہت دقت محسوس کر رہی تھی۔ ہاتھ میں لاٹھی تھی اکثر بہت دھیمی چال ہو جاتی۔ان کے میاں بہت زیادہ صبر سے ہمیشہ ہر جگہ ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ان کی آج سالگرہ تھی ان کی مسز نے ان کی سالگرہ جہاز پر منائی۔ جہاز کا عملہ کیک سجا کر گانا گاتے ہوئے ان تک پہنچا۔ یہ ایک سرپرائز تھا۔ہم سب آخر تک اس جوڑے کی محبت کو سراہتے رہے۔اس روز بہت اچھی عربی موسیقی سننے کو ملی۔عربی ڈانس بھی مردوں نے کیے۔آج تو کھانا بھی خاص مصری تھا جس کھچڑی کا انتظار تھا وہ بھی ملی۔ یہ نوڈلز اور دال چاول اوپر سے حلیم کی طرح پیاز کا بگھار بہت مزیدار کھانا تھا۔خاص قسم کا گرین سوپ بارنی سوپ مصری پلاؤ۔خوب ہی مزیدار وقت گزرا۔

دوسرے دن ہم سب نائل ایئر لائنز سے پھر قاہرہ پہنچ چکے تھے۔اس دفعہ Resort کی بجائے ہم لوگ ایک فائیو سٹار ہوٹل میں تھے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ وہ ہم کو یہاں کے خوبصورت ہوٹل Sky Rim میں لے کر جائے گا۔ ہم دوپہر کا کھانا وہیں کھائیں گے۔اس کے بعد Spice Place جائیں گے وہاں سے چائے کافی اور گرم مصالحے خریدیں۔ ہمارے گروپ کے ساتھی امینہ جب سے قاہرہ گئیں تھیں بہت دفعہ کہہ چکی تھیں کہ انہیں کاٹن فیکٹری بھی دیکھنی ہے ۔وہ بہت خواب دیکھتی آئیں تھیں کے eguptian cotton بہت مشہور ہے تو اُس کو دیکھنے جانا ہے اور پھر خوب ساری چادریں لینی ہیں مگر ہمارا گائیڈ لے کر نہیں جا رہا تھا۔اب جیسے ہی ہم قاہرہ پہنچے انہوں نے پرنس (گائیڈ) سے کہا اگر ابھی بھی تم مجھے کاٹن فیکٹری لے کر نہیں گئے تو میں تمہارے خوابوں میں آ کر تم کو ڈراؤں گی ۔بہرحال اس نے کہا کہ شام کو پہلے ہم کاٹن فیکٹری جائیں گے اور پھر اس کے بعد گرم مصالحے کی دوکان پر۔سب بہت شوق سے کاٹن فیکٹری پہنچے مگر بڑی مایوسی ہوئی یہ فیکٹری تو نہ تھی کاٹن کی بہت بڑی دوکان تھی کوئی بھی چادر سو ڈالر سے کم نہ تھی۔ ہم کاٹن کے حجاب کا سوچ کر گئے تھے بیس ڈالر کے معمولی حجاب۔دوکان میں کاٹن کی کوئی بہت اچھی چیز نہ تھی اور اتنی مہنگی۔ہم سب مایوس واپس آ گئے۔اس کے بعد مصالحے والی بڑی سی دکان پر پہنچے۔ دوکان داروں نے الائچی، دارچینی، کافی، چائے، سبز چائے، شہد اور بہت کچھ دکھانا شروع کیا۔ ہم نے کافی خوب ساری خریدی تاکہ امریکہ میں تحفے دینے کے کام آئے۔شہد اور سبز چائے بھی خریدی۔ یہ خریداری بہت اچھی رہی۔اس کے بعد خوشبویات کی جگہ پہنچ گئے۔ جہاں قسم قسم کے عطر تھے۔ چہرے پہ لگانے والی کلوپیٹرا کریمیں تھیں۔ یہاں لوگوں نے خوب خریداری کی۔عورتوں نے تو منہ پر لگانے والی کریمیں خریدیں۔شاید کلوپیٹرا نے کوئی اچھا فارمولا بتایا ہو جس کو استعمال کر کے سب حسین بن جائیں۔ ہماری گروپ کی ایک ساتھی بولیں جو کئی بوتلیں خرید رہی تھیں۔ یہاں سے نکل کر سب کی جیب خالی ہو چکی تھیں۔اب ہوٹل واپسی تھی اور پھر اگلے دن نیشنل میوزیم جانا تھا۔دن بھر سفر کیا تھا۔ہوٹل کے کمرے میں سب تھک ہار کر سو گئے۔

باقی صفحہ ۱۲ پر ملاحظہ کیجیے

'' خوشبو کا آنگن ''

میرا اس سے تعلق کیا تھا

جسنتا کیرکیتا

- ترجمہ -

خان حسنین عاقب (اورنگ آباد)

(جسنتا کیرکیتا ۱۹۸۳ء میں جھارکھنڈ کے ضلع مغربی سنگھ بھوم کے ایک ادی واسی قبیلے میں پیدا ہوئیں۔انہیں خواتین پر مظالم،ان کے استحصال اور ادی واسیوں کی شناخت کے لئے جدوجہد کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔وہ جنگلات اور ماحولیات کے تحفظ کی آواز بن کر بھی ابھری ہیں۔حال ہی میں انہوں نے منی پور تشدد کے خلاف آج تک چینل کے طور پر آج تک چینل اور انڈیا ٹوڈے گروپ کی جانب سے انہیں دیا گیا قومی سطح کا ایوارڈ ٹھکرا کر شہرت حاصل کی۔فوربس انڈیا کی ٹاپ ٹوینٹی خود ساختہ خواتین کی فہرست میں انہیں شامل کیا گیا ہے۔وہ ایک بے باک صحافی،شاعرہ اور مصنفہ ہیں۔''انگور'' اور ''جوڑوں کی زمین'' ان کی تصنیفات ہیں۔انہیں کئی قومی اور بین الاقوامی ایوارڈز سے نوازا جا چکا ہے۔)

وہ آم کا پیڑ ٹھیک یہیں تھا
سڑک کنارے
جہاں سے مجھے ہر دن بس پکڑنی ہوتی تھی
بس جب تک پہنچتی، وہ مجھے تنگ کرتا
پہلے میری طرف ایک آم پھینکتا
میں خوش ہو کر جیسے ہی آم پر دانت گڑاتی
'یہ تو تھوڑے کھٹے ہیں' غصے میں بولتی
وہ ہنستا: تم بس میں سوتی رہتی ہو نا!
یہ نیند بھگانے کے لیے تھا
اب میٹھے آم گراتا ہوں، سچ میں!
اور تب تک بس آ جاتی
اس دن بس پکڑنے سڑک پر پہنچی
وہ غائب تھا
سالوں سے میرا ٹھیک یہیں انتظار کرتا وہ آم کا پیڑ
بھلا کہاں جا سکتا ہے؟
دوسرے دن اخبار میں پڑھی اس کے مارے جانے کی خبر
میں اس دن خوب روئی
جیسے مارا گیا ہو کوئی گھر کا اپنا
میں اس دن سوئی نہیں رات بھر
کیسے کاٹ دیا گیا وہ، یہی سوچ کر
دوسرے دن دوڑی ادھر

سوچا اس کی خوشبو سمیٹ لاؤں گی
اور اسے اپنے آنگن میں بو دوں گی
جب اس کی خوشبو بڑھ جائے گی
تو اسے لیے گھر سے نکلوں گی
لوٹوں گی تب اس کی خوشبو کو آنگن میں کھڑا پاؤں گی
مگر میرے سپنے ٹوٹ گئے
دھول کا جھکڑ جب ہنسنے لگا مجھ پر
میرے آم کے پیڑ کی خوشبو
دھول کے جھکڑ سے گتھم گتھا ہو کر لڑ رہی تھی
میں بھاگی تھانے کی سمت
یہ رپٹ لکھوانے کہ میرے ساتھی کا قتل ہو گیا ہے
تھانہ قہقہے لگا کر ہنسنے لگا
ڈنڈا دکھاتے ہوئے بولا، 'پہلے تو بتا! تیرا اس کے ساتھ تعلق
کیا تھا؟'
میں آج تک در در بھٹک رہی ہوں
یہ بتانے کے لیے
کہ اس کے ساتھ میرا تعلق کیا تھا
مگر وہاں کوئی نہیں اب
غائب ہو چکا ہے سب
اب صرف دور دور تک
دھول اڑاتی چوڑی، سپاٹ سڑکیں ہیں!

یہاں میری نعل گڑی ہے

ڈاکٹر جواز جعفری

(لاہور)

شہر کی گمنام حویلی میں
میری نعل گڑی ہے
پسپا ہوتی گلیوں میں
میرے پرکھوں کی باقیات دفن ہیں
چوکوں میں گڑے طلائی مجسمے
ان کی نمائندگی پہ مامور ہیں
میرے اجداد
جو شہر کے اولین باشندے تھے
ایک روز میں بھی ان کے پہلو میں جا بسوں گا
اور ستارا بن کر شہر کے آسمان کو روشن کروں گا
یہ شہر جو آنکھ کی پتلی بن کر
دنیا کے آخری کناروں تک میرے ساتھ چلتا ہے
میں نے ثمر دار باغوں سے عشق کیا
جن کی خوشبو
شہر کے در و دیوار کو مہکائے رکھتی ہے
میں نے شہر کے جادوئی دروازوں کو بوسہ دیا
جو اجنبیوں کے استقبال کو ہمکتے ہیں
شہر کی ست رنگی چھتوں پہ بیٹھ کر
میں نے اپنے حصے کے آسمان پر ستارے ٹانکے
اور خوش جمال عورتوں کی آرزو کی
جن کے جواں جسموں کی آگ
راکھ ہوتے ہوئے دلوں کو گرمائے رکھتی ہے
میں نے شہر کے افسانوی دریچوں سے جھانکتے
اساطیری چہروں کو آنکھوں میں بھرا
اور اپنے خواب میں جا بسا
شہر کے نواح میں
عمر رسیدہ پیڑوں سے بغل گیر ہوا
جن کی جڑوں میں اولین عشاق کی آنکھیں دفن ہیں
میں نے شکستہ دیوار پہ آزادی کے نغمے لکھے
گرتے ہوئے پرچموں کو پھر سے بلند کیا
اور اپنے نام بھیجی گئی بیڑیاں
شہر کے دروازے پہ آویزاں کر دیں
میں نے معبدوں کے نام طلائی تحفے بھیجے
اور دیوتاؤں کی کہانتوں کا انتظار کیے بغیر
اپنے دشمنوں کو گھوڑوں کی پیٹھ پہ جا لیا
میں نے اپنے خزانوں کو ڈھال کر آزادی کا مجسمہ بنایا
اور اسے شہر کے چوک میں نصب کیا
میں نے چرواہوں کے ہاتھ اپنے خواب بیچنے سے انکار کیا
جو اپنی عزت کے لیے دوسروں کی تحقیر کرتے تھے
میں کوکھ کی جنت سے باہر نکلا
تو اس شہر نے مجھے دوبارہ جنم دیا
میں نے موت کو شہر کے دروازے پہ شکست دی
اپنا چہرہ
پھیلے ہوئے ہاتھوں کو خیرات کیا
اور بے چہرہ وجود پر
شہر کے خدوخال پہن لیے

○

صبر کر اے دلِ مضطرب

(مخمّسی ترجیع بند کی ہیئت میں)

آفتاب مضطر

(کراچی)

بڑھ چلا وصل کا پہلا پہلا قدم
ایک دو دن کی ہے بات اب کیا ہے غم
وصل بڑھنے کو ہے، ہجر ہونے کو کم
وصلیہ دن بھی دو دن میں آنے کو ہے
صبر کر، صبر کر اے دلِ مضطرب

غم کا چھایا ہُوا ابر سب چَھٹ گیا
وہ کڑا وقت کٹنا جو تھا، کٹ گیا
بے قراری کا پتھر سمجھ ہٹ گیا!!
چین آ جائے گا، وصل چھانے کو ہے
صبر کر، صبر کر اے دلِ مضطرب

تو ملے گا جو پلکیں بھگو کے بہم
اپنا رونا وہ رو لے گا ہو کے بہم
چین پائے گا کچھ تُو بھی رو کے بہم
وہ بہم ہو کے تجھ میں سمانے کو ہے
صبر کر، صبر کر اے دلِ مضطرب

ہاں فرُو ہوگا اک روز یوں اضطراب
یعنی کارِ رفُو ہو گا جب کام یاب
زخم سل جائیں گے یوں معاً سب شتاب
دل کی کہہ سُن کے اب صبر آنے کو ہے
صبر کر، صبر کر اے دلِ مضطرب

وصل کی جیت بس اب تو ہونے کو ہے
ہجر خود اپنا دامن بھگونے کو ہے
ہجر کا سانپ اب خود ہی رونے کو ہے
ہجر یہ اژدہا منہ چھپانے کو ہے
صبر کر، صبر کر اے دلِ مضطرب

چھاؤنی غم کی بس اب تو چھٹنے کو ہے
یہ شب تار بھی اب سمٹنے کو ہے
وصلیہ ساعتی بھی پلٹنے کو ہے
نغمۂ وصل، دل گنگنانے کو ہے
صبر کر، صبر کر اے دل مضطرب

صبر کر، صبر کر اے دلِ مضطرب
جلد اٹھنے کو ہے محفلِ مضطرب
چاک ہونے کو ہے محملِ مضطرب
اندمالی کوئی آ دکھانے کو ہے
صبر کر، صبر کر اے دلِ مضطرب

خوب پھولے اور پھلے گلشن مِرا

انیس الرحمٰن
(سکھر)

بڑھتا جائے چاہتوں کا سلسلہ
ایسا ہو موسم مِریاب دیس کا

تلخ یادیں، تلخ باتیں بھول کر
کیجیے اب سالِ نَو کی ابتدا

ہر طرف خوشیاں ہوں ارضِ پاک پر
روشنی ہی روشنی ہو جا بہ جا

اتّفاق و اتّحادِ قوم سے
خوب پھولے اور پھلے گلشن مِرا

اے خدائے مصطفےٰ، ربِّ کریم!
رحمتوں کی بھیک کر ہم کو عطا

بخش دے ہر رحمتِ دنیا و دیں
ہے انیسِ بے نَوا کی یہ دعا

○

سنگم کے تیرے

دیپا سلام
(پریاگ راج)

سنگم کے تیرے
نیم کھلی آنکھوں سے
دھیرے دھیرے نظر آتا ہے
گنگا کی روپہلی دھارا پریمنا کا سبز سایہ

گنگا کی لہروں کو چومتے
کچھ چھپ چھپا کے
کچھ تھپ تھپا کے
اُنگلیوں سے پانی چھیدتے
اُڑتے اور کھیلتے
پانی کے چھیدوں کو یوں بکھیرتے

کناروں کی رات پر
لکھتے ہوئے ناموں کو
ریت پر تصویر اُکھاڑتے چتر کوں کو
چھوڑ جاتے ہیں روزان گنت
پاؤں کے نشانوں کو

سائبیر ین پرندوں کے سفید پروں کی پھڑ پھڑاہٹ
سرخ ہرے بینگنی رنگوں کی نیلے آسمان پر آمد
گگن اور گنگا کو سورج نگلے ہوئے دیکھتے ہیں
ڈالفن کو اُوپر نیچے مچلتے ہوئے دیکھتے ہیں
قلعے کے چور سے مندر کی گھنٹیوں کے شور سے
وٹ وڑکشا سا پریم پھیلائے
دلوں کو دلوں سے ملے ہوئے
سنگم کے تیرے

○

اے نگارِ وطن

نغمہ صبوحی
(ورجینیا)

اے نگارِ وطن اے بہارِ چمن
کھو گیا ہے کہاں وہ تیرا بانکپن
آج ہر شاخِ گل ہے دریدہ بدن
یہ ستم یہ تشدد یہ دار و رسن
اے نگارِ وطن

وہ جو گلبرگ سا تھا سماں کھو گیا
لٹ گئے قافلے آشیاں کھو گیا
کوئی تھا خوبرو سا جواں کھو گیا
لہلہاتا ہوا گلستاں کھو گیا
اے نگارِ وطن

ہیں وطن میں بہت دیدہ ور آج بھی
مل کے طے کرنا ہے یہ سفر آج بھی
رحمتِ رب کے ہیں منتظر آج بھی
ہاں دعاؤں میں ہوگا اثر آج بھی
اے نگارِ وطن

○

آہ۔۔۔منور رانا

اُردو زباں کا ماہر و تکفیل چل بسا
حسنِ غزل کی نزہت و تسہیل چل بسا
نوحہ کناں ہیں شعر و سخن کی یہ محفلیں
بزمِ ادب کا رہبر و سرخیل چل بسا
(قاضی شجیع اجلپوری)

محفلِ شعر و سخن پر ہوا سکتہ طاری
جا ملے خالقِ یکتا سے منور رانا
جنوری چودہ کی وہ شب تھی بجے تھے گیارہ
جب کہ رخصت ہوئے دنیا سے منور رانا
(حبیب بنارسی)

نئے اسلوب کی جب بات ہو گی
غزل والے تمہارا نام لیں گے
منوّر ہیں تمہارے تجربے سب
نئے شاعر انہیں سے کام لیں گے
(واصف فاروقی)

○

دوہے

نوید سروش
(میرپورخاص)

جگ مگ جگ مگ کر رہے تارے روشن رات
آج ملن ہے یار سے اُجلی اُجلی بات

کیسے کوئی جگت میں چور پکڑنے پائے
اُن کا جو بھی نام لے وہ ہی مارا جائے

سڑکوں پر ہے خوف سا گلیاں سبھی اُداس
سونا سونا شہر ہے جیسے ہو بن واس

○

زہریلا انسان

نسیم سحر
(راولپنڈی)

تابش خانزادہ کا ناول ''زہریلا انسان''(۱) جب دواڑھائی سال قبل ماہنامہ ''چہارسُو'' میں شائع ہوا تو اُس کے غیر معمولی عنوان اور اچھوتے موضوع کے ساتھ ساتھ تحریر کے انفرادی اُسلوب نے بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ ''زہریلے انسان'' کے جو ہر تو بعد میں کھُلے، سانپوں، منکوں اور سانپوں، اور سانپوں کی دیویوں کی دُنیا کا بیان قاری کے رونگٹے کھڑے کر دیتا تھا، اور ناول نگار کے ماہرانہ تجربے کے تحت ہر قسط ایک ایسی کلائمیکس پر منتج ہوتی تھی کہ قاری کے لیے اگلی قسط کا انتظار مشکل ہو جاتا تھا۔ اس پر مجھے ''سب رنگ ڈائجسٹ'' میں شائع ہونے والی ایک قسط وار کہانی یاد آ گئی جس کی ہر قسط اس کے صاحبِ طرز مدیر اور قلمکار شکیل عادل زادہ اپنے جادوئی قلم سے لکھ کر اسی طرح کے ایک پُرتجسّس مرحلے پر ختم کرتے تھے اور پھر قارئین شدید اضطراب کے عالم میں اگلی قسط پڑھنے کے لیے سب رنگ کے اگلے شمارے کا انتظار کرنے لگتے تھے، دوسرے شہروں کا بھی یقیناً یہی حال ہوتا ہوگا، راولپنڈی کی حد تک مجھے معلوم ہے کہ یہاں سے نہ صرف شکیل عادل زادہ اور سب رنگ ڈائجسٹ کے عملے کے دیگر افراد کو فون جاتے تھے بلکہ یہاں اس رسالے کے سول تقسیم کار 'خان صاحب' سے بھی لوگ پوچھتے تھے کہ سب رنگ ڈائجسٹ کب آ رہا ہے، اور یقین جانیے کہ جب سب رنگ کی پلٹی ریلوے سٹیشن پر پہنچتی تو تقسیم کار سے پہلے ''سب رنگ'' کا تازہ شمارہ فوراً حاصل کرنے کے خواہشمند بھی سٹیشن پر منتظر ہوتے تھے، اور سٹیشن سے باہر آتے ہی وہ کارٹن کھول کر تبرّک کی طرح شائقین میں تقسیم ہونے لگتے۔ پھر جو چند کاپیاں بچ جاتی تھیں وہ اگلی صبح دوکان کھلتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھیں، اور ہر نئے شمارے کے لئے ہر شہر سے زیادہ تعداد میں شمارہ ارسال کرنے کی فرمائش آتی تھی۔

سب رنگ ڈائجسٹ کا ذکر تو ضمناً آ گیا، بات ''چہارسُو'' اور ''زہریلا انسان'' کی ہو رہی تھی، رسالے میں ہر قسط پڑھنے کے بعد اگلی قسط تک کا انتظار محبوب کے انتظار سے بھی زیادہ جاں گسل ہوتا تھا، قسط پڑھنے کے بعد چہار سو کو احتیاط سے شیلف میں سجا دیا جاتا کہ بقول غالبؔ ''قندِ مکرّر'' کا لطف بھی اٹھایا جا سکے۔ ہر قسط میں کوئی نہ کوئی رومانی ایڈونچر، کوئی نیا منظر نامہ بھی ہوتا تھا، مگر ''فخر ہوتا ہے گھرانے کا فقط ایک ہی شخص'' کے مصداق مرکزی کردار سندر بن کے اس شان کا ہے جسے رامو سپیرا کہا جاتا تھا۔ اس سپیرے کا اور اس کی دائمی ساتھی کالی شیش ناگن کے علاوہ بہت سے پُراسرار اور عام انسانوں کا مزید ذکر آگے آئے گا۔ اگرچہ ناول کے ایک دیباچہ نگار ذوالفقار آغا کہتے ہیں کہ کہانی کی ساری دل ربائی اس بھید میں ہوتی ہے جو آخر میں کھلتا ہے اور پہلے سے کوئی بھید کھول دینا ایک ناقابلِ تلافی اتلاف کا الزام اپنے سر لینا ہوتا ہے۔ تاہم اس ناول کے بے شمار واقعات کا تسلسل اور اس کے محیّر العقول بلکہ ناقابلِ یقین منظر ناموں میں سے کچھ بیان کیے بغیر مرزا غالبؔ کے الفاظ میں ''بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر'' کے مصداق ہوگا۔

ایک سہانی صبح کا ذکر ہے، گلزار جاوید نے فون کیا کہ تابش خانزادہ مختصر وقت کے لیے راولپنڈی ان کے گھر آئے ہوئے ہیں اور اُن سے ملاقات کی جا سکتی ہے، اتنی بڑی خبر سُن کر ہمارے تو گویا بدن پر سانپ سرسرانے لگے کہ چلیے اس جادوگر سپیرے سے ملتے ہیں۔ کشاں کشاں وہاں پہنچے تو کمرۂ ملاقات میں ایک خوش قامت، خوش صورت، سوٹڈ بوٹڈ صاحب بیٹھے ہوئے تھے، انہیں دیکھ کر گمان ہوا تابش خانزادہ تو یہ نہیں ہو سکتے، شاید ان کا کوئی ساتھی ہو، اور تابش یا رامو سپیرا ابھی پٹاری، بین اور گلے میں کوئی سانپ لپیٹے کہیں سے برآمد ہوگا۔ مگر جب گلزار جاوید نے انہی صاحب کا تعارف تابش خانزادہ کے طور پر کرایا تو ہم نے اپنے کھڑے ہوتے رونگٹوں کو سکون دینے کی کوشش کی اور خود کو یقین دلانے کی کوشش بھی کہ کالی نامی ناگن جو ہر قسط میں رامو سپیرے کے ساتھ یا اس کی تھیلی میں ہوتی تھی، اس وقت نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس زہریلے انسان سے مصافحہ تو کسی طور کر ہی لیا، معانقہ اس ڈر سے نہ کیا کہ کہیں اس کے جسم میں موجود سانپوں کی کئی اقسام کا زہر ہمارے جسم میں داخل نہ ہو جائے۔

تابش خانزادہ سے طویل ملاقات رہی اور ہم نے انہیں مشورہ بھی دیا کہ اس ناول کو جس کی کوئی قسط شاید ہم نے مِس بھی کی ہو، کتابی صورت میں آنا چاہیے۔ اس وقت تو انہوں نے کہا کہ کتاب شائع کرنے کا کیا فائدہ جب اب کتاب خریدنے والے ہی نہ رہے، تاہم وہ ضرور کوئی قبولیت کا لمحہ تھا کہ کچھ عرصے بعد خبر ملی کہ وہ ناول الحمد پبلشرز جیسے ایک بڑے اشاعتی ادارے سے شائع ہو گیا ہے، اور کچھ دنوں کے بعد یہ بڑے سائز کا پانچ سو چوالیس صفحات پر پھیلا ہوا ناول ہمارے سامنے تھا۔ چنانچہ ''قندِ مکرّر'' کا آغاز اس کے حرفِ آغاز سے کیا اور جب تک پشتِ سرورق پر تابش خانزادہ کے بارے میں لکھے ہوئے فلیپ تک نہیں پہنچا، دیگر تمام کتب اور جرائد کا مطالعہ موقوف کر دیا کہ سانپوں، سپیروں، مناسہ دیوی، کالی نام کی ناگن اور کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی حیرت انگیز بلکہ کسی حد تک ناقابلِ یقین داستان کا ہر لمحہ اپنی جانب پوری توجہ چاہتا تھا۔

تابش خانزادہ نے قدیم زمانے کے سانپ دیوی دیوتاؤں کے قصے، دیومالائی روائتیں، مختلف سانپوں کے زہروں کی معلومات کو یکجا کر کے جس مہارت سے ناول کا تانا بانا بُنا ہے، قاری کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ اسے پوری طرح پڑھے بغیر ایک طرف ڈال دے، اور شاید یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ اسے ایک سچّی کہانی کے طور پر نہ پڑھے۔ میں خود بے شمار دیومالائی کہانیاں پڑھ چکا ہوں مگر انہیں ہمیشہ کہانی ہی جانا، جبکہ اس ناول نے مجھے ہر گام یہی باور کرایا کہ یہ رامو سپیرے کی سچی آپ بیتی ہے، اور یقین کریں اسے پڑھنے کے بعد تو مجھے بھی اپنے مطالعے کے کمرے میں یا بستر پر لیٹے ہوئے یہی محسوس ہونے لگتا تھا کہ ابھی کوئی

سانپ مجھے ڈس لے گا اور میں اس کے زہر سے نجات حاصل کرنے کے لیے رامو کو بلاؤں گا۔ کہانی میں راموشمان سندر بن کے جنگلوں میں پا ہیرالہ کے قریب بجنی کھلی نامی ایک گاؤں کے قریب رہتا ہے۔

اس ناول پر تفصیلی تبصرہ میرے بس میں نہیں کہ اس کا اتنا بڑا کینوس تو ایک نگاہ میں آ ہی نہیں سکتا اور جب اس کے ایک منظر نامے سے نظر دوسرے منظر نامے تک جاتی ہے تو اس کے اندر کچھ ایسی نئی باتیں اور نئے انکشاف ہوتے ہیں کہ پہلا منظر نامہ یکدم بھول ہی جاتا ہے۔ میرا یہ مضمون اس ضخیم ناول پر کوئی تنقیدی یا تحسینی انداز کا نہیں، بس ایک تأثراتی اظہار یہ ہے جسے ایک قلمکار کے بجائے ایک قاری کا سمجھا جائے تو بہتر ہوگا۔ میں ان کے اندازِ تحریر اور موضوع پر پوری طرح گرفت کے بارے میں کچھ مختصر اقتباسات کے ساتھ بھی اپنی بات مکمل کرنا چاہوں گا، اگر کسی قاری کو اس مضمون میں طوالت کا احساس ہو تو یہ خیال رکھے کہ یہ بڑے سائز کے پانچ سو پچاس صفحات پر مبنی ناول پر لکھا جا رہا ہے، اگر قاری نے اسے پڑھ لیا ہے تو یہ مضمون پڑھنا اس کے لیے کوئی مشکل نہیں رہے گا۔

مجھے تو مصنّف کی معجز بیانی پر حیرت ہو رہی ہے، ایک ایسا موضوع جو اُن کی دنیا، اُن کے ماحول ان کے تعلیمی پس منظر، اور ان کے پیشے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا کیسے انہوں نے اس پر گرفت پائی جبکہ پیشے سے وہ فرانزک سائنسدان، اور مشغلے کے طور پر کالم نگار، شاعر ہیں، اپنے تخصیصی پیشے کے حوالے سے ان کی دو اہم کتابیں انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان سے ہٹ کر تابش خانزادہ کو اس موضوع پر لکھنے کی سوجھی کیسے، یہ انکشاف بھی ناول میں ''میری باتیں'' میں وہ خود دیوں کرتے ہیں:

''ہندوستان میں مَیں ایک سائنس کانفرنس میں حصہ لینے گیا تھا۔۔۔ واپسی پر فاطمہ دو سوٹ کیسوں میں کپڑے بھر لائی تھی اور میں اپنے سوٹ کیس میں تبرک کے طور پر کتابیں۔ قدیم زمانے کے سانپ، دیوی دیوتاؤں کے قصّے، دیومالائی کہانیاں اور سُندر بن کی روائتیں، جنہیں پڑھ کر میرے ذہن میں دیومالائی روائتیں اور سائنس کو یکجا کر کے ایک ناول لکھنے کا شوشہ ابھرا تھا۔ لکھنے سے پہلے بہت سے سوالات ذہن میں آئے تھے، مثلاً روایتوں کی سچائی کہاں سے شروع ہو کر کہاں پر ختم ہوتی ہے، ہمیں سانپوں سے ڈر کیوں لگتا ہے، سانپوں کے زہر کی کیمیائی اجزائے ترکیبی کیا ہے، منکے کیا بَلا ہیں، اور ہزاروں سالوں سے سانپ یا بچھو کی کاٹ کے لیے کیوں کر استعمال ہوتے آ رہے ہیں، کیا سانپ واقعی انتقام لیتے اور حقیقتاً خزانے کی نگرانی کرتے ہیں؟ ان سوالات نے جوابات کھوجنے کے لیے مجھے سائنسی تحقیق کی ترغیب دی تھی۔ پڑھائی، سوچ بچار اور تحقیق کا وہ دور پانچ برس کا تھا۔۔۔'' (۲)

یہ پانچ برس اس ناول کی conception کا عرصہ تھا، مگر اس کے بعد بھی تابش خانزادہ کی تخلیقی کاوش کی ایک لمبی داستان ہے، اہم ترین بات یہ کہ ابتدا میں یہ ناول اُردو میں نہیں، انگریزی میں لکھا گیا تھا، اور پندرہ ابواب پر مشتمل تھا، اس پر مزید کئی سال کے ارتقائی اور تخلیقی عرصہ صرف کرنے کے نتیجے میں یہ دس سال میں مکمل ہونے والا ناول انتیس ابواب تک پھیل گیا۔ جب انگریزی میں لکھے جانے والے اس ابتدائی ناول پر ایک انگریزی کے استاد نے رائے دی تو کہا کہ اس میں تین برّ اعظموں کا ذائقہ موجود ہے، تم امریکہ میں رہتے ہو، ناول میں یہاں کا عرق ڈالو گے تو اس میں سے بین الاقوامی خوشبو آئے گی۔۔۔ یہی ہوا، اب یہ ناول کئی بر اعظموں کی خوشبو دے رہا ہے۔ لیکن یہاں یہ بھی کہتا چلوں کہ یہ انگریزی میں لکھے گئے ناول کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں ہے، اسے ہر لحاظ سے اردو ہی میں لکھا ہوا ناول سمجھ لیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

تابش خانزادہ نے ہر ناول نگار کی طرح اس میں کچھ محبّت اور ''سیکس'' کے سین بھی ڈالے ہیں، لیکن انہیں ناول کی بنیادی کہانی کے اندر یوں ضم کیا ہے کہ وہ سین بھرتی کے نظر نہیں آتے، ان میں صنفِ نازک کے حسن و شباب کی روداد بھی ہے، جمالیات نگاری بھی ہے، مکالماتی اظہارِ محبّت بھی ہے، راموسپیرے کا کسی عورت سے ہم بستری سے حتی الوسع گریز بھی دکھائی دیتا ہے، اور جہاں ایسا ہوا ہے وہ کہانی کا تقاضا بھی تھا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس نے پامال جنسی قدروں کی عکّاسی کرتے ہوئے اشرافیہ کی روایتی تہذیب اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس ناول کے مختلف ابواب میں اسے کئی حسیناؤں سے ملاقات کے مواقع ملتے ہیں، گریز و میلان کے مختلف مراحل اسے درپیش آتے ہیں، کہانی کئی رخ بدلتے بدلتے آگے چلتی ہے، بقول منیر نیازی:

میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا
اِک اَور دریا کا سامنا تھا مُنیر مُجھ کو !

با کمال قلمکار اے حمید نے اپریل ۲۰۱۰ء میں اس ناول پر کیا خوب تبصرہ کیا ہے کہ:

''اتنے ہمہ جہت محیط اور گرانڈیل سبجیکٹ کو سنبھالنا بڑا مشکل تھا۔ ایک ہمالیہ کی چوٹی سر کرتا ہے تو سامنے دوسرے ہمالیہ کی چوٹی آ جاتی ہے۔ 'زہریلا انسان' کے مصنف نے اچھا کیا کہ اتنے جنّاتی سبجیکٹ کو لگام ڈالنے کی بجائے خود کو اس کے حوالے کر دیا۔ اب مصنف خود کہانی کو لے کر نہیں چلتا بلکہ کہانی خود مصنف کو لے کر آگے بڑھتی ہے۔ اور جب کہانی خود اپنی رہنمائی کرتی ہے تو وہ خالص ہو جاتی ہے۔'' (۳)

اے حمید کا یہ جملہ بھی اس ناول پر بھرپور اور مختصر ترین تبصرہ حاصل ہے:

''اس ناول کے پلاٹ کے کئی ٹریک ہیں۔ کئی جنگل دریا اور صحرا ہیں، مگر کہانی کے تسلسل اور اس کی دلچسپی اور روانی میں ذرا بھی فرق نہیں پڑتا۔'' (۴)

اس پر ایک اور خیال انگیز رائے جناب ذوالفقار آغا کی بھی دیکھتے چلیے:

''عقائد، روایات اور گم گشتہ دیومالائی داستانوں کا کھوج لگا کر ان میں جدید ترین سائنسی حقائق کی آمیزش اور استدلالی معیار پر پوری اترنے والی اور افسانوی دلچسپی برقرار رکھنے والی اردو کا جو واحد ناول میری نظروں سے گزرا ہے وہ جناب تابش خانزادہ کا زہریلا انسان ہے۔۔۔ اس ناول کی کہانی جب سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سپیرے نُما زہریلے انسان کے عقدہ کشا ہاتھوں میں پہنچتی ہے تو ہر بل ایک منطقی اور فکری نتیجے تک پہنچ کر نکل جاتا ہے۔ جگہ جگہ محیّر العقول اساطیری داستانیں اور جدید

سائنسی دریافتیں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے رفیقانہ محوِ خرام نظر آتی ہیں اور قاری کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں''۔(۵)

رامو سپیرا کو ہم شروع میں ایک ان پڑھ سپیرے کے روپ میں ہی دیکھتے ہیں اور پھر دیکھتے دیکھتے سندر بن کی جھونپڑی میں رہنے والا یہ سپیرا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کانونٹ کالج کی علمی وادبی اور رومانی فضاؤں میں جا پہنچتا ہے۔اس کے باپو نے (جو کہانی کی مرحلہ وار عقدہ کشائی کے بعد اس کا اصل باپ نہیں نکلتا بلکہ پراسرار دیوبوں دیوتاؤں کی طرف سے اسے رامو کی پرورش کے لیے مقرّر کیا گیا تھا) اسے ابتدا سے ہی مختلف سانپوں کا زہر اس کے جسم میں داخل کر کے زہریلا بنا دیا تھا جس کے نتیجے میں کوئی سانپ اسے ڈستا تو خود مر جاتا مگر رامو کو کچھ نہیں ہوتا تھا۔مگر اس زہر نے رامو کی زندگی میں کیا کیا زہر گھولا یہ انکشاف کہیں بہت بعد میں ہوتا ہے کہ رامو کسی عورت سے ہم بستری کرتا تو وہ عورت اس کے اندر موجود سانپ کے زہر سے ہلاک ہو جاتی تھی، اور جب دو پسندیدہ حسیناؤں کی ہلاکت کے بعد رامو پر یہ انکشاف ہوتا ہے تو پھر کچھ نہ پوچھیے۔یہاں مجھے ہندو مت کے وہ راجے مہاراجے یاد آئے جو وِش کنیاؤں کے ذریعے اپنے ناپسندیدہ افراد اور دشمنوں کو ہلاک کرنے کے فن سے واقف تھے۔ذہین قاری جانتے ہوں گے کہ کسی زمانے میں راجے مہاراجے خوبصورت لڑکیوں کو ماہر سپیروں سے بتدریج وِسوا کران کے جسم کو زہر کا عادی بنا دیتے تھے،مگر جب ایسی لڑکیاں مطلوبہ افراد سے ہم بستری کی مرتکب ہوتی تھیں تو یہ سانپ کا زہر انہیں فوری موت سے ہم کنار کر دیتا تھا۔ایسی لڑکی کو ''وِش کنیا'' یعنی زہریلی لڑکی کہا جاتا تھا۔بہرحال تابش خانزادہ کے اس 'زہریلے انسان' کو جس مثبت مقصد کے لیے سانپوں کا زہر دیا جاتا تھا وہ وِش کنیاؤں کے منفی استعمال کی نسبت بہت مختلف ہے۔

شان جی جو کہ رامو کا باپو ہے (مگر باپ نہیں!) اسے شان کہا جاتا تھا لیکن یہ بھی اس کا نام نہیں بلکہ لقب سمجھیے کہ سندر بن میں بنوں بی بی کے ایسے جوگیوں کو شان کہتے ہیں جن کی ہیبت سے سانپ، مگرمچھ، شیر اور دوسری جنگلی بلائیں ڈرتی ہیں۔رامو کا باپو کئی زبانیں بولتا تھا، ہندی بنگالی بھی اور اردو کے ساتھ ساتھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی۔وہ اپنے پیشے کے تقاضوں کے تحت گھنٹوں مراقبہ کرنے کا عادی بھی تھا اور رامو کی تربیت کے لیے اس نے اسے بھی مراقبہ کرنے کا عادی بنایا ہوا تھا۔جس جھونپڑی میں یہ دونوں رہتے تھے اس کے ایک کمرے میں ایک دواخانہ بھی تھا جس میں کئی سانپوں کا زہر محفوظ ہوتا تھا جو مختلف بیماریوں کے علاج میں کام آتا تھا، چھ برس کا ہوتے ہوتے رامو کے جسم میں ان سانپوں کا اتنا زہر بھرا جا چکا تھا کہ اسے کاٹنے والے مچھر کیڑے وغیرہ فوراً ہی مر جاتے تھے۔باپو نے ہی رامو کو بین بجانے کا فن سکھایا، اور اس کی طویل تربیت میں سانپوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بین بجانا، اور مسلسل مراقبے کا مقصد اس کی آنکھوں میں شدید مقناطیسی توانائی پیدا کرنا تھا۔یہ جھونپڑی سندر بن کے جنگلوں میں تھی، جس میں مقیم ایک اور پُر اَسرار کردار ''بنوں بی بی'' کو عبادت کے صلے میں خدا نے دیوی کے درجے پر فائز کیا تھا اور سندر بن کے تمام جانوروں کو اس کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔اسی لیے اس کے ڈیرے کو ''بنوں بی بی کا ڈیرہ'' کہا جاتا تھا۔بلکہ مصنّف ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ پاکستان کے سرحدی صوبے کے شہر بنوں کا نام بھی سندر بن کی اسی دیوی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ہوسکتا ہے تابش خانزادہ کی یہ تحقیق بھی کوئی ٹھوس بنیاد رکھتی ہو!

یہ ناول رامو اور اس کے باپو کی دنیا کی دوست سے بے نیازی کا ذکر کئی جگہ کرتا ہے، تاہم کہانی کے ایک مقام پر حیرت ہوتی ہے کہ باپو جیسا سادہ آدمی وکرم کی باتوں میں آ کر دیسی شراب کا اپنا نسخہ اس کے ذریعے تجارتی کاروباری بنیادوں پر تیار کرنے پر اور کمپنی کے قیام اور اس میں حصہ داری پر کیسے راضی ہو گیا۔اسی طرح ایک جگہ تابش خانزادہ رامو کی زبان سے ناگن کالی کے بارے میں لکھتے ہیں ''گھر پہنچے تو کالی کو دروازے پر ٹہلتے ہوئے پایا''۔ہمارے خیال میں یہ ایک لفظی لغزش ہے کہ سانپ ٹہلتا نہیں، رینگتا ہے۔ایک یا دو مقامات پر ''ناشتہ کھانے'' کے لفظ نے بھی متحیّر کیا کہ ایسا تو انگریزی یا اردو میں کہا نہیں جاتا، بہرحال اتنے طویل ناول میں ایسی ایک دو لفظی یا کردار نگاری کی لغزشیں نظر انداز کی جاسکتی ہیں۔

رامو کی شخصیت میں کردار سازی اور سچّائی کی تربیت کے ساتھ ساتھ دنیا داری کے معاملات سمجھانے یں اس کے باپو نے اوّل تا آخر جو اہم کردار ادا کیا اس کا اظہار ناول کے متعلّقہ حصّوں میں ہوتا ہے۔اس کی رامو سے گفتگو کے دوران میں یہ جملے اس کے اندر کی ایک دانشمند اور دُور بین شخصیت کی عکّاسی کرتے ہیں:

☆ دنیا والے جتنی جلدی کسی کو سر پہ چڑھاتے ہیں اس سے کہیں جلدی نظروں سے گرا بھی دیتے ہیں۔

☆ سب سے بُرا وہ نیک کام ہوتا ہے جس کی تشہیر نیکی کرنے والا خود کرتا پھرے۔

☆ انسان کے بس میں ہے کہ وہ اپنی چادر جتنی پھیلا دے یا تنگ کر دے۔

☆ عمرِ رفتہ سے بہتر کوئی کتاب اس دنیا میں نہیں ہے۔ہمارے آگے، پیچھے، اوپر نیچے اور دائیں بائیں یہ کتاب ہر وقت کھلی رہتی ہے۔اگر اسے پڑھنے والا ہو تو یہ کتاب زندگی کے ہر پہلو کا سبق دیتی ہے۔

☆ بن مانگے ملے دودھ، مانگے ملے پانی، اوپر والا ہر ایک کو اپنے اپنے سمے پر دان کرتا ہے جسے ٹھکرانا کفرانِ نعمت میں شمار ہوتا ہے۔

اسی تربیت کے نتیجے میں خود رامو کی اپنی باتوں میں بھی دانش اور فہم و فراست کی جھلکیاں ملتی ہیں جو قاری کے لیے بھی رہنمائی کا باعث بنتی ہیں:

☆ عالم کا علم جاہل کا معجزہ ہوتا ہے۔

☆ (ایک بچے روفی کو باغ کے بارے میں سمجھاتے ہوئے): تتلی پھولوں کے رنگوں پر مرتی ہے اور شہد کی مکھی پھولوں کا رس پیتی ہے۔شہد کی مکھی رس والے پھول پر بیٹھتی ہے اور تتلی خوبصورت اور رنگدار پھول پر بیٹھتی ہے۔

☆ مندر کی عمارت عالیشان تھی۔ایسی عبادت گاہیں دراصل دیکھنے والوں پر اپنی دولت صرف (کتاب میں سرف لکھا گیا ہے) کرنے والوں کی دولت کا پرچار

زیادہ کرتی ہیں، بھگوان اگر بڑی بڑی عمارتوں میں ملتے تو رام چندر جی اور مہاتما بدھ کو اپنے اپنے محلوں میں ملتے۔ خدا موسیٰ سے طور کی چٹیل چوٹی پر ہم کلام نہ ہوتا، اور محمد ﷺ کو غارِ حرا جیسی پتھریلی اور بے آب جگہ پر منصبِ پیغمبری نہ ملتا''۔

مصنّف ایک شاعر بھی ہیں اور عمدہ نثار بھی، چنانچہ ناول میں کئی مقام پر اُن کی منظر نگاری اور فطرت نگاری کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ملاحظہ ہو کہ سندر بن کے جنگل کا ایک منظر وہ اپنے الفاظ میں کیسے زندہ کر دیتے ہیں:

''سڑک کے اطراف چیل، کاؤ اور سندری کے درخت تھے اور درختوں کے درمیان دھندھل، پاسور، گرجان اور کانکی گھنی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ بہار کے موسم میں یہ جھاڑیاں رنگ برنگے چھوٹے بڑے پھول کھلا کر سندر بن میں آنے والے سیّاحوں کا استقبال کرتی تھیں۔ سڑک کی مشرقی سمت دریائے گنگا کے بنائے ہوئے جزیرے تھے''۔

مصنّف کا شاعرانہ مزاج ان کی جمالیات پرستی کی بھی غمّازی کرتا ہے، خاص طور پر رامو کے کردار میں جب وہ کسی پیکرِ حسن و جمال سے مخاطب ہوتا ہے تو اس کی نثر پر نثری شاعری کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ایک حسینہ سارہ سے مخاطب ہوتے ہوئے رامو کہتا ہے:

''بخدا آپ کی تحریر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک اچھی مصورہ ہوں گی''۔۔۔ جواب میں جب وہ ہنس دیتی ہے تو رامو کے روپ میں مصنف لکھتا ہے: ''ہنستے ہوئے اس کے دونوں گالوں کے ڈمپل اور گہرے ہو کر اس کے حسن کو دوبالا کر رہے تھے''۔ اسی طرح ایک اور حسینہ کورا کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے رامو کا شاعرانہ انداز دیکھیے: ''کوراجی، شکل وصورت سے آپ معصوم کشمیری حسن اور چینی وقار کے سنگم کی ایک ایسی اعلیٰ مثال ہیں جو آپ کو لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں لڑکیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ آپ کو دیکھ کر نہ جانے روزانہ کتنی آنکھوں کو روشنی ملتی ہے، کتنے کان آپ کی آواز کا ساز سننے کو بے تاب رہتے ہیں''

مصنف کا یہ شاعرانہ رنگ ناول کے کچھ کرداروں کی سراپا نگاری میں بھی چمکتا اور جھلکتا ہے۔ مثلاً مہاراجا کی کالی سیاہ رنگت کی پوتی یا نواسی کا، جسے سانپ نے کاٹ لیا تھا، سراپا یوں بیان کرتا ہے: ''بنفشی ہونٹ سانپ کی زہریلی کاٹ کے درد کے زیرِ اثر ہولے ہولے ایسے کپکپا رہے تھے جیسے بادِ صبا سے کالے گلاب کے پھول کھیل رہے ہوں اور ماتھے پر پسینے کے قطرے پنکھڑیوں پر تیرتی ہوئی شبنم کی یاد دلا رہے تھے''۔

مصنّف قاری کے ذوق اور مزاج سے بخوبی آگاہ دکھائی دیتا ہے چنانچہ ناول میں کہیں کہیں اُس نے کسی کردار کا سراپا بیان کرنے میں بھی مزاحیہ انداز برتا ہے۔ مثلاً سکول کے ماسٹر گلاب سنگھ کا حلیہ یوں بیان ہوتا ہے: ''گلاب سنگھ سکول میں میرا پہلا استاد تھا، اس کی آواز بڑی گرج دار تھی لیکن جسامت لچک دار تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھا اُردو کے حرف 'ح' کی طرح مُڑا تڑا پڑا ہوتا تھا''۔ ایک اور کردار راجا کا ذکر یوں ہوتا ہے: ''راجا کے منہ میں دانت ضرور دکھائی دیتے تھے اس کے باوجود اس کی آواز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بولتے وقت اپنی بتیسی کو گرنے سے بچانے کی فکر میں زیادہ رہتا ہے۔ ایک جگہ وہ ایک بچے کی زبانی دادا کا ذکر یوں کرتا ہے: ''میں ان کے پاس اس لیے نہیں سوتا کہ اگر وہ سو رہے ہوں تو خراٹے لیتے ہیں اور اگر جاگ رہے ہوں تو کھانستے رہتے ہیں۔ اس طرح کے ہلکے پھلکے جملے ہمیں ناول کے کرداروں کو Real Life کردار سمجھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

لیکن اس ناول کی مجموعی فضا ایک خوف اور حیرت میں گھلی ہوئی ہے کہ رامو جیسا زہریلا آدمی کیسے کیسے حالات میں مبتلا ہوتا ہے جب اسے مختلف مقامات پر مختلف صورتِ حالات میں خوبصورت لڑکیوں سے واسطہ بھی پڑتا ہے، وہ اُس پر ملتفت بھی ہوتی ہیں، مگر رامو واضح طور پر ہم بستری کی دعوت ملنے پر بھی گریزاں رہتا ہے، اور ناول میں کچھ مقامات پر پلاٹ کے تقاضوں کے تحت جب وہ ایسا کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں ان لڑکیوں کو اسی رات اس کے بدن میں رچے ہوئے زود اثر سانپوں کے زہر کا شکار ہو کر اپنی جان دینی پڑتی ہے۔ اس مہلک زہر کا پہلا شکار وہ راج کماری رمپا تھی جسے چار برس پیشتر سانپ نے چھاتی پر کاٹ لیا تھا اور باپو نے رامو کو اس کے علاج کے لیے اس لیے بھیجا تھا کہ وہ ابھی کم عمر تھا، رمپا تبھی سے رامو کے عشق میں گرفتار تھی، اب چار برس بعد اس نے رامو سے کہا ''جب تم نے میرے اندر سے سانپ کا زہر چوسنا شروع کیا تو مجھے یوں لگا جیسے تم میرے اندر عشق کا رس گھول رہے تھے'' اور پھر وہ خود سپردگی کی انتہا پر پہنچ گئی اور بولی ''کبر لی جانے سے پہلے میں تمہارے قرب سے اپنی من کی اگنی بجھانا چاہتی ہوں''۔ ایسا ہوا، اور اگلے روز ہوٹل کے کمرے میں رمپا کی موت واقع ہو گئی۔ یہاں رامو کا دکھ دیکھیے ''میں عجیب سے تذبذب کا شکار تھا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے اس لڑکی کی بے وقت موت پر دکھی ہونا چاہیے یا اس کی زندگی کی پہلی اور آخری سہاگ رات کا جشن منانا چاہیے۔ جو لڑکی ابھی چند گھنٹوں پہلے کسی بلبل کی مانند چہک رہی تھی، کسی کوئل کی مانند کوک رہی تھی اور کسی ہنس کی چال رہی تھی اب اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے موندے بے حرکت لیٹی تھی''۔

دوسری لڑکی جس سے رامو کا جنسی تعلّق کانپور پہنچ کر ہوا اس کا نام ماریہ ہے جو غالباً پارسی خاندان کی ہے۔ اور یہ تعلّق کسی محبّت کے نتیجے میں نہیں بلکہ شراب نوشی کی جذباتی حالت میں ہوتا ہے، اسی شب ماریہ کی موت ہو جاتی ہے، اور اس کا سوگوار باپ پطرس روتے ہوئے رامو کو بتا رہا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر نے بتایا کہ رات کو اس پر دل کا جان لیوا دورا پڑا تھا۔ لیکن جب رامو ماریہ کی لاش دیکھتا ہے، اس کے ہونٹوں کی رنگت دیکھ کر اور اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر نظریں دوڑا کر اور اس کے ہاتھوں کے ناخنوں کو دیکھ کر رامو سمجھ جاتا ہے کہ ماریہ کے جسم پر ساری نشانیاں سانپ کے کاٹے کی تھیں۔ تب اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ سانپ وہاں کیسے آیا، اور ماریہ کے جسم میں سانپ کا زہر کیسے داخل ہوا۔ یہیں اسے رمپا کی موت اور رمپا کی لاش کا منظر یاد آیا تو سمجھ گیا کہ رمپا اور ماریہ کی اموات سانپ کے زہر سے ہوئی تھی، مگر وہ سانپ کے ذریعے نہیں بلکہ رامو کے جسم کے اندر وا پا سانپ کا زہر تھا! اور وہ خود کلامی کرتے ہوئے کہتا ہے ''میرے زہر سے، دونوں میرے ساتھ ہم بستری کی سزاوار تھیں اور یہ زہر اُن کے جسم میں

کسی سانپ نے نہیں، میں نے، یعنی ایک سپیرے نے دورانِ ہم بستری داخل کیا تھا۔۔۔یہ سوچ رامو کو پاگل کرنے کے لیے کافی تھی کہ اُس کی رگوں میں خون نہیں بلکہ سانپوں کا زہر دوڑ رہا تھا۔اس لئے اسے کاٹنے والے حشرات الارض ہی نہیں مرتے تھے، بلکہ پیار کرنے والے بھی ہم بستری کرنے کے بعد زہر کی تاب نہ لاتے ہوئے ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو جاتے تھے۔یہاں مصنف رامو کے ذریعے ایک طویل خود کلامی کرتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے کہ باپو نے کورا نامی لڑکی سے اس کی جو سگائی کی تھی اب وہ اُس سے شادی نہیں کرے گا ورنہ اس شادی کے نتیجے میں کورا بھی موت کے گھاٹ اتر جاتی۔

عجیب کشمکش کے عالم میں رامو نے ایک طویل مراقبے کا فیصلہ کیا اسے خود بھی علم نہیں تھا کہ یہ طویل مراقبہ کتنے عرصے تک جاری رہا۔اس دوران کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے اور ایک امریکی ٹیم اسے فتح پور سیکری میں اکبر بادشاہ کے محل میں ہیلی کوپٹر پر اس لیے لے جاتی ہے کہ وہاں موجود خزانے کی کھدائی میں لاتعداد زہریلے سانپوں کی موجودگی حائل ہو رہی تھی۔یہاں مصنف قاری کا اشتیاق بڑھانے کے لیے بڑے مستند انداز میں بتاتا ہے کہ یہ محل اکبر بادشاہ نے اپنی چہیتی بیوی جودھا بائی کے لیے بنوایا تھا۔جودھا بائی نے اسے پسند نہ کیا تو یہ بے آباد ہو گیا،اور وہیں ایک کمرے میں موجود لاش مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے بھائی دارا شکوہ کی تھی جسے ۱۶۵۹ء میں بادشاہ نے مروا دیا تھا اور اس کی لاش کا پتہ نہ چل سکا تھا۔اس امریکی ٹیم کی ایک رکن ڈالیا ہے جس کے گلے میں لاکٹ پر اللہ کا نام دیکھ کر رامو حیران ہوتا ہے تو ڈالیا اسے بتاتی ہے کہ یہ لاکٹ اسے اس کی نانی نے اسی دن دیا تھا۔کہانی کی کڑیاں ملتی جاتی ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ روزی (اسی ٹیم کا ایک کردار) کا پردادا آرتھر ویلزلی برطانوی فوج میں جنرل تھا، جسے ۱۷۹۸ء میں ٹیپو سلطان کی سرکوبی کے لیے مصر سے ہندوستان بلایا گیا تھا اور سرنگاپٹم کی چوتھی لڑائی میں اسی نے ٹیپو سلطان کو ۱۷۹۹ء میں شکست دی تھی۔فتح کے بعد جشن کے طور پر وہ سندر بن کے جنگلوں میں شکار کھیلنے کے لیے اپنی بیگم کے ساتھ سندر بن گیا جہاں سے واپسی پر پڑاؤ کے دوران اس کی بیگم کو خیمے میں رات کے وقت کسی بچے کے رونے کی آواز آئی تو اس نے باہر اس بچے کو دیکھا اور یہ لاکٹ اس کے کپڑوں میں اڑسا ہوا تھا۔اس بچے کا نام پارکر ویلزلی رکھا گیا اور جب امریکیوں کو کچلنے کے لیے برطانیہ سے جنرل ویلزلی کو بھیجا گیا تو اس کی بیگم بھی اپنے لے پالک بچے کو ساتھ لے گئی۔جنرل آرتھر امریکی جرنل منرو کے ہاتھوں مارا گیا تو روزی کی پردادی نے امریکی جنرل منرو سے شادی کر لی۔کہانی میں لاکٹ کے درمیان ایک پتلے سوراخ سے جب اسے کھولا جاتا ہے تو اس میں سے چمڑے کی سلائی میں سلا ہوا ایک تعویذ نکلتا ہے اسے کھول کر ایک موٹی کاغذ نکلتا ہے جس پر بہت باریک الفاظ میں اردو تحریر ہے۔کسی طرح ایک محدب عدسے کے ذریعے پڑھا گیا تو اس میں اس کہانی کی کلیدی تحریر نکلتی ہے ''مناسہ کی غلام بھاگاں اپنے آقا سلطان فتح علی المعروف ٹیپو سلطان کے اس پوتے اور برکت علی کے بیٹے رحمت علی کو اپنی املاک کے ساتھ سندر بن کی دیوی بنوں بی بی کی پناہ میں دیتی ہے''، پھر مصنف ٹیپو سلطان کو اپنی شکست کا پہلے سے علم ہونے اور اس کے نتیجے میں بنوں بی بی نے روزی کے دادا کو پالنے کے لیے روزی کے پردادا کا انتخاب کیا تھا۔یوں یہ عقدہ بھی کھلتا ہے کہ روزی اور کیری اور ڈالیا تینوں ٹیپو سلطان کی نسل سے تھیں۔بہرحال اس خزانے کا سراغ لگانے کے بعد رامو کا کام ختم ہو چکا تھا اور اس ٹیم کی جانب سے خزانے کا حصہ لینے سے اس نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اب وہ واپس سندر بن میں بنوں بی بی کے ڈیرے پر جانا چاہتا ہے جہاں اس کے گزر بسر کے لیے سب کچھ ہے اس لیے وہ اسے واپسی پر اپنے ہیلی کوپٹر پر وہاں اتارتے جائیں۔

رامو کو واپسی سے قبل کی رات ڈالیا کی جانب سے ایک اور دعوت گناہ ملتی ہے جب وہ پتلا سا سفید نائٹ گاؤن پہنے اس کے خیمے میں داخل ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ اس کے بچوں کی ماں بننا چاہتی ہے۔رامو اسے لے کر اس کمرے میں جاتا ہے جہاں ڈرموں میں سانپ بند تھے، وہ ایک ڈرم سے سانپ کو نکال کر اس سے خود کو ڈسواتا ہے تو وہ خطرناک ترین سانپ فوراً مر جاتا ہے۔سانپ کا انجام دکھا کر وہ ڈالیا کو بتاتا ہے کہ میں ایک زہریلا انسان ہوں جس کے جسم میں پیدائش کے بعد سے ۱۸ سال تک دنیا کے ہر قسم کے سانپ کا زہر داخل کیا جاتا رہا، وہ صاف گائی سے کام لیتے ہوئے اسے بتاتا ہے کہ کن حالات میں اس سے ہم بستری کرنے والی دونوں عورتیں زندگی سے محروم ہو گئی تھیں۔رامو مزید گفتگو میں ڈالیا کو یہ بھی بتاتا ہے کہ سنسار میں ہر شے کی تخلیق کا ایک مقصد ہوتا ہے، اور جب اسے مقصد کا علم نہیں تھا تو پیار کیا اور پھر اسے سزائیں ملتی رہیں۔لیکن اب اسے اپنے ہونے کا مقصد معلوم ہے اس لیے وہ تیسری بار وہی غلطی نہیں دہرائے گا اور ڈالیا سے جسمانی تعلق قائم نہیں کرے گا۔ڈالیا نے جب اُس کی باتیں سن کر اس سے تخلیق کا مقصد پوچھا تو وہ بولا ''مجھے بھگوان نے دوسروں کی سیوا کے لیے پیدا کیا ہے۔اگر میں نہ ہوتا تو تمہیں اپنے اجداد کی کھوئی ہوئی دولت نہ ملتی''۔ڈالیا سے رامو کا یہ مکالمہ بڑا اہم اور سبق آموز ہے کہ ڈالیا جو پہلے اصرار کر رہی تھی کہ وہ اپنی ساری دولت چھوڑ کر بھی رامو کے ساتھ رہنا چاہتی ہے، رامو کے ساتھ گفتگو نے اس کا ذہن بدل دیا اور یہ مانتے ہوئے کہ وہ اب تک خود غرضی کے عالم میں سوچ رہی تھی، چنانچہ وہ اس کی زندگی سے نکل گئی۔

اب رامو ہیلی کوپٹر میں سوار ہونے کا ارادہ ترک کر کے کیمپ میں سریت کے خیمے میں جا کر اسے کہتا ہے کہ وہ اسے بس کے اڈے تک چھوڑ آئے اور جیپ میں جاتے ہوئے اس نے سریت کو بتایا کہ یہاں اس کا کام ختم ہو چکا۔بارہ گھنٹوں کے بس کے سفر کے بعد وہ سندر بن پہنچا جہاں اس کا قریب المرگ باپو اس کا منتظر تھا۔اکھڑتی ہوئی سانسوں کے درمیان باپو اسے بتاتا ہے کہ دیوتا اور دیویاں اس سے خوش ہیں اور رامو کے جیون کا مقصد ہی دوسروں کی سیوا ہے۔یہاں باپو اسے بہت سی باتیں کرنے اور بہت سے بھیدوں سے آشنا کرتا ہے، اور قاری ان باتوں کے دوران ہی میں سمجھ لیتا ہے کہ باپو اب دنیا سے جانے ہی والا ہے، وہی ہوا اور باپو کی چتا کو آگ رامو نے ہی دکھائی جس کے بعد اس کی راکھ بنوں بی بی کے ڈیرے کے پاس زمین میں دبا دی۔

باقی صفحہ ۱۱۰ پر ملاحظہ کیجیے

برف کا نور محمد جمالی

آغا گل
(کوئٹہ)

نور محمد جمالی کا تعلق جعفر آباد کے قصبہ غلام محمد جمالی سے تھے۔جیون بھوگنے 15 جولائی 1978ء کو بدترین جاگیرداری نظام میں جنم لیا۔مجھے سبی ڈسٹرکٹ سے محبت ہے۔میرا بچپن یہاں گزرا۔ان دنوں سبی ڈسٹرکٹ میں مری بگٹی علاقے،ہرنائی سے زیارت اور کولپورتک کا علاقہ شامل تھا جنوب میں شاہی واہ تک۔پھر جاگیرداروں نے جھٹ پٹ۔بیل پٹ جیسے تاریخی نام اپنے ناموں سے منسوب کیے۔انہیں کچھ دشواری بھی نہ ہوئی کیونکہ مارشل لاء کا تختہ ملاں، سردار، جاگیردار،نواب اٹھاتے چلے آئے ہیں۔میگنا کارٹا کی شدید مخالفت بھی چرچ نے کی تھی اور زمینوں کی تقسیم کو مولوی تقی عثمانی جیسے لوگوں نے روکتے ہوئے عین اسلامی قرار دیا۔قرارداد مقاصد بھی سعودیہ کا تحفہ تھا جیسے مولوی تقی عثمانی نے ڈرافٹ کر کے لیاقت علی خان کے ذریعے قانون بنوا دیا۔جس قانون سے ہم بدستور جھلسے جا رہے ہیں۔بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ میں ضد کر کے دورے پہ ساتھ نکلتا۔ان دنوں گھوڑوں،تانگوں،اونٹوں کا رواج تھا۔پانچویں کا امتحان میرے والد محمد اکبر خان خود جا کر لیا کرتے۔جب وہ طلباء کو املا دیتے تو مجھے بھی تختی پکڑوا دی جاتی۔ٹاٹ پہ بیٹھ کر میں بھی مستعار قلم دوات اور تختی پہ لکھنے لگتا۔

''اے لو گھٹا اٹھی۔مور دھینگنے لگے،ہاتھی چنگھاڑنے لگے،شیر گرجنے لگے۔ چیونٹیاں رینگنے لگیں''

نور محمد جمالی نے بھی ٹاٹ کے اسکول میں تعلیم حاصل کی جسمانی طور پر وہ اپنے علاقے اور قصبے سے باہر نہ نکل پایا۔مگر ذہنی طور پر وہ ترقی پسند بنتا چلا گیا۔میٹرک گنداخہ سے کیا۔

ویسے پیدائشی نام تو حامد علی خان تھا۔مگر اس کے ماموں سکندر جمالی نے افغان انقلابی۔بائیں بازو کے ترقی پسند دانشور ناول نگار نور محمد ترکئی کے نام پر نور محمد تجویز کیا۔نام کے اثرات نے جمالی کی شخصیت کو مزید حسن بخشا۔اگرچہ ایک کسان خاندان تھا۔مگر تعلیم اور عصری شعور سے بہرور تھا۔اس کے والد بھی کونسلر رہیں۔اور والدہ بچیوں کی تعلیم کے لیے معاشرے کا ذہن ہموار کرتی رہیں۔چھ بھائیوں دو بہنوں پہ مشتمل اس کسان خاندان کو جاگیرداری میں جکڑے نظام میں تعلیم دینا کچھ آسان نہ تھا مگر ارادوں کی طاقت نے مشکلات پہ قابو پا لیا۔نور محمد نے ہمیشہ جماعت میں میرٹ لیا۔کالج میں تعلیم کے لیے اوستہ محمد جانا پڑا۔اس کے بعد شعبۂ اردو میں داخلہ لینے کوئٹہ چلا آیا۔اور صوبہ بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔یہیں ادبی محفلوں،تقاریب میں میل جوڑ بڑھا۔ویسے وہ 1997 سے لکھتا چلا آیا،بچوں کے رسالوں سے ابتداء کی اور رفتہ رفتہ ادبی۔جرائد میں لکھنے لگا۔لاہور،کراچی کوئٹہ کے ادبی رسالوں میں توجہ پانے لگا۔روزنامہ آساپ میں بھی لکھتا رہا۔(جو فاشسٹ ریاست نے شہید کر دیا) ادبی جلسوں میں متعدد بار بلوچستان کی نمائندگی بھی کی۔اس کے انعامات اور سرفرازی کی طویل فہرست ہے۔وہ ایک کامیاب انسان تھا۔انتہائی ملنسار،پر اعتماد، باادب،متواضع۔پھر وہ رومانی افسانہ نگار بن کر ہماری برادری میں شامل ہو لیا۔

''میں اگر مر کر مہر گڑھ بھی بن جاؤں آج سے آٹھ ہزار سال بعد میری لاش سے تمہاری یاد کے کھنڈر کھود کر نکالیں گے''

اپنی ادبی تنظیم پارس قائم کی،اس نام کے تحت اشاعتی کام بھی ہوا۔کالم نگاری بھی شروع کی،اس نے ریجنل ازم میں لکھا۔قبائلی زندگی سے وابستہ محرومیاں صدیوں سے طاری پسماندگی غربت۔ذہنی و جسمانی غلامی،دیوتا سمان جاگیردار جو جنت بی بی کے پیچھے سماج کو لگائے رکھتے ہیں۔

جاگیرداری نے مولوی کے ذریعہ کنگلے فقیر کو idealised کر رکھا ہے۔وہی رول ماڈل ہے کہ روز محشر اسے حساب نہیں دینا پڑے گا۔ایک دھوتی بنیان کا بھلا کیا حساب غالب نے بھی بڑھاوا دیا۔

''رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو''

2007 میں پبلک کمیشن کا امتحان پاس کر کے گریڈ ستراں میں استاد مقرر ہوا۔چونکہ سلسلہ کوہ کن سے جا ملتا ہے۔بی ایڈ۔ایم ایڈ کی ڈگریاں حاصل کر کے تعلیم کے شعبہ میں بھی مہارت تامہ حاصل کی۔افسانہ نگاری بدستور جاری تھی۔2020 سے اس کے فکشن پر تحقیقی مقالے بھی آنے لگے۔جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ۔معیار بلند ہے۔ورنہ تو پروفیسر خالد خٹک صدر شعبہ بہت چھان پھٹک کر کے ہی موضوع کی اجازت دیا کرتے ہیں۔

''برف کے تاج محل''افسانوی مجموعہ مکمل ہوا تو مجھے تعارف لکھنے کو کہا، اس میں بائیس افسانے ہیں۔میرا پسندیدہ افسانے سادہ عام فہم اور پر اثر ہیں۔ان کی بنیاد رومانیت ہے۔محبت کا وہ پراسرار طاقتور جذبہ جو انسان تو کیا کائنات کو بھی جوڑے رکھتا ہے۔ممتاز کرنے والا پہلو یہ ہے کہ جمالی کے افسانے میں عالمی ادب کے حوالے ملتے ہیں۔جیسے شرت چندر چیٹرجی کا دیوداس،افسانوں میں سماجی ناہمواریاں اور رواجوں کے خون آشام ناگ سرسراتے ہیں۔اغواء،خاندانی وقار۔

وٹہ سٹہ ولور پر مبنی کہانیاں۔اس سماج کی عکاسی جہاں عورت کو بارٹر سسٹم کے تحت لین دین کاروبار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔بکری کی طرح ایک کھونٹے سے دوسرے کھونٹے پہ شادی کا نام دے کر باندھ دیا جاتا ہے۔مزاحیہ افسانے ''مرحوم رام پوری'' جیسے بھی اور شدید طنزیہ بھی۔آنسوؤں کا دریا۔برف کے تاج محل محض افسانے ہی نہیں۔ایک کرپٹ فاشسٹ معاشرے کے عکاسی ہیں۔آسان لکھنا بہت ہی مشکل ہے۔اور مختصر افسانہ یا افسانہ یا پوپ سٹوری تو تخلیق کار کا نام پوچھتی ہے۔

باقی صفحہ ۱۱۵ پر ملاحظہ کیجیے

زیست پر کیا بنی خدا جانے

محمد اصغر یزدانی
(اوکاڑہ)

ہم کو دنیا کے اجالوں سے بہت نفرت ہے
ہم چمکتا ہوا سورج بھی بجھا سکتے ہیں

اس طرح کے معنی خیز، خوبصورت شعر کہنے والی نوجوان شاعرہ ساکشی صدف کے بارے میں لوگ سمجھتے رہے کہ شاید یہ زندگی کے کسی تجربے یا مشاہدے کو موضوع بنا رہی ہے۔۔۔کسے معلوم تھا کہ وہ اپنے بہت سے خیالات کو عملی تجربے سے محسوس کرنا چاہتی ہے۔۔۔وہ ساری زندگی اپنے فکر انگیز اشعار سے انسانی رشتوں اور وجود کی پیچیدگیوں کے کرب کو کم کرنے کے لیے خاموشی اور شور کے راستے میں سے کسی ایک کا انتخاب نہ کر سکی۔اس نے اپنے اندر کلبلاتے بہت سے غیر محسوس جذبات کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کی خواہش میں ۹۔فروری ۲۰۲۴ء کی سہ پہر خودکشی کر لی۔۔۔!!

صدف خوش شکل، خوش اخلاق اور خوش اطوار تو تھی مگر اسے کوئی خوشی راس نہ آئی تو اس نے شعراء کے اس قبیلے کی طرف ہجرت کی جو اس سے قبل موت کو ایسے ہی گلے لگا چکے تھے۔۔۔اب وہ عدم میں اپنے ہم خیالوں انس معین، سارہ شگفتہ، ثروت حسین، شکیب جلالی، قمر بشیر، شبیر شاہد کے ساتھ محوِ گفتگو ہو گی، بالخصوص ۱۹۸۴ء میں موت کو گلے لگانے والی سارہ شگفتہ کے ساتھ، جس نے کہا تھا:

تجھے جب بھی کوئی دُکھ دے
اُس دکھ کا نام بیٹی رکھنا

ساکشی کہتی ہو گی، کہ میں اپنا نام دکھ رکھنے پر تو قادر نہ تھی مگر میں نے مختصر زندگی میں اپنے اندر دکھوں کا تانا بانا بنا اور دکھوں کے لبادے میں ہی دائمی پناہ کو عافیت جانا۔۔۔اس نے ۱۹۶۶ء میں موت کو پر کشش جاننے والے ثروت حسین کی فکر پر مہر تصدیق ثبت کر کے اسے کہا ہو گا کہ ثروت آپ ٹھیک کہتے تھے:

موت کے درندے میں اک کشش تو ہے ثروت
لوگ کچھ بھی کہتے ہوں خودکشی کے بارے میں

ساکشی صدف نے ۱۹۸۶ء میں موت کے پس پردہ رازوں کو جاننے کے متمنّی انس معین کے اس شعر کی داد بھی اسے ضرور دی ہو گی:

اس کے پیچھے چھپی ہیں کتنی دیواریں
جسم کی یہ دیوار گرا کر دیکھوں گا

شاید ساکشی صدف کے من میں ۱۹۷۴ء میں اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر راوی کنارے جا کر آج تک نہ لوٹنے والے شبیر شاہد کا حیرت کدہ دیکھنے کی خواہش تھی، جس نے کہا تھا:

فرطِ حیرت سے بھرا گھر دیکھتا رہ جائے گا
ہم چلے جائیں گے دروازہ کھلا رہ جائے گا

ساکشی صدف کو ۱۹۹۱ء میں موت کی بانہوں میں جھول جانے والے قمر بشیر کا یہ شعر تو اچھا لگتا تھا:

موت کی بانہوں میں ہی جا کر قمرؔ
زندگی کے راز کو سمجھوں گا میں

مگر کیا وہ موت کے جھولے میں زندگی اور موت کے ناحل طلب عقدے کو حل کر پائی ہو گی۔۔۔یقیناً نہیں۔۔۔!

وہ ۱۹۶۶ء میں موت کے قلزم میں ہمیشہ کے لیے غوطہ زن شکیب کو کہتی ہو گی، کہ آپ نے کہا تھا:

تُو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

تو شکیب مجھے بھی ایسے نام نہاد غم گساروں سے نفرت تھی، میں ان کے ساتھ نہیں چل سکتی تھی۔۔۔تبھی تو میں نے کہا تھا:

دوست دشمن یا اور کوئی رشتہ ہو
صرف وہ کیجیے جو آپ نبھا سکتے ہیں

لہٰذا میں نے ساتھ نبھانے کے لیے موت کا انتخاب کیا۔ساکشی کے اشعار پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ زندگی سے فرار کا رستہ اس نے اچانک نہیں چُنا۔ رشتوں میں عدم خلوص، سرد مہری اور منافقت سے دکھی ساکشی اپنے خلوص کا اظہار شاعری میں مسلسل برملا کرتی نظر آتی ہے:

تیرے ہی نام کے آنسو ہیں میری آنکھوں میں
تیرے ہی نام کا کاجل لگا رہی ہوں میں
تمھاری یاد میں کھوئی ہوں کس قدر دیکھو
سفید رنگ کو نیلا بتا رہی ہوں میں

اور کئی اشعار میں بھی ساکشی کو بصری دھوکے سے نیلے رنگ کا گمان محض ایک واہمہ ہی نہیں تھا بلکہ یہ داخلی خلوص اور خارج میں منافقت کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے زہر کی علامت تھا جو آہستہ آہستہ ساکشی کے رگ و پے میں سرایت کرتا رہا۔یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سماج میں نظر آنے والے تضادات نے ساکشی کے وجود میں بے اطمینانی اور شک کو جنم دیا، جس سے اس کے ذہن میں ایسی کیفیت پیدا ہو گئی جہاں پھول بھی کانٹے نظر آنے لگتے ہیں:

روز کھا لیتے ہو قسم مجھ کو بھلانے کی مگر
سچ بتاؤ کہ حقیقت میں بھلا سکتے ہو؟
سوچنا تبھی میرا ہاتھ پکڑنے کے لیے
زندگی بھر جو میرا ساتھ نبھا سکتے ہو؟

ساکشی نے اپنے وجود کی پیچیدگیوں کو کھولنے کے لیے شاعری کا سہارا لیا تھا کہ شاید اس طرح اس کی ذات کا کتھارسس ممکن ہو سکے۔ وہ اپنی ہر اُلجھن کو فنکارانہ انداز میں اپنی شاعری کے ساختی تانے بانے میں سموتی تو ہے مگر اس کے وجود کا پیار سے گندھی مٹی کا خمیر اور معاشرے میں ہر جگہ عدم تحفظ کا احساس اس کے دل و دماغ میں تناؤ کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ہر جگہ ایک سہمے ہوئے بچّے کی طرح نظر آتی ہے۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ ساکشی کے اشعار میں الفاظ کے جذباتی استعمال کا تاثر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا:

جو مجھ پر الزام لگاتے رہتے ہیں
آئینہ ان کو دکھلانا پڑتا ہے
تم سے ہاتھ ملانے کی بے تابی میں
ہم کو سب سے ہاتھ ملانا پڑتا ہے

جو بھی ہو، ساکشی نے موت سے ہاتھ ملا کر اچھا نہیں کیا، وہ کہا کرتی تھی:

اپنی آنکھوں سے کئی شور سنا سکتے ہیں
رہ کے خاموش بھی ہم شور مچا سکتے ہیں

کاش ساکشی زندگی کی آغوش میں خاموش رہ کر شور مچاتی تو اچھا لگتا، مگر اس نے موت کے گہوارے میں جا کر سب کو خاموش کر دیا۔۔۔ خودکشی کر لینے والا نوجوان ادیب، احسن فارقلیط کسی عربی دانشور کے قول یا شعر کا ترجمہ دہرایا کرتا تھا:

''زندگی بوجھ بن جائے تو باقی ماندہ سانسیں عزرائیل کے منہ پر دے مارو'' مگر زندگی ساکشی کے لیے تو بوجھ نہیں تھی، اگر تھی تو اس نے اس کا کسی کو احساس تک نہیں ہونے دیا۔ اس کے عام رویوں میں اس قدر جھنجلاہٹ بھی نہیں تھی۔۔۔ اس کے باوجود اس نے زندگی کی سانسوں کا قرض اتارنے کا اس قدر بھیانک فیصلہ کیا۔ افسوس کسی کو نہیں معلوم کہ ساکشی کے باطن میں کیا شورش بپا تھی۔ اس کی بے وقت موت کے کرب کو شکیب جلالی کے الفاظ میں محسوس کیا جا سکتا ہے:

موت نے آج خودکشی کر لی
زیست پر کیا بنی خدا جانے

- بقیہ -

زہریلا انسان

ناول کا آخری باب قارئین کی خاص توجہ کا مستحق ہے جس میں راموکہانی کو سمیٹتے ہوئے لکھتا ہے ''وقت کے ریلے مجھے بہا کر جن جن راہوں میں لے گئے میں ہنس کر گیا تھا۔ اس کے صلے میں دیوتاؤں نے مجھے وہ کچھ دیا ہے کہ اب میری آواز سننے اور مجھ سے بات کرنے کے لیے یاتریوں کا ایک سیلِ رواں ہوتا ہے۔ دیویاں اور دیوتا ہر شب میری کٹیا میں مجھے ملنے عام لوگوں کی طرح آتے ہیں اور میری زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی تعمیل کرتے ہیں۔۔۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب لوگ تیاگی ہو کر میری طرح جنگلوں میں رہیں۔ میں کہتا ہوں کہ لوگ دنیاداری میں قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ میں نے اپنی یہ سوانح دنیا والوں کو یہ سمجھانے کے لیے لکھی ہے کہ مشکلات اور دکھوں کا راستہ ہی اصل میں فلاح کا اور شانتی کا راستہ ہے''۔

یہ آخری سطریں رام نے ساٹھ سال کی عمر میں لکھیں جس میں اُس نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ اب وہ ہفتے کے چھ دن صرف اپنی کٹیا میں بندرہ کر بنوں بی بی کی مالا جپنے میں گزارتا ہے جبکہ سوموار کا دن اس نے یاتریوں کی سیوا کے رکھا ہوا ہے۔ ایک رات کٹیا میں بنوں بی بی کی مالا جپتے ہوئے اُسے سانپوں کی دیوی یعنی مناسہ دیوی کی خوشبو محسوس ہوئی اور کٹیا یکلخت تیز روشنی سے بھر گئی تو اس نے دیکھا کہ مناسہ دیوی اور بنوں بی بی دونوں بہ نفسِ نفیس اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ مناسہ دیوی نے اپنی بانہوں میں ایک نومولود بچہ سنبھالا ہوا تھا جسے اس نے رامو کے سپرد کرتے ہوئے کہا کہ آج سے یہ بچہ آپ کے پاس ہم دونوں کی امانت ہے، ساتھ ہی بنوں بی بی نے بھی ایک سنہری رنگت کی شیش ناگن رامو کو تھماتے ہوئے کہا کہ یہ اس بچے کی ماتا کا دوسرا جنم ہے، اب تم بچے کے راکھی ہو۔ یہ کہتے ہوئے وہ دونوں ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔

رامو نے اس بچے کا نام بھی اپنے نام پر راموہی رکھا اور اس کے ساتھ وہیں بجنی کھلی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔

اس ناول کا اختتام اس منظر پر ہوتا ہے کہ اب بجنی کھلی کی اسی جھونپڑی میں نومولود راموا اور ساٹھ سالہ رامو کا قیام ہے، ساٹھ سالہ رامو کا آخری جملہ بھی سن لیجیے: ''میرا راموا دو برس کا ہونے کو ہے اور اس نے آج پہلی بار مجھے باپو کہا ہے''۔

یوں گویا یہ کہانی ختم نہیں ہوئی بلکہ ایک نئے راموا اور ایک نئے باپو کے ساتھ اب بھی جاری ہے!

حوالہ جات:

(۱) تابش خانزادہ/زہریلا انسان/ناشر: الحمد پبلی کیشنز، لاہور/سنِ اشاعت ۲۰۲۳ء
(۲) ایضاً (میری باتیں۔صفحہ ۷) (۳) ایضاً (کچھ زہریلا انسان کے بارے میں۔صفحہ ۱۸)
(۴) ایضاً (کچھ زہریلا انسان کے بارے میں۔صفحہ ۱۸) (۵) ایضاً (خانزادہ کا زہریلا انسان۔صفحہ ۲۱)

ایک صدی کا قصّہ

امیتابھ بچن

دیپک کنول (ممبئی)

آگرہ کے ایک جناب تھے جو برٹش حکومت سے نواب کا خطاب پانے کے شدید متمنی تھے۔زندگی بھر اُنہوں نے یہ خطاب پانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر برٹش حکومت نے اُنکی درخواست کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔جب سالہا سال کی دھوڑ دھوپ کے بعد اُنہیں کوئی کامیابی نہیں ملی تو وہ تھک ہار کے بیٹھ تو گئے مگر دل کی یہ خواہش مری نہیں جس خطاب کو اُنہوں نے اپنی زندگی کا منتہائے مقصود سمجھ لیا تھا اُسے نہ پانے کا درد رات دن اُن کے دل کو کچوکے مارتا رہتا تھا۔تشنگی کا یہ عالم تھا کہ خوابوں میں بھی اُنہیں لفظ نواب کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی۔اپنے دل کی تسلی کے لئے اُنہیں ایک تدبیر سوجھی جس نے سب کو حیران کر دیا۔جب اُن کی بیٹی نے ایک بچے کو جنم دیا تو نانا جان نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اس بچے کا نام نواب رکھ دیں۔نانی نے اُنہیں ٹوک کر کہا کہ نا تا نہیں ناتی ہوئی ہے تو نانا جان برہم ہو کے بولے۔جو بھی ہے اس کا نام نواب بانو رکھدو۔مجھے اگر انگریزوں نے نواب کے خطاب سے نہیں نوازا تو کیا ہوا میں اپنے ناتے پوتے کو اس خطاب سے خود سرفراز وں گا۔اسطرح آگرہ کے عبدل حکیم کے گھر میں پیدا ہونے والی بچی کا نام نواب بانو رکھا گیا جو بعد میں فلم اداکارہ نمی کے نام سے مشہور ہوئیں۔

اسی طرح ایک اور صاحب نے اپنے پہلوٹھی کے بیٹے کا نام انقلاب رکھنا چاہا۔وہ انقلاب زندہ باد کے نعرے سے اس حد تک متاثر تھے کہ اُنہوں نے اپنے بیٹے کا نام انقلاب رکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ جس وقت یہ بچہ اُن کے گھر میں پیدا ہوا تھا اُس وقت آزادی کی جد و جہد جاری تھی اور ہر طرف انقلاب زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے۔سوچئے اگر وہ اپنے اس فیصلے پر قائم رہتے تو آج آپ کو امیتابھ بچن کی جگہ انقلاب شریواستو یا انقلاب بچن سننے کو ملتا۔یہ تو بھلا ہو ہندی کے جانے مانے لیکھک سمترا نندن پنتھ کا جنہوں نے ہری ونش رائے بچن کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا اور اُس کا نام انقلاب کے بجائے امیتابھ بھجایا۔

امیتابھ بچن 11 اکتوبر 1942 کو آلہ باد (پریاگ راج) میں ہری ونش راج بچن اور جیا بچن کے گھر پیدا ہوا۔ہری ونش راج بچن اودھی کا ستھ تھے اور اُن کی ذات شریواستو تھی۔چونکہ وہ ذات پات کے کٹر مخالف تھے اس لئے اُنہوں نے شریواستو کا لاحقہ اپنے نام کے ساتھ نہیں لگایا بلکہ اس کی جگہ اپنے نام کے ساتھ بچن جوڑ دیا۔اودھی میں جس کا مطلب ہوتا ہے بچہ جیسا۔یہ اُن کا تخلص تھا۔اسی نام سے وہ اپنا تخلیقی کام کرتے رہے۔اُنکے اجداد پرتاب گڑھ کے بابو پٹی گاوں سے الہ آباد منتقل ہوئے تھے اور پھر وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ہری ونش رائے بچن ہندی کے بہت بڑے کوی تھے۔ہندی کے علاوہ اُنہیں اودھی ہندی اور اُردو زبان پر دسترس حاصل تھی۔اُن کی بیوی تیجی بچن (لائل پور) پنجاب کے ایک پنجابی سکھ کھتری پریوار میں پیدا ہوئی تھی۔چونکہ ہری ونش رائے بچن نے بچن تخلص رکھا تھا جو بعد میں اُن کی پہچان بن گیا۔

جب امیتابھ کو اسکول میں داخل کیا گیا تو ماں کے اصرار پر شریواستو کی جگہ اُس کا نام امیتابھ بچن لکھوا دیا گیا۔امیتابھ بچن نے اپنی پڑھائی کی شروعات الہ باد کے بوائز ہائی اسکول سے شروع کی۔آگے کی پڑھائی اُس نے شیروڈ کالج نینی تال میں پوری کی۔گریجویشن اُس نے کروری مل کالج دلی یونیورسٹی سے پوری کی۔

پڑھائی پوری کرنے کے بعد ہری ونش بچن نے پرتھوی راج کپور سے رابطہ کیا اور اُن سے گزارش کی کہ وہ اُن کے بیٹے کو اپنے یہاں کام کرنے کا موقع دیں۔پرتھوی راج کپور نے امیتابھ بچن کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔امیتابھ بچن نے آل انڈیا ریڈیو میں بھی ''نیوز ریڈر'' کا آڈیشن دیا مگر وہاں بھی اُسے فیل کر دیا گیا۔کہا گیا کہ اُسکی آواز ریڈیو کے لئے موزوں نہیں ہے۔غرض یہ کہ امیتابھ بچن کی کوئی بھی حسرت پوری نہ ہوئی۔

تیجی بچن اندرا گاندھی کے بیحد قریب تھیں۔دونوں گھرانوں کا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا ہوتا تھا۔امیتابھ کے راجیو گاندھی اور سنجے گاندھی کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔جب سونیا گاندھی پہلی بار اٹلی سے ہندوستان تشریف لائیں تو ائیر پورٹ پر اُسے خوش آمدید کہنے کے لئے امیتابھ بچن کھڑا تھا۔شادی سے پہلے وہ اٹھتالیس دنوں تک اپنے والدین کے ساتھ ہری ونش رائے بچن کے گھر میں ہی قیام پزیر رہیں۔

اداکاری کا شوق امیتابھ بچن کے دل میں ماں کے کہنے پر ہی پیدا ہوا تھا۔وہ چاہتی تھیں کہ امیتابھ بچن اداکاری میں اپنے جوہر دکھائے۔اب جب کہ کہیں سے اُس کے شوق کی تکمیل نہیں ہو پا رہی تھی تو اُس نے نوکری کرنے کا فیصلہ کیا۔کلکتہ کی بارڈ اینڈ کمپنی میں اُسے ایکزیکیٹو کی نوکری مل گئی۔کلکتہ چونکہ کلا کے معاملے میں کافی زرخیز تھا تو امیتابھ بچن نے وہاں پر تھیٹر میں فاضل وقت میں کام کرنا شروع کیا۔

1969 میں اُس نے پہلی بار مرنال سین کی فلم ''بھون شوم'' میں بطور راوی اپنی آواز کا استعمال کیا۔اس فلم کو نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔اسی بیچ اُس نے اپنی ماں سے کہہ کر اندرا گاندھی سے ایک سفارشی خط منگوایا جو کہ خواجہ احمد عباس کے نام تھا۔خواجہ احمد عباس اُن دنوں اپنی آنے والی فلم ''سات ہندوستانی'' پر کام کر رہے تھے اور نئے کلاکاروں کے ساتھ چھوٹے بجٹ کی فلمیں بناتے تھے۔خط پا کر عباس صاحب نے امیتابھ بچن کو اسکرین ٹسٹ کے لئے بلوایا اور اُس کا اسکرین ٹسٹ لے لیا۔جانے مانے ہدایت کار ٹینو آنند اُس زمانے میں عباس صاحب کے ساتھ بطور اسسٹنٹ کام کرتے تھے۔ٹینو آنند ہندی اور انگریزی کے جانے مانے رائٹر ملک راج آنند کے صاحبزادے تھے۔ٹینو آنند اور امیتابھ بچن کی

جلدی دوستی ہوگئی۔ امیتابھ بچن کو اس فلم میں ایک رول ملا۔ یہیں پر اُس کی ملاقات محمود کے چھوٹے بھائی انور علی سے ہوئی۔ وہ بھی اس فلم میں کام کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ مدھو اور جلال آغا بھی اس فلم میں شامل تھے۔ یہ فلم 1969 میں ریلیز ہوئی اور اس فلم کا حشر بھی وہی ہوا جو عباس صاحب کی فلموں کا ہوتا تھا۔ اس فلم سے امیتابھ بچن کو کوئی پہچان نہ ملی۔ اسی بیچ اُسے رشی کیش مکھر جی کی فلم ''آنند'' میں ایک چھوٹا سا کردار کرنے کی پیشکش ملی۔ رشی کیش مکھر جی ہدایت کاروں میں ایک معتبر نام تھا جس کی فلم میں کام کرنا کوئی بھی اداکار فخر کی بات سمجھتا تھا۔ اس فلم کا ہیرو راجیش کھنہ تھا جس کی اُس دور میں طوطی بولتی تھی۔ امیتابھ بچن کافی دبلا پتلا اور لمبے قد کا نوجوان تھا جو کسی بھی زاویے سے ہیرو کے کردار کے لئے موزوں نہیں تھا اس لئے وہ چھوٹے موٹے رول ادا کرنے لگا۔ اس فلم میں اُس کا کردار ایک ڈاکٹر کا تھا۔ فلم نے باکس آفس پر تہلکہ مچا دیا اور امیتابھ بچن کے رول کو بھی کافی پسند کیا گیا۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا لوگ اُسے بابو موشائے کہہ کر بلاتے تھے۔ یہ اُس کردار کا نام تھا جو کافی مقبول ہوا تھا۔ اتنی مقبولیت کے باوجود اُسے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُسے اس فلم کی بدولت معاون اداکار کے طور پر فلم فیر ایوارڈ پانے کا موقع ملا۔ اسی سال اُس کی اور دو فلمیں ریلیز ہوئیں جن کے نام تھے ''پروانہ'' اور ''ریشما اور شیرا''۔ فلم ''پروانہ'' کا ہیرو نوین نشچل تھا جب کہ وہ ایک منفی کردار میں تھا۔ فلم نہیں چلی۔ دوسری فلم ''ریشما اور شیرا'' تھی جو کہ سنیل دت کی ذاتی فلم تھی جس میں اُسے ایک چھوٹا سا رول ملا تھا وہ بھی گونگے کا۔ یہ فلم بھی اُسے اُس کی قابلیت کی وجہ سے نہیں ملی تھی بلکہ وہ نرگس دت کے نام اندرا گاندھی کا ایک خط لے کر آیا تھا۔ اُسی سفارش کی بنیاد پر اُسے اس فلم میں یہ چھوٹا سا رول ملا تھا۔ سنیل دت نے اُس کو ایک چھوٹا سا رول تو دیا مگر اُس کے کردار کو گونگا بنا دیا تا کہ وہ کوئی مکالمہ ہی نہ بول پائے۔ یہ فلم بھی باکس آفس کی کھڑکی پر پٹ گئی۔

رشی کیش مکھر جی کی فلم ''گڈی'' میں اُسنے بطور مہمان اداکار کام کیا۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران اُس کی ملاقات پہلی بار اپنی ہونے والی بیوی جیا بہادری سے ہوئی۔ یہ فلم بھی اُس کے لئے کوئی معجزہ نہ کر سکی۔ ایک طرف مالی تنگی دوسری طرف فلمسازوں کے دفتروں سے ذلیل ہو کے نکلنا۔ جہاں بھی وہ کام مانگنے جاتا تھا لوگ اُس کا مذاق اُڑاتے تھے۔ لوگ اُس کی شکل وصورت پر فقرے کستے تھے۔ اس طرح وہ لوگوں کے طعنے سنتا اور تنہائی میں بیٹھ کر روتا۔ وہ انور علی کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ وہی اُس کی ہمت بندھاتا۔ جب ایک سال تک اُسے کوئی کام نہیں ملا تو اُس نے واپس دلی جانے کا فیصلہ کیا۔ تبھی محمود نے ایک فلم بنانے کا فیصلہ کیا جس کا نام تھا ''بمبئی ٹو گوا''۔ اس فلم میں محمود، ارونا ایرانی کے علاوہ شتروگھن سنہا اور انور علی بھی کام کر رہے تھے۔ امیتابھ بچن کو بھی اس فلم میں ایک رول مل گیا۔ یہ دوسری فلم تھی جو کامیاب ہوئی تھی۔ امیتابھ بچن کی چودہ فلموں میں صرف دو فلمیں کامیاب رہی تھیں جب کہ ایک درجن کے قریب فلمیں ناکام رہی تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دن جب وہ دادر کے رنجیت اسٹوڈیو میں داخل ہوا تو کئی لڑکوں کی اُس پر نظر پڑی۔ اُنہوں نے امیتابھ کو دیکھ کے اُسے گالیاں دیں۔ سالا ایکٹر بننے آیا ہے۔ تھوبڑا تو دیکھو۔ سالا اونٹ کے مافق لگ رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اُس کو کوئی ایکٹر ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسی دوران سلیم جاوید جیسے لکھاریوں کا طلوع ہوا تھا۔ اُنہوں نے مل کر ایک کہانی لکھی تھی جس کا نام اُنہوں نے ''زنجیر'' رکھا تھا۔ جانے مانے فلمساز اور ہدایت کار پرکاش مہرہ کو یہ کہانی کافی پسند آئی اور اُس نے یہ کہانی خرید لی۔ اب ہیرو کی تلاش ہوئی۔ یہ کہانی ایک باغی نوجوان کی تھی جو ناانصافی سے لڑتا ہے۔ دیو آنند کو رجوع کیا گیا۔ اُسے کہانی تو پسند آ گئی مگر اپنی رومانٹک امیج کو مدنظر رکھتے ہوئے اُس نے یہ فلم کرنے سے اس لئے انکار کر دیا کیوں کہ اس میں نہ کوئی رومانس تھا اور نہ ہی ہیرو کا کوئی گانا۔ دیو آنند کے بعد راج کمار کو یہ کہانی سنائی گئی۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ وہ سنکی قسم کا آدمی تھا۔ اُسے کہانی پسند تو آ گئی مگر پرکاش مہرہ کے سر پر لگا سرسوں کا تیل اُسے پسند نہ آیا۔ انہی دنوں جاوید نے محمود کی فلم ''بمبئی ٹو گوا'' دیکھی تھی۔ اُسے اس میں امیتابھ بچن کا کام پسند آیا۔ اُس نے سلیم سے بات کی۔ دونوں کو لگا کہ یہ لڑکا اس رول کے لئے فٹ بیٹھتا ہے۔ وہ اُسے پرکاش مہرہ کے پاس لے کر گئے۔ اُسے اس حد تک قائل کر لیا کہ یہی لڑکا یہ کردار بخوبی ادا کر سکتا ہے۔ پرکاش مہرہ نے اُن کی رائے سے اتفاق کیا اور امیتابھ بچن کو اس فلم کے لئے سائن کیا گیا۔ اب ہیروئن کا مسلہ تھا۔ کوئی بھی بڑی ہیروئن اس فلاپ ایکٹر کے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جیا بہادری اُس وقت تک ایک کامیاب ہیروئن بن چکی تھی۔ وہ امیتابھ بچن کے ساتھ کام کرنے کے لئے راضی ہوگئی۔ فلم کے اختتام تک امیتابھ بچن کو ہر پل یہ کھٹکا لگا رہتا کہ کہیں اُسے فلم سے باہر نہ کر دیا جائے۔

1973 میں جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو اس فلم نے ملک بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ اتنی بے پناہ کامیابی کو دیکھ کر امیتابھ بچن کو بخار چڑھ گیا اور وہ تین دن تک بستر پر پڑا رہا۔ اس فلم کے ساتھ ہی ایک اسٹار کا جنم ہوا تھا۔ جو کل تک امیتابھ بچن کی شکل و صورت کا مذاق اُڑایا کرتے تھے وہی اس فلم کی اپار کامیابی دیکھ کر سکتے میں رہ گئے۔ یہی فلم جب کھلے اسکرین پر دادر کے اُس علاقے میں دکھائی گئی جہاں کے لونڈے لپاڑوں نے ایک وقت رنجیت اسٹوڈیو کے باہر امیتابھ بچن کو گالیاں دی تھیں، آج وہی لونڈے لپاڑے یہ فلم دیکھنے کے لئے سامنے کی صف میں بیٹھے تھے۔ جیسے ہی امیتابھ بچن کی اینٹری ہوئی تو یہ لونڈے اُچھل اُچھل کر تالیاں بجانے لگے۔ یہ ہوتا ہے وقت کا ہیر پھیر۔ اس فلم نے امیتابھ بچن کو اسٹار بنا دیا۔ ہندی فلمیں جو اس سے پہلے رومانس کے دلدل سے باہر نکل نہیں پا رہی تھیں اس فلم کی ریکارڈ توڑ کامیابی نے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ امیتابھ بچن کو ''اینگری ینگ مین'' کی پہچان ملی۔

ایک طرف سلیم جاوید کی جوڑی شہرت کی بلندیوں کو چھو رہی تھی تو دوسری طرف امیتابھ بچن کی بھی مانگ بڑھنے لگی تھی۔ سلیم جاوید اب جو بھی کہانی لکھ رہے تھے امیتابھ بچن کو ذہن میں رکھ کر لکھ رہے تھے۔ جب ''دیوار'' کی کہانی تیار ہوئی تو اس کا مرکزی کردار وجے کے روپ میں امیتابھ بچن ہر فریم میں دکھائی دے

رہا تھا۔ یہ ایک اور فلم تھی جس نے امیتابھ بچن کو بلندی کی معراج تک پہنچا دیا۔ اس فلم نے بھی ریکارڑ توڑ کمائی کی۔ اس کے بعد آئی رمیش سپی کی صدا بہار فلم ''شعلے''، جس نے بمبئی ٹاکیز کی فلم ''قسمت'' کا ریکارڑ توڑ دیا۔ اب امیتابھ بچن کے گھر کے باہر فلمسازوں کی لائن لگی رہتی تھی۔ اُن میں وہ پرڈیوسر بھی شامل تھے جنہوں نے امیتابھ بچن کا برے دنوں میں مذاق اُڑایا تھا۔ اُسے دفتر سے ذلیل کر کے نکال دیا تھا۔

حکیم کیرانوی بمبئی انڈسٹری کا سب سے مہنگا اور سب سے جانا مانا ہیر اسٹالسٹ تھا۔ وہ کئی ستاروں کے بال سنوارتا تھا۔ امیتابھ بچن کی وہ پہلی پسند تھا۔ حکیم سے میرے بڑے ہی دوستانہ مراسم تھے۔ ایک دن اُس نے مجھے ایک واقع سنایا۔ حکیم امیتابھ کے بال بنا رہا تھا تبھی اُس کے نوکر نے آ کر کہا کہ ایک پرڈیوسر ملنے آئے ہیں۔ حکیم نے جب پرڈیوسر کا نام سنا تو اُس نے امیتابھ سے کہا۔ سر جی یہ وہی فلمساز ہے جس نے ایک زمانے میں آپ کی بے عزتی کی تھی۔ آج حساب برابر کرنے کا موقع ہے۔ اسے اتنا لٹائیے کہ دوبارہ وہ ادھر کا رخ نہ کرے۔ امیتابھ نے مسکرا کے حکیم کی طرف دیکھا اور پھر اُس پرڈیوسر سے ملنے ویٹنگ روم میں گیا تو حکیم بھی پیچھے پیچھے چلا آیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ امیتابھ بچن اس پرڈیوسر کی خبر کیسے لیتے ہیں۔ جیسے ہی امیتابھ بچن کمرے میں داخل ہوا تو وہ اُس پرڈیوسر سے ایسے گلے ملا جیسے دو دوست برسوں بعد آپس میں مل رہے ہوں۔ امیتابھ نے اُس کے لئے چائے کافی منگوائی اور پھر اُس سے آنے کا سبب پوچھا۔ پرڈیوسر کافی گھبرایا ہوا تھا۔ اُسے اس بات کی توقع نہ تھی کہ امیتابھ اُس کے ساتھ اتنی گرمجوشی کے ساتھ پیش آئے گا کیونکہ اُس کے کہے ہوئے الفاظ آج اُسے ہی ڈرا رہے تھے اور وہ کسی حد تک نادم و پشیمان دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے جھجکتے ہوئے امیتابھ سے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ ایک فلم کرنا چاہتا ہے تو امیتابھ نے خوش ہو کے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ فلم ضرور کرے گا۔ پرڈیوسر نے معاوضے کے بارے میں پوچھا تو امیتابھ نے ڈیڑھ گنا معاوضہ مانگا۔ فلمساز اتنا شاداں تھا کہ اُس نے خوشی خوشی اُس کی مانگ قبول کر لی۔ جب وہ چلا گیا تو حکیم نے قدرے بیزاری سے کہا۔ میں تو یہ سوچ کے کھڑا تھا کہ آپ اس بندے کا مار مار کے گال بجھا دیں گے۔ آپ نے ہاتھ چلانے کی بجائے اُس کے ہاتھوں میں لڈو تھما دئے۔ امیتابھ نے بڑے پیار سے حکیم کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ تو زیادہ سوچا نہ کر۔ چل اپنا کام کر۔ بعد میں حکیم کو وہ محاورہ یاد آ گیا کہ جو گڑ دئے سے مرے اُسے زہر کیوں دیا جائے۔ امیتابھ بچن نے ڈیڑھ گنا معاوضہ مانگ کر اُسے ویسے ہی مار ڈالا۔ کہا جاتا ہے کہ بزنس کے معاملے میں وہ پکا مارواڑی ہے۔

یہ سلیم ہی تھا جس نے امیتابھ بچن کو من موہن ڈیسائی سے ملایا۔ دونوں نے ایک ساتھ کئی فلمیں کیں جنہوں نے کمائی کے اگلے پچھلے ریکارڑ توڑ دئے۔ 1977 کی فلم ''امر اکبر انتھونی'' اور ''پرورش''۔ 1979 کی فلم ''سہاگ'' 1981 کی فلم ''نصیب'' 1982 کی فلم ''دیش پریمی''۔ 1983 کی ''قلی''۔ اسی فلم میں امیتابھ بچن حادثے کا شکار ہوا تھا۔ حادثہ اتنا جان لیوا ثابت ہوا کہ ڈاکٹروں نے اُس کے بچنے کی آس چھوڑ دی تھی۔ دیش بھر سے امیتابھ بچن کے چاہنے والے اُس کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگے۔ نانا وتی اسپتال کے باہر اُس کے مداحوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ وہ کئی مہینوں تک اسپتال میں زیر علاج رہا۔ اُس کے چاہنے والوں کی دعائیں کام کر گئیں۔ ایک سال کے بعد اُس نے فلم ''قلی'' کی باقی شوٹنگ پوری کی۔ پہلے کا جو کلائمکس تھا اُسے بدل دیا گیا۔ پہلے اس فلم میں امیتابھ کی موت ہو جاتی تھی لیکن اب کی بار اس میں تبدیلی کی گئی اور اُسے زندہ رکھا گیا۔ اس حادثے کی وجہ سے فلم کو اتنی تشہیر ملی کہ فلم نے باکس آفس کی کھڑکیوں پر کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔

امیتابھ بچن لیش چوپڑہ کا محبوب اداکار تھا۔ لیش چوپڑہ نے بیشتر فلمیں امیتابھ بچن کے ساتھ ہی کیں۔ ''ترشول'' ''کبھی کبھی'' ''سلسلہ'' اور ''محبتیں''۔ فلم ''دیوار'' گلشن رائے کی فلم تھی جب کہ لیش چوپڑہ اس فلم کا ہدایت کار تھا۔ یہیں سے دونوں میں ایسی دوستی ہو گئی جو مرتے دم تک قائم رہی۔ ''سلسلہ'' کی اصل کہانی سنانے سے پہلے میں یہاں ایک ایسی فلم کا ذکر کروں گا جس نے امیتابھ بچن کی ازدواجی زندگی میں طوفان کھڑا کر دیا۔ ''زنجیر'' کی کامیابی کے ساتھ ہی جیا بہادری اور امیتابھ بچن شادی کے بندھن میں بندھ گئے اور وہ جیا بہادری سے جیا بچن ہو گئیں۔ ان کے یہاں دو بچوں نے جنم لیا۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ جیا بہادری نے بچوں کی خاطر فلمی زندگی کو تلانجلی دی اور وہ بچوں کے پالن پوشن میں لگی رہی جب کہ امیتابھ بچن کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتا جا رہا تھا۔ اس فلم کی ہیروئن ریکھا تھی۔ نہ جانے امیتابھ کے ہاتھوں سے دل کہاں پھسل گیا۔ وہ ریکھا کو دل دے بیٹھا۔ ریکھا بھی اُس کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ وہ چپ چاپ ملتے رہے اور گھنٹوں پیار و محبت کی باتیں کرتے رہے۔ امیتابھ بچن یہ بھول گیا کہ وہ شادی شدہ ہے اور دو بچوں کا باپ ہے۔

فلم ''دو انجانے'' کے دوران ریکھا اور امیتابھ بچن اس قدر قریب آ گئے کہ دونوں کو لگا کہ وہ ایک دوسرے کے بنا جی نہیں سکتے۔ امیتابھ بچن شادی شدہ تھا پھر بھی وہ ریکھا کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ اُنہوں نے اس رشتے کو دنیا کی نظروں سے چھپا کے رکھا۔ وہ جب ساتھ میں شوٹنگ نہیں کرتے تھے تو ریکھا کے ایک دوست کے بنگلے پر اکثر ملا کرتے تھے۔ امیتابھ بچن کے بارے میں یہی کہا جاتا تھا کہ وہ ایک ذمہ دار شوہر اور باپ ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنی وفا شعاری کی آڑ میں کیا گل کھلا رہا تھا۔

1978 کی فلم ''گنگا کی سوگندھ'' کی شوٹنگ کے دوران ایک دن امیتابھ بچن ایک معاون اداکار پر بھرے سیٹ پہ برس پڑا جس نے ریکھا کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ اس خبر کو میڈیا نے لپک لیا اور یہاں سے چمگوئیاں شروع ہو گئیں۔ دونوں نے ان افواہوں کی تردید کی مگر یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ ریکھا اور امیتابھ بچن کے بیچ چکر چل رہا ہے۔ اخباروں میں یہ خبر شہ سرخی کے ساتھ چھاپی گئی کہ ریکھا اور امیتابھ کے بیچ ناجائز تعلقات ہیں۔ کچھ لوگوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ دونوں نے خفیہ طور پر شادی بھی کر لی ہے۔ اس خبر کو

اُس وقت تقویت ملی جب ریکھا ایک دن رشی کپور اور نیتو سنگھ کی شادی میں اچانک نازل ہوگئی۔اس تقریب میں جیا بچن بھی شامل تھی۔ریکھا ماتھے پر بندی گلے میں منگل سوتر اور مانگ میں سیندور ڈال کر پہلی بار دکھائی دی۔یہ سب چیزیں ایک سہاگن کی علامتیں ہوتی ہیں۔ریکھا تو کنواری تھی۔اُس نے کب شادی کی یہ سوال سب کے من میں گونجنے لگا۔ایتابھ اور ریکھا کو لے کر جو افواہیں اُڑ رہی تھیں ،ریکھا کو اس روپ میں دیکھ کر اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ ریکھا نے خفیہ طور پر ایتابھ سے شادی کی ہے۔جیا بچن بھی ان افواہوں سے غافل نہ تھی۔وہ جیا کے پاس بھی گئی اور اُس سے حسب دستور بات چیت کی۔لوگ سوچنے لگے کہ ریکھا کو دیکھ کے جیا کے دل پر اُس وقت کیا بیتی ہوگی؟ جیا نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کافی کوشش کی مگر وہ ضبط نہ کر پائی۔وہ سر جھکا کے کھڑی رہی اور اُس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو بہتے چلے گئے۔چند منٹوں کی حاضری کے بعد ریکھا وہاں سے شاہانہ انداز میں قدم اُٹھاتے ہوئے چلی گئی مگر جاتے جاتے وہ ڈھیر سارے سوالات چھوڑ گئی۔

اس ملاقات کے چند روز بعد جیا بچن نے ریکھا کو کھانے پر اپنے گھر بلایا۔ریکھا حسب وعدہ پہنچ گئی۔جیا اپنے دل میں جو کسک محسوس کر رہی تھی وہ اسے بے چین کئے جا رہی تھی۔اس لئے جب ریکھا گھر پر آئی تو جیا کے دل کا ایک ایک گھاؤ ٹیسنے لگا۔اُسنے ریکھا سے دوٹوک لہجے میں متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ لاکھ کوشش کرے، وہ اپنے شوہر کو چھوڑے گی نہیں چاہے زمین آسمان ایک کیوں نہ ہوجائے، وہ اُسے اپنا گھر توڑنے کی اجازت نہیں دے گی۔ریکھا جیا کے تیور دیکھ کر خاموش ہوگئی اور بغیر کچھ کہے وہاں سے اُٹھ کے چلی گئی۔

ایتابھ بچن دو کشتیوں میں سوار تھا۔وہ دونوں کشتیوں کو تھام کے رکھنا چاہتا تھا جو کہ آسان نہیں تھا۔وہ جب بھی کسی میگزین کو انٹرویو دیتا تو ہر بار اپنی بیوی کے تئیں وفا شعاری کی قسمیں کھاتا تھا۔وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ اپنے پریوار کے تئیں وفادار ہے اور ہمیشہ رہے گا۔وہ ساری زندگی بس ایک ہی کا ہو کے رہنا چاہتا ہے۔جب ریکھا سے پوچھا جاتا تھا تو وہ اپنے پیار کو چھپاتی نہیں تھی۔وہ بانگ دہل اس بات کا اعتراف کرتی تھی کہ وہ ایتابھ بچن کو پیار کرتی ہے اور وہ بھی اُس سے پیار کرتا ہے۔جب اُس سے ایتابھ بچن کے انٹرویوز کا حوالہ دیا جاتا تو وہ یہ کہہ کر اُس کا بچاؤ کرتی کہ وہ اپنی امیج ،اپنے پریوار اور اپنے بچوں کی خاطر اس طرح کے بیان دے رہا ہے۔ساتھ ہی وہ یہ سوال بھی کرتی تھی کہ لوگوں کو یہ جاننے کا حق کس نے دیا ہے کہ آیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں کہ نہیں ۔یہ سچ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ایتابھ بچن پرانی سوچ رکھتا ہے اس لئے وہ اس طرح کے بیانات دے رہا ہے تا کہ اُس کے بیان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔میں بھی نہیں چاہتی ہوں کہ جیا کے دل کو میری وجہ سے کوئی ٹھیس پہنچے۔

ان دونوں نے ایک ساتھ درجن کے قریب فلمیں کیں اور سبھی فلمیں زبردست کامیاب رہیں۔''دو انجانے''''الاپ''''خون پسینہ''''گنگا کی سوگندھ'' ''مقدر کا سکندر''''مسٹر نٹور لال''''سہاگ''''رام بلرام''اور''سلسلہ''۔''سلسلہ''اُن کی آخری فلم تھی جس میں یہ تینوں تھے۔ایتابھ بچن، ریکھا اور جیا بچن۔ان تینوں کو ایک ساتھ لانے میں یش چوپڑہ کو خوب پاپڑ بیلنے پڑے۔جیا بچن تو ریکھا کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔یش چوپڑہ نے اُسے بڑی مشکل سے کام کرنے کے لئے راضی کرلیا۔یہ فلم اُن تینوں کی پریم کہانی کے پس منظر میں لکھی گئی تھی۔

حادثے سے اُبھرنے کے بعد ایتابھ بچن کو بیوی کی اہمیت کا احساس ہوگیا۔جس طرح جیا نے اسپتال میں اُس کی سیوا کی وہ دیکھ کے ایتابھ بچن کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ جیا بچن کی زندگی میں واپس لوٹ گیا۔اس حادثے کے بعد اُسکا وزن کافی گھٹ گیا تھا اور وہ کافی نقاہت محسوس کر رہا تھا۔اُس کی صحت کی وجہ سے اُس نے فلموں سے سنیاس لے لیا۔اسی دوران اندرا گاندھی کا قتل ہوا۔اپنے دوست راجیو گاندھی کی اس مشکل گھڑی میں وہ اُس کے ساتھ رہا۔ جب راجیو گاندھی کو ملک کا وزیر اعظم بنایا گیا تو اُس نے چاہا کہ ایتابھ بچن بھی راج نیتی میں آجائے۔ہیم وتی نندن بہوگنا جو کہ کانگریس کا ایک اہم لیڈر تھا اور اُتر پردیش کا چیف منسٹر رہ چکا تھا۔اُسکا پارٹی ہائی کمانڈ سے چند باتوں پر اختلاف ہونے کی وجہ سے اُس نے پارٹی چھوڑی تھی۔کانگریس پارٹی نے بہوگنا کو ہرانے کے لئے ایتابھ بچن کو میدان میں اُتارنے کا فیصلہ کیا۔الہ آباد ایتابھ بچن کا آبائی شہر تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا پلا بڑھا تھا۔وہ 1984 کے پارلیمانی الیکشن میں بھاری اکثریت سے جیت گیا اور پارلیمنٹ ممبر بن کر دلی کے پارلیمنٹ میں پہنچ گیا۔

اُس کا یہ سیاسی سفر بہت مختصر رہا۔1987 میں انڈین ایکسپریس میں یہ خبر چھپی کہ ایتابھ کے چھوٹے بھائی اجتابھ بچن نے سوئزرلینڈ میں ایک اپارٹمنٹ خریدا ہے۔اس خبر سے سیاسی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ایتابھ بچن کا نام بوفورس اسکینڈل میں شامل ہوگیا۔حالات ایسے بن گئے کہ ایتابھ بچن نے اسی سال سیاست کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا اور واپس فلموں میں لوٹ آیا ۔اُس کے دوست ٹینو آنند نے فوراً اُسے اپنی فلم کے لئے سائن کیا جس کا نام ''شہنشاہ'' تھا۔فلم 1988 میں ریلیز ہوئی اور فلم سپر ہٹ ہوئی۔اس فلم کے بعد بچن کے ستارے گردش میں آگئے۔اس فلم کے بعد''جادوگر''''طوفان''اور''میں آزاد ہوں'' کوئی کمال نہ دکھا سکیں حالانکہ ان فلموں کے ہدایت کار پرکاش مہرہ، من موہن ڈیسائی اور ٹینو آنند تھے جنہوں نے ایتابھ کو لے کر کامیاب فلمیں بنائیں تھیں۔1990 میں ریلیز ہونے والی فلم''آج کا ارجن''''اگنی پتھ''اور 1991 کی فلم''ہم'' کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔''اگنی پتھ'' کے لئے اُسے نیشنل فلم ایوارڈ سے نوازا گیا۔اُسکے بعد فلم''خدا گواہ'' ریلیز ہوئی جو ناکام رہی۔وہ دھیرے دھیرے اپنی مقبولیت کھوتا جا رہا تھا۔فلموں کی ناکامی دیکھ کر اُس کی آنے والی فلم''انسانیت'' کی نمائش میں دو سال کی تاخیر کی گئی۔جب 1994 میں یہ فلم ریلیز ہوئی تو اس کا حشر وہی ہوا جو''خدا گواہ'' کا ہوا تھا۔

امیتابھ بچن نے عارضی طور پر فلموں سے ریٹائرمنٹ لے لیا۔اُسنے امیتابھ بچن کمپنی لمیٹیڈ یعنی ABCL کے نام سے اپنا پروڈکشن ہاوس کھول لیا۔اس بینر کے تحت فلمیں بننے لگیں۔پہلی فلم ''تیرے میرے سپنے'' نئے کلاکاروں کے ساتھ بنائی گئی جو کہ کامیاب رہی۔فلم کی کامیابی سے حوصلہ پا کر امیتابھ بچن نے اپنے کھوئے ہوئے مقام کو واپس پانے کے لئے ایک فلم بنانے کا فیصلہ کیا جس کا نام ''مرتیو داتا'' رکھا گیا۔یہ فلم 1997 میں ریلیز ہوئی اور بری طرح پٹ گئی۔اس سے پہلے اس کمپنی نے 1996Miss World beauty Pageant Banglore پر خوب پیسہ بہایا۔جو کمپنی کا اسٹاف تھا اُن کی موٹی موٹی تنخواہیں مقرر کی گئیں۔کمپنی بہت جلد مالی بوجھ سے چرمرانے لگی۔صرف دو سال کے اندر اس کمپنی کا دیوالیہ نکل گیا۔امیتابھ بچن کو مالی بحران سے جھوجنا پڑا۔اس بحران سے اُسے سماج وادی پارٹی کے لیڈر امر سنگھ اور سہارا کمپنی کے بانی سبروتو رائے نے نکالا۔کئی ساری جائیدادیں جو بنکوں کے پاس گروی پڑھی تھیں اُنہیں وہاں سے چھڑایا گیا۔قرضے کے اس جال سے نکلنے کے لئے امیتابھ بچن کو پھر سے ایکٹنگ کا سہارا لینا پڑا۔تقدیر سے ۱۹۹۹ء کی فلم ''چھوٹے میاں بڑے میاں'' چل گئی۔اسی سال ایک اور فلم ''میجر صاحب'' بھی کامیاب رہی لیکن اُس کے بعد کی فلمیں ''سوریہ ونشم'' ''لال بادشاہ'' اور ''کہرام'' پست رہیں۔

امیتابھ بچن کی مانگ کم ہونے لگی۔اس انڈسٹری کی یہ روایت رہی ہے کہ یہاں چڑھتے سورج کی پوجا کی جاتی ہے۔ڈوبتے سورج کو کوئی نہیں پوچھتا۔دو سال وہ گھر میں بیٹھا رہا۔ایک دن وہ یش چوپڑہ سے جا کے ملا اور اُس کے ساتھ دوبارہ کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔اُن ہی دنوں یش چوپڑہ کا لڑکا ادتیہ چوپڑہ ایک فلم بنا رہا تھا جس کا نام ''محبتیں'' تھا۔اس فلم سے امیتابھ بچن کی دوسری پاری شروع ہوئی۔وہ ہیرو کا رول چھوڑ کے کیرکٹر رول کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔اس کے بعد فلموں کی لائن لگ گئی۔ناظرین نے امیتابھ بچن کو اس نئے رول میں پسند کیا۔''کبھی خوشی کبھی غم'' ''باغبان'' ''عکس'' ''آنکھیں'' ''کانٹے'' ''خاکی دیو'' اور ''ویرزارا'' ایسی فلمیں ہیں جو بیحد کامیاب رہیں۔سن ۲۰۰۰ء میں اُس نے ٹیلی ویژن پر ''کون بنے گا کروڑ پتی'' پروگرام پیش کیا جس نے پورے ملک میں دھوم مچا دی۔ہر گھر میں رات کے نو بجے سے اس پروگرام کو لوگ بڑے چاؤ سے دیکھتے تھے۔امیتابھ بچن نے ہر وہ کام کیا جہاں سے وہ پیسہ کما سکتا تھا۔اُس نے ہر طرح کے اشتہارات کئے جہاں سے اسے اچھا خاصا پیسہ ملنے لگا۔فلموں میں ایکٹنگ کے ساتھ گانے بھی گائے۔فلم ''پا'' میں اُس نے اپنے بیٹے ابھیشک بچن کے بیٹے کا رول ادا کیا۔فلم 'سرکار' میں اُس نے بال ٹھاکرے کا کردار احسن طریقے سے نبھایا۔اسی طرح فلم 'بلیک' میں ایک اندھی لڑکی کے ٹیچر کے رول میں اُس کی خوب واہ واہ ہوئی۔''چینی کم'' میں ایک ادھیڑ عمر کے عاشق کے رول میں بھی وہ بازی مار گیا۔اُس نے ہر طرح کے رول کئے اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ ہمہ جہت فن کار ہے۔رشی کیش مکھرجی کی فلم ''چپکے چپکے'' میں اُس نے مزاحیہ رول اس خوبی کے ساتھ نبھایا کہ مشہور کامڈین بھی اُس سے رشک کرنے لگے۔

امیتابھ بچن اسی کے پڑاؤ میں بھی نہ تھکنے کا نام لے رہا ہے نہ رکنے کا۔وہ فلمیں بھی کر رہا ہے،اشتہاروں میں بھی نظر آرہا ہے اور ٹیلی ویژن میں بھی چھایا ہوا ہے۔اُس کا ایک بیٹا ہے جس کا نام ابھیشک بچن ہے جو کہ ایک ہیرو ہے۔اُس کی بہو ایشوریہ رائے بچن اعلیٰ پائے کی اداکارہ ہے۔اُس کی بیٹی شویتا نندہ ملک کے ایک بہت بڑے صنعت کار کے گھر میں بیاہی گئی ہے۔بیوی جیا بچن سیاست میں سرگرم ہے۔وہ سماج وادی پارٹی کی ممبر پارلیمنٹ ہے۔بھائی اجیتابھ اُن سے الگ اپنی زندگی گزار رہا ہے۔امیتابھ بچن کے بارے میں اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر جگہ کی تنگی اس بات کی اجازت نہیں دیتی اس لئے اجازت۔

- بقیہ -

برف کا نور محمد جمالی

ایک روز اچانک جمالی کے تابڑ توڑ حملے ہونے لگے ''ابھی ملنا ہے،اسی وقت ملنا ہے'' نیشنل پارٹی کا اجلاس ڈاکٹر مالک بلوچ کی زیر صدارت جاری تھا۔میں نے بتایا کہ کچھ وقت لگے گا۔شام ہونے کو آئی تو پانچواں فون آیا ''زیادہ وقت نہیں لوں گا۔مگر ملنا ضروری ہے'' میں نے پیار سے سمجھایا کہ آپ مجھے بے حد عزیز ہیں۔گھنٹوں بیٹھ کر بات کریں گے۔مغرب کے وقت میں گھر پہنچا تو فون کیا۔

''اب رات ہو رہی ہے،زحمت ہوگی،کل آجایئے'' کوئی نامعلوم قوت اور جذبہ اس کے اندر بول رہا تھا ''نہیں میں ابھی آرہا ہوں'' وہ اپنے ادیب بھائی ببرک جمالی کے ہمراہ چلا آیا۔وہ بے چین ہو رہا تھا کہ میں ''افسانوی مجموعہ برف کے تاج محل'' پر لکھوں۔اس کا اضطراب ناقابل فہم تھا،شائد وہ ٹائم اینڈ سپیس سے آگے نکل گیا تھا۔مجھے افسانوی مجموعہ کا مسودہ دیا۔ہم نے ساتھ تصویریں بنائیں۔چائے پی اور دونوں بھائی محبت سے رخصت ہوئے۔

اگلی صبح فون آیا ''ممتاز ادیب نور محمد جمالی ہم میں نہیں رہے،ان کو بجلی کا سخت شاک لگا تھا''

میرے ہاتھ سے ریسیور گر گیا۔تو کیا وہ خود ہی برف کا تاج محل تھا؟ یا ہم سبھی برف کے تاج محل ہیں دم کا بھروسہ نہیں۔

"موبائل کا رُتبہ"

خالد عرفان

(نیویارک)

ہاتھوں میں موبائل ہے مسلمان کا ہتھیار
متروک ہوئے تیر، پرانی ہوئی تلوار

کافر کی یہ ایجاد ہے، اِس عہد کا قصّہ
اب ٹیکنالوجی بھی، عقیدت کا ہے حصّہ

مسواک، نہ ٹوپی، نہ فضائل پہ نظر ہے
مسجد میں مسلماں کی موبائل پہ نظر ہے

یہ آج کا مسیح کبھی، رکھتا نہیں، کل پہ
کفّار سے لڑ جاتا ہے، الفاظ کے بل پہ

بِن مانگے مریضوں کو دوا بھیج رہا ہے
میسج میں جنازے کی دعا بھیج رہا ہے

کچھ ایسے مسلمان بھی ہیں ساٹھ برس کے
"وٹس ایپ" پہ لیتے ہیں خواتین سے چسکے

جب شمع جلاتا ہے، جمعرات کو اپنی
وڈیو میں دکھاتا ہے عبادات کو اپنی

اللہ رے! مسجد میں موبائل کا یہ رُتبہ
چیٹنگ ہے اِدھر اور اُدھر جمعہ کا خطبہ

مسجد میں نمازی کی لگن اتنی ہے سچّی
مولانا تو منبر پہ ہیں، لائن پہ ہے بچّی

بیٹھا ہے نمازی جو سمیٹے ہوئے زانو
کامینٹس میں لکھتا ہے "غضب لگتی ہو جانو!"

باندھی جو نیت، کان موبائل کی طرف ہے
پڑھتا ہے ثنا، دھیان موبائل کی طرف ہے

گولی سے، نہ بجلی سے، نہ آئل سے لڑے گا
اب جنگ مسلمان موبائل سے لڑے گا

پھیلائے گا دشمن کی صفوں میں یہ تباہی
"مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی"

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار

(راولپنڈی)

محترمی گلزار صاحب، تسلیم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ بہت خوبصورت ہے۔ اس خصوصی شمارے کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے آپ کی کاوش قابل ستائش ہے۔ سرورق، تزئین اور کمپوزنگ کے لیے فنکاروں کو مبارک۔ میں آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ یہ شمارہ آپ نے میرے نام کیا ہے۔ جس میں میری تحریریں اور مجھ پر لکھے گئے مضامین کا انتخاب کیا ہے اور میری کچھ پنجابی نظمیں بھی شائع کی ہیں حالانکہ میں شاعر نہیں ہوں، بس دو چار دن کا خمار تھا جو چند نظمیں کہہ کر اتر گیا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ میری خودنوشت کو قسط وار شائع کریں تا کہ ناچیز کو ''چہارسو'' کے قارئین پوری طرح جان سکیں۔

شمارے کا باقی مواد متاثر کن ہے خاص کر افسانے اور غزلیں۔ خورشید حیات، ارشد منیم اور ارم رحمان کی تخلیقات عمدہ ہیں۔ دیپک کنول کا افسانہ ''استاد لال سنگھ'' ان کی زبانی سن چکا ہوں اور ''ایک صدی کا قصہ'' تو کمال کی تحریر ہے۔ دیپک کنول ہندوستانی فلم نگری کے رتن لال سرشار ہیں، میرا من دہلوی ہیں، فلمی شخصیات سے متعلق ان کی تحریر دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

خالد حسین (جموں)

گلزار بھائی، السلام علیکم۔

چہارسو کا خالد حسین نمبر ہمیشہ کی مانند عمدہ ترتیب و تزئین کے ساتھ دستیاب ہوا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ چہارسو ہاتھ میں آتے ہی اپنے اشتیاق کے باعث سب سے پہلے میں پیرزادہ صاحب سے ملاقات کرتا ہوں۔ پیرزادہ صاحب نے دلّی، بمبئی، کلکتہ اور ناگپور وغیرہ کی سیر کے بعد جس طور لاہور کے علمی ادبی حلقوں کی سیر کرائی اُسی طرح کراچی کی تفصیلی سیر نے بھی بڑا لطف دیا۔ میرے خیال میں یہ تیسرا مشاعرہ ہے جو پیرزادہ صاحب نے اپنے وقت کے باکمال شاعر مصطفیٰ زیدی کے اعزاز میں منعقد کروایا۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ دیکھئے پیرزادہ صاحب کہاں کی سیر کراتے ہیں۔

تابش خانزادہ (لاس اینجلس)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ (جلد ۳۳ مارچ اپریل ۲۰۲۴ء) اپنی اعلیٰ و منفرد نگارشات کے ساتھ نظر نواز ہو۔ اس بار قرطاسِ اعزاز خالد حسین کے نام رہا۔ اردو پنجابی کے متحرک لکھاری خالد حسین کے تعارف سے ہی حیرانی ہوئی۔ ''براہ راست'' میں آپ کے سوالات اور خالد حسین کے جوابات سے ایک ماحول اور دو زبانوں کے مزاج سے واقفیت ہوتی ہے۔ پلاٹ، کہانی اور مباحثہ اور منٹو، فرائیڈ کے جنسیات اور نفسیات والے آپ کے سوالات اہم تھے جوابات مختصر تھے مگر سچائی کے ساتھ دیے ہیں۔ نور شاہ نے ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' میں صاحب اعزاز کی شخصی خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید کی تحریر ''عشق سمندر'' کی پہلی سطر ہی بڑی جاندار ہے۔

''خالد حسین اپنی ذات کے قلم کو زندگی اور زمانے کی سچائیوں میں ڈبو کر ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔'' (ص۔۲۶)

خالد حسین کی کہانیوں کا ترجمہ انگریزی، ہندی، بنگلہ، ڈوگری، کشمیری اور دیگر زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ اہل علم و فن کے مضامین ان کی تخلیقی شخصیت اور فکر و فن کی تفہیم میں اہم ہیں۔ ان کا افسانہ ''عشق ملنگی'' پڑھ کر مزہ آ گیا بہترین کہانی ہے۔ یادگار گوشہ۔ ہزار ہا تحسین گلزار جاوید بھائی کے لیے۔

نظموں کا کیا بامعنی عنوان دیا ''رخصت العریر مرحبا''۔ رفعت العریر کی آخری نظم ''خوبصورت داستان'' ایک حقیقی خواب، شہادت کا جذبہ اور پس منظر میں فلسطینیوں کی بے بسی عیاں ہیں۔ ولی عالم شاہین کی نظم ''اومیکرن'' ایسے جذبے کی عکاس ہے بلکہ تمام نظم فلسطینیوں پر ظلم و ستم، ان کی بے بسی، دنیا کے مسلمانوں کی بے حسی، اسرائیل کا جنگی جنون۔ جبیں نازاں کی ''بے یار و مددگار فلسطینیوں کے نام''، فیصل عظیم کی نظم ''جمود'' اور ڈاکٹر پرویز شہریار کی نظم ''جنگ جُو قوم کے باشندے'' خصوصی توجہ چاہتی ہیں۔ احمد علوی کے قطعات طنز کے نشتر لیے ہوئے ہیں جو کہ حسب حال ہیں۔ غزلوں کے چنیدہ اشعار جو پسند آئے۔

زندگی کو معنی دینے کے لیے جو وقت تھا
وہ جمال یار کی تفہیم میں جاتا رہا
طلعت منیر

خود پر کبھی تو نقد و نظر ہونی چاہیے
کرتا ہے کیا کبھی کوئی نقاد اس طرح
سہیلہ انعام صدیقی

وہ اپنے غصے کا اظہار ہی نہیں کرتے
سیاسی لوگ سنبھل کر چھری چلاتے ہیں
عمران راقم

بتا تو نے یہ بات سوچی بھی کیوں ہے
کہ شاعر سر شام گھر میں رہے گا
طارق تاسی

اس نے بس ایک نظر ہی دیکھا تھا
آگ لگنے لگی تھی پانی میں
امتیاز علی گوہر

دیپک کنول نے ایک صدی کا قصہ میں'' دھرمیندر'' کی داستان حیات کی جستجو،لگن اور کامیابیاں بیان کی ہیں۔ہیما مالنی سے محبت اور پھر شادی۔ دلچسپ ہے اب تک آغا گل صاحب کا افسانہ ''مستونگ میں مشتاقیت'' اور محترمہ ارم رحمان کا افسانہ ''حنوط'' پڑھ سکا ہوں دونوں لاجواب افسانے ہیں تحسین۔

''خاک شفا'' کی قسط نمبر ۱۶ کی ابتدا ہی بے تکلف مکالموں سے ہوئی۔جس سے ایک دلچسپ صورتِ حال پیدا ہوگئی۔روزمرہ زبان اور محاوروں کا برمحل استعمال،مصنف کی زبانوں بیان پر مہارت کا ثبوت ہے۔قسط پڑھنے کے بعد احساس ہو رہا ہے کہ جس طرح ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں استعمال ہونے والے محاوروں پر پی ایچ ڈی کی سطح کا کام ہو چکا ہے یہ ناول مکمل ہونے پر اس ناول پر بھی کام ہونا چاہیے۔ناول نگار ناول کے ماحول اور کرداروں کے مزاج کے اعتبار سے گفتگو (مکالمے) بڑی ہنرمندی سے پیش کر رہے ہیں۔عوامی لب ولہجہ بھی خوب ہے۔ناول میں ایک طرف بے تکلفی ہے تو دوسری طرف نستعلیق قسم کی گفتگو ہے۔پھر اشعار کا تڑکہ خوب ہے۔مشاعرے کی روداد کو ناول کا حصہ کس مہارت سے بناتے ہیں واہ واہ۔۔۔صدارت صبا اکبر آبادی،محسن بھوپالی،محشر بدایونی،مصطفیٰ زیدی،ادا جعفری،حمایت علی شاعر،شان الحق حقی،رئیس امروہوی، جمیل الدین عالی،فرمان فتح پوری،سلطان جمیل نسیم،قمر علی عباسی کیا کہکشاں سجائی ہے۔ن۔م۔راشد اور حیات اللہ انصاری والا واقعہ،کراچی کے علاقوں کا ذکر مختلف زبان بولنے والوں کا احوال اور بہت کچھ ایک جہان آباد ہے۔داد دیے بنا بات بنتی نہیں۔

فیصل عظیم نے ''چشم نم'' پر انتہائی پُر اثر تبصرہ کیا ہے۔

نوید سروش (میرپور خاص)

جناب گلزار جاوید صاحب،آداب۔

خالد حسین اردو اور پنجابی کے مقبول ادیب ہیں۔حال ہی میں انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔آپ کے سوالات اور ان کے جوابات پڑھ کر مزہ آ گیا۔اتنی خوبصورتی اور بے باکی سے انہوں نے ہر سوال کا جواب دیا ہے اور اسی نے گفتگو کو بہت دلچسپ بنا دیا۔پتا نہیں چلا کہ آٹھ صفحات کب ختم ہو گئے۔خالد صاحب کا اندازِ بیان دلچسپ ہے۔ان کی تحریر ''عشقِ ملنگی''، ''زندہ آنکھوں کی داستان'' اور ''عشق نچایا تھیا تھیا'' دل کو چھو گئے۔جموں کشمیر کا رنگ ان کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔تینوں افسانے پڑھ کر دل واہ واہ کر اٹھا۔پنجابی نظمیں بھی کمال کی ہیں۔ویسے تو آپ کا انتخاب ہمیشہ ہی بہت عمدہ ہوتا ہے اور آپ اس طرح گوشہ نکالتے ہیں کہ ادبی شخصیت کی پوری تصویر کھینچ کر قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔آپ لکھتے نہیں پینٹ کرتے ہیں۔خالد حسین صاحب اور چہارسو کو بہت بہت مبارک۔

جمیل عثمان صاحب،آغا گل،دیپک کنول،قیوم خالد،ارشد نعیم کے افسانے بہت پسند آئے۔رعنا کوثر،ارم رحمٰن اور خورشید حیات کے افسانے بھی اچھے ہیں۔کُل ملا کر افسانوں کا حصہ دلچسپ رہا۔

''خاکِ شفا'' اچھی رفتار سے اپنا معیار اب تک قائم رکھے آگے بڑھ رہا ہے۔سب سے خوبصورت بات اس ناول کی زبان اور اندازِ بیان ہے۔ کراچی کی تفصیل دلچسپ ہے اور کس خوبصورتی سے مشاعرے کی محفل سجائی ہے۔ بھئی واہ۔ایک ایک شاعر چن کر اور کہاں کہاں سے نامی گرامی شاعر اس میں شامل کیے،قابل داد ہے۔

اظہر حسین کی ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے ناول ''میرے ہونے میں کیا برائی ہے'' کا بڑے تفصیل سے تجزیہ کیا۔

ایک صدی کا قصہ نے دھرمیندر کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوئیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ابھی بھی بہت کچھ بتانا رہ گیا۔اس کے لیے تو یہ مضمون قسطوں میں ہونا چاہیے تھا۔

شعری حصہ معیاری اور دلچسپ ہے اور فلرز بھی کمال کے ہیں۔ آئندہ شمارے کا انتظار رہے گا۔دیکھتے ہیں آپ کون سی شخصیت سے ہمیں آشنا کراتے ہیں۔

رینو بہل (چندی گڑھ)

برادرِ عزیز گلزار جاوید۔سلام مسنون۔

''چہارسُو'' کا حالیہ شمارہ بہت دنوں سے ''للکار'' رہا ہے کہ مَیں اس پر اپنے تأثرات کا اظہار کر کے آپ کے ذریعے اُس تک پہنچاؤں،مگر ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا،اور قبل اِس کے کہ میری جانب سے یہ ''باعثِ تاخیر'' آپ کی جانب سے ''باعث تعزیر'' میں بدل جائے،حاضری دے رہا ہوں۔تاخیر کے بہانے کیا بناؤں،شاید عمر کے تقاضوں نے میری غیر معمولی چُستیوں کو مزید غیر معمولی سستیوں میں بدل ڈالا ہے۔اور ادبی و ''بے ادبی'' مصروفیات کی بھاگ دوڑ میں میری کچھ وہی حالت ہے کہ ''نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں''

چہارسُو کے سبھی صفحات پرنٹ ہونے کے بعد لیپ ٹاپ کی سکرین پر ظاہر ہونے والے رنگ تو بلیک اینڈ وہائٹ پرنٹر پر کھو ہی بیٹھتے تھے،اس مرتبہ ایک مشکل یہ بھی ہوئی کہ کچھ الفاظ بھی کاغذ پر دھندلے دھندلے نظر آنے لگے، تاہم جس قدر پرنٹ کرنے کے بعد پڑھا جا سکے اُن پر مختصر اظہار تو بنتا ہے۔

اس مرتبہ بھی حسبِ معمول آپ نے ایک بڑی اہم شخصیت اور اُن کے کام سے خوب تفصیلی تعارف کرایا اور کشمیر سے تعلق رکھنے والے جناب خالد حسن کی زندگی کے کوائف سے آگاہ کیا جن سے محسوس ہوا کہ وہ واقعی ایک ''سیلف میڈ'' شخصیت ہیں۔ہمارے مذہبی تعصّبات کا شکار وہ یوں ہوئے کہ تقسیمِ ہندوستان کے دوران میں جموں و کشمیر کی ریاست پر قبائلی حملے میں ان کا سارا خاندان ہی فرقہ وارانہ فسادات میں شہید ہو گیا اور سات سال تک خالد حسن ریفیوجی کیمپوں اور خانہ بدوشی کے مسائل میں گرفتار رہے۔اس تناظر میں ان کے اندر کا تخلیق کار جو کچھ لاشعور اور شعور میں جمع کرتا رہا وہ اسے ہمارے سامنے

اپنی تخلیقی ہنرمندی کے ساتھ لا رہے ہیں۔ان کی جدوجہد کی ساری کہانی اور اس میں پیش آنے والی مشکلات کا کچھ اندازہ ''براہِ راست'' میں پڑھ کر ہوتا ہے،اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ تخلیقی دنیا میں بھی تعصّبات اور دشمنیاں خوب چلتی ہیں جس کا ایک اشارہ انہوں نے کل ہند پنجابی کانفرنس کے انعقاد کے تناظر میں یہ کہہ کر دیا ہے کہ ''اس کانفرنس کو ناکام بنانے کے لیے حاسدوں اور نام نہاد پنجابی ادیبوں نے کمینے پن کی حدیں پار کر ڈالیں''۔گویا پاکستان اور ہندوستان میں جتنے بھی سیاسی، مذہبی اور نظریاتی اختلافات ہوں، سازشوں اور رکاوٹوں کے معیار پر دونوں برابر ہیں۔آپ کے سوالات کے جواب میں سیاسی حوالے اور مسئلہ کشمیر کے تناظر میں جہاں ان کی بہت سی باتوں سے اتفاق کیا جا سکتا ہے وہیں ''کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں''۔مگر یہ فروعی باتیں انہیں ایک بڑا اور سچا ادیب ماننے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتیں۔اسی شمارے میں ان کی تخلیقات نے بڑا متاثر کیا۔یہاں خط کی گنجائش تفصیل کی اجازت نہیں دیتی۔

پیرزادہ آلِ انوار کے ناول خاکِ شفا کی سولہویں قسط میں پاکستان کے کچھ معروف شعراء کا ذکر بڑی عمدگی سے پرویا گیا ہے،اور یہ سلسلہ اسی دلچسپی کے ساتھ جاری رہا تو شاید کسی قسط میں راولپنڈی اسلام آباد کا ذکر بھی آ جائے۔ابھی یہ علم تو نہیں کہ اس کی کتنی مزید قسطیں لکھنے کے بعد ناول مکمل ہوگا،مگر جب ہوگا تو اسے جناب تابش خان زادہ کے ناول ''زہریلا انسان'' کی طرح کتابی صورت میں شائع ضرور ہونا چاہیے کہ قسط قسط کا جزوی ابلاغ ناول کے کلی ابلاغ کا متبادل نہیں ہو سکتا۔

برادرم جمیل عثمان کے افسانے ''رقیب'' کا اختتام چونکا دینے والا ہے کہ شارق جب ایک جان لیوا حادثے کے نتیجے میں جاں بحق ہونے والی اپنی بیوی سونیا اور اپنے رقیب دانیال کی قبریں ساتھ ساتھ بنی دیکھتا ہے تو عجیب سی کیفیت کا شکار ہو کر کہتا ہے کہ سونیا اب قیامت تک اس کے برابر میں سوتی رہے گی۔اس جملے نے افسانے کے آغاز کو انجام تک بڑی ہنرمندی سے منسلک کر دیا ہے۔نبیل احمد کی نعت کا یہ شعر بہت اچھا لگا:

کیسے بچھتی تھی زمیں آپؐ کے نعلین تلے
کیسے جھکتے تھے سرِ راہ شجر، دیکھتا ہوں

نبیل احمد نبیل

غزلوں میں سے کچھ اشعار خوب تھے:

اس کی آنکھوں پہ تھی کجلے کی وہ باریک سی دھار
اور لڑنا تھا نہتّا مجھے تلواروں سے

سعید سادھو

غرض اب اصل سے ممکن نہ عشق سود سے ہے
یہ کاروبار بغیرِ زیاں نہیں چلتا

ولی عالم شاہین

یہ طاقچہ تو میرا طاقچہ نہیں
یہ کس کے طاقچے میں جل رہا ہوں میں

عرفان حمید

جناب اشرف جاوید کی غزل گدائی پڑی ہوئی، خدائی پڑی ہوئی خوب ہے تاہم اس کی ردیف ''پڑی ہوئی'' کسی کسی شعر میں پوری طرح نبھائی نہیں جا سکی۔اُن کا یہ شعر تو حاصلِ غزل ہے:

بے جوہر آئنوں میں کوئی عکس کیا بنے!
مدّت سے جھیل جھیل پہ کائی پڑی ہوئی

اور یہ شعر ہمارے موجودہ سیاسی ماحول میں عدالتی نظام کی دھجیاں اڑا کر مزید صداقت بکھیر رہا ہے:

جس پر بھی ہاتھ رکھ دے وہی پاک صاف ہے
قاضی کی شہر بھر میں دہائی پڑی ہوئی

جناب طلعت منیر کی غزل کے ساتھ ان کے شہر اور ملک کا نام انٹاریو ،کینیڈا لکھا دیکھ کر حیرت ہوئی کہ طلعت منیر تو راولپنڈی میں مقیم ہیں اور ان سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی ہیں،کیا یہ کوئی اور طلعت منیر ہیں؟ان کی غزل دیکھ کر تو لگتا ہے کہ یہ وہی پنڈی والے ہیں۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

برادرم گلزار جاوید صاحب،خلوص بیکراں

اس بار ''چہارسو'' میں اپنے یار خالد حسین صاحب کی دمک دیکھ کر دل باغ باغ ہوا۔خالد حسین ایک ایسی ہستی کا نام ہے جس کے کئی رنگ ہیں، کئی روپ ہیں۔اگر میں یہ کہوں کہ خالد صاحب کی شخصیت بڑی تہہ دار ہے تو یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔خالد صاحب کے ادبی کارناموں کا ذکر تو شمارے میں خوب ڈھنگ سے کیا گیا ہے۔میں ادب سے ہٹ کر اُن کی چند خوبیوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے مجھے اُن کا گرویدہ بنا لیا۔خالد صاحب ایک یار باش آدمی ہیں۔وہ اپنی شیریں گفتاری اور اپنی کومل مسکراہٹ سے دشمن کو بھی اپنا دوست بنا سکتے ہیں۔خالد صاحب نے جو مقام حاصل کیا وہاں تک پہنچنا سب کی بات نہیں ہے مگر اتنی شہرت اور عزت پانے کے باوجود اگر اُنہیں کسی اور افسانہ نگار کی کوئی چیز پسند آتی ہے تو وہ بخل سے کام نہیں لیتے۔کھل کر اُس ادیب کی تعریف کرتے ہیں۔مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب میں بمبئی سے جموں جانے والی ٹرین میں سفر کر رہا تھا تو خالد صاحب کا فون آیا۔اُنہوں نے میرا ایک افسانہ پڑھا تھا جو اُنہیں اتنا پسند آیا کہ وہ مجھے فرش سے اُٹھا کر عرش تک لے گئے۔مجھے جتنی خوشی ہو رہی تھی اُس سے کہیں زیادہ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اتنا بڑا لیکھک مجھ جیسے احقر کی کوئی چیز پڑھ سکتا ہے۔نہ صرف پڑھتا ہے بلکہ اُس کی تعریف بھی کرتا ہے۔یہاں سے ہماری دوستی کی نیو پڑ گئی۔اُس کے بعد وہ جس محفل میں بھی شریک ہوئے میری تعریف کرنا نہ بھولے۔ایسے آدمی کو آپ کیا کہیں گے جو دوسرے ادیبوں کے اُلٹ کام کرتے

ہیں۔وہ وادی کے بیشتر لیکھکوں کو پڑھتے رہتے ہیں اور اگر اُنہیں کسی کا افسانہ پسند آئے تو وہ دل کھول کر اُس کی تعریف ہی نہیں کرتے بلکہ فون کر کے اُسے مبارک باد بھی دیتے ہیں۔ایسے رطب اللسان انسان ہیں وہ۔

پچھلے سال سری نگر میں ایک پنجابی سمیلین ہوا جس میں اُنہیں مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔اُنہوں نے مجھے بھی مدعو کیا۔میں تو حاضرین میں بیٹھا تھا۔جیسے ہی خالد صاحب کو اسٹیج پر بلایا گیا تو سب سے پہلے اُنہوں نے مجھے مدعوئین سے متعارف کرایا۔اُس کے بعد اُنہوں نے میری تعریف میں آسمان زمین کے قلابے ملا دئے۔اتنی تعریف سن کر میں سوچنے لگا کہ یہ شخص کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔آج جب کہ ایک چھوٹا سا ادیب بھی کسی دوسرے قلم کار کی تعریف کرنا کسر شان سمجھتا ہے یہ آدمی دوسروں کو بڑھاوا دینے میں ہمیشہ آگے رہتا ہے ۔

خالد صاحب ایک عظیم فن کار کے ساتھ ہی ایک عظیم انسان بھی ہیں۔میں اگر رات کے وقت بھی اُنہیں فون کر کے کوئی کام کرنے کے لئے کہوں تو وہ سب کچھ چھوڑ کے اُس کام کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ہماری فلم انڈسٹری میں ایک مقولہ عام ہے۔ایکٹر تو ٹھیک ہے آدمی کیسا ہے۔مطلب یہ کہ فن کار چاہے کتنا بھی بڑا ہو، وہ اگر اچھا آدمی ہے تو وہ اس انڈسٹری میں بہت دیر تک ٹکا رہتا ہے۔کئی ایسے اداکار جو کہ بہت اچھے فن کار تھے اس انڈسٹری میں زیادہ دیر تک چل نہیں پائے کیونکہ اُن کا رویہ دوسروں کے تئیں ٹھیک نہیں تھا۔وہ اپنے آپ کو برتر اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو کمتر سمجھتے تھے۔ساتھ ہی اپنے ہم عصر اداکاروں کی مقبولیت اُن سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔اس جلن نے اُنہیں اتنا جلا دیا کہ وہ انڈسٹری سے ہی باہر ہو گئے۔

یہ مقولہ خالد صاحب پر فٹ بیٹھتا ہے۔وہ بڑے فن کار کے ساتھ ایک اچھے انسان بھی ہیں اور دوسروں کی مقبولیت سے اُنہیں جلن نہیں بلکہ خوشی ہوتی ہے۔خالد صاحب چونکہ خالد ہے اس لئے وہ ہمیشہ جاوداں رہیں گے کیونکہ وہ ایک اچھے اور سچے فن کار ہیں۔اُن کی گونج پنجاب سے لے کے کشمیر کی وادیوں میں سنائی دیتی ہے۔اُن کی کہانیاں اپنی مٹی سے جڑی ہوتی ہیں۔وہ عام لوگوں سے کہانی کا پلاٹ اُٹھا لیتے ہیں اور پھر اُسے تراش خراش کر پیش کرتے ہیں۔اُن کے بیشتر افسانے سچے واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والے اُن کی کہانیوں کو پسند کرتے ہیں۔آج اُن کے چاہنے والے ہندوستان میں ہی نہیں پاکستان میں بھی کثرت سے موجود ہیں۔

آپ نے جس سلیقے اور خوبصورتی کے ساتھ اُن کا گوشہ پیش کیا وہ قابل تحسین ہے۔خالد صاحب اس اعزاز کے بہت پہلے حقدار تھے۔خیر دیر آید درست آید۔میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

دیپک کنول (ممبئی)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ اپنی چمک دمک اور اچھے بلکہ بہت اچھے مضامین کے ساتھ ملا۔تمام افسانہ نگاروں اور غزلوں کو نہ پڑھ سکی کہ گھر میں کچھ مصروفیات تھیں۔

سب سے پہلے ذکر کروں گی نوشابہ صدیقی کے ناول چشمِ نم کا۔یہ ناول مجھے اپنی بڑی بہن عابدہ کی وساطت سے ملا تھا کہ وہ اور نوشابہ باجی کالج کے زمانے سے ایک دوسرے کی بہترین دوست رہی ہیں۔یہ ناول پڑھ کر آنکھیں بھر آئی تھیں۔انہوں نے بہت ہی اچھے انداز میں یہ ناول لکھا ہے۔دلچسپ معلومات اور جذبات بلکہ سچے جذبات کے ساتھ لکھا یہ ناول بہت ہی پسند آیا تھا۔

براہِ راست کے ذریعے ہم خالد حسین کی شخصیت تک پہنچ گئے۔ ہندوستان میں رہ کر انہوں نے بہت ترقی کی۔بچپن میں پورے خاندان کو کھو دینا اور پھر ہر طرف کامیابی حاصل کرنا۔کلرک سے لے کر سیکرٹری کے عہدہ تک ترقی۔ ادبی مقام الگ بنایا، اردو پنجابی کے افسانہ نگار، بے شمار کتابوں کے خالق، کئی اعزازات حاصل کیے۔یہ سب معلومات آپ کے انٹرویو کی بدولت حاصل ہوئیں۔دعا گو ہوں کہ خالد حسین صاحب صحت وسلامتی کے ساتھ بہترین تحریروں سے نوازتے رہیں اور یوں ہی ترقی کرتے رہیں۔

میں نے جو افسانے پڑھے ان پر تبصرہ کروں گی۔خالد حسین کی بہترین کہانی ''عشق ملنگی''، جمیل عثمان کی ''نقیب'' ان کی کہانیاں نیویارک میں سننے کو بھی ملتی ہیں۔واقعی شک سے بڑھ کر کوئی بیماری نہیں۔

دیپک کنول ''ایک صدی کا قصہ'' لکھنے میں مشہور ہیں۔اب افسانے بھی اچھے پیش کر رہے ہیں۔''استاد لال سنگھ'' اچھی کہانی ہے۔ارم رحمٰن ہمیشہ مختلف موضوعات لاتی ہیں ان کا افسانہ ''حنوط'' بھی ایک مختلف موضوع تھا اس کو ہم ایک تہذیب سے بھی جوڑ سکتے ہیں جو دفن ہو گئی۔خالد قیوم کے بھی کئی افسانے سننے کو ملے۔اس دفعہ کا افسانہ بھی بہت اچھا ہے۔فیصل عظیم کا ''جمود'' جبیں نازاں کا ''بے یارومددگار فلسطینیوں کے نام'' حساس موضوعات تھے۔

ناول ''خاکِ شفا'' ہمیشہ کی طرح بہت دلچسپ ہے۔عمران صاحب نے کراچی کی ہسٹری خوب بتائی۔ہم خود کراچی کے رہنے والے ہیں اس لیے پڑھ کر بہت اچھا لگا۔کراچی میں مشاعروں کی روداد بڑے ہی دلچسپ انداز میں بیان کر رہے ہیں۔خاص طور سے مصطفیٰ زیدی کی غزل پیش کر کے اور ساتھ میں سامعین کے جملے بہت ہی مزہ آیا پڑھ کر اور پھر بعد میں رئیس امروہوی اور زیدی صاحب کی باتیں۔اگلی قسط کا انتظار ہے۔ناول کو کامیابی سے آگے بڑھانے کی مصنف کو مبارکباد۔

چہارسو سلامت رہے۔آپ کے ہاں تمام لکھنے والے بہت اچھے ہیں مگر کبھی کبھی وقت کی کمی کے باعث خط میں لکھا نہیں جا سکتا۔

رعنا کوثر (نیویارک)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ، خالد حسین نمبر باصرہ نواز ہوا کرم فرمائی کے

''چہارسُو''

لیے برادرم گلزار جاوید صاحب کا صمیمِ قلب سے ممنون ہوں۔ ''چہارسو'' نے ڈسکوری چینل کی طرح اردو ادب کے نایاب اور نادر لال و گوہر کو سعی بسیار کے بعد نہ صرف یہ کہ منظر عام پر لایا ہے بلکہ انہیں ہمیشہ کے لیے دستاویزی شکل میں محفوظ بھی کر دیا ہے تا کہ آئندہ نسل اپنے تہذیبی معماروں کو خراج عقیدت پیش کرتی رہے۔

خالد حسین جیسی باکمال شخصیت کے بارے میں مجھ ناچیز کو بھی علم نہیں تھا لیکن گلزار جاوید صاحب کی توجہ دلانے پر جوں ہی قرأت کا آغاز کیا تو پھر یکے بعد دگرے تخلیقات اور ان پر نوشتہ مضامین اور انٹرویو سب پڑھتا چلا گیا۔ ایسی باکمال شخصیت کہ جن کی ادبی سماجی اور نجی زندگی ہشت پہلو رہی ہے، انھیں ہم جیسے کم مطالعہ قارئین سے روبرو کرا دینا بڑی ہمت، بلند حوصلے اور دور اندیشی کا کام ہے اور آپ ایک طویل عرصے سے اس طرح کے ناقابل فراموش خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

خالد حسین کی اپنی چھوٹی سی تخلیقی کائنات بہت ہی دلکش ہے، وہاں ان کی ہی من مانی چلتی ہے۔ کسی کا اثر انداز ہونا، انہیں گوارا نہیں۔ ان کا اسلوب، ان کے فکری سروکار، ان کے الفاظ کا انتخاب، محاوروں اور استعاروں کا استعمال، ان سب پر مستزاد ان کی ماں بولی پنجابی کے برجستہ استعمال نے ان کے بیانیہ کو منفرد بنا دیا ہے۔

اس کے علاوہ، ان کی اپنی نجی زندگی کی ناہمواریاں، گوناگوں تجربات اور نیرنگی زمانہ کے مشاہدات، بڑے سیاسی بحران اور سماجی اتھل پتھل کے دور سے گزرنا اور اقتصادی نامساعد حالات سے مقابلہ کرنا نیز ان کی اپنی بصیرت، سیاسی شعور اور عصری آگہی اور مختلف مقامی زبانوں کے ادب کے مطالعات نے ان کے اندر کے فنکار کو تراش خراش کر ایک ایسا ہشت پہلو انمول رتن بنا دیا جس کی مثال اردو ادب میں بہت کم ملتی ہے۔

ان کے تخلیقی سرمایہ میں ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' 1981، ''اشتہاروں والی حویلی'' 1991، ''ستی سرکا سورج'' 2011 اور ''جنت گرہن'' 2021 افسانوی مجموعے اور ایک ناول ''لکیر'' شامل ہے۔

اس خصوصی شمارے میں شامل خالد حسین کا افسانہ "عشق ملنگی" اپنے بیانیہ میں اتھاہ کربناکی لیے ہوئے ہے، ''زندہ آنکھوں کی داستان'' سیاسی بحران کا افسانہ ہے جو اپنی انوکھی تکنیک کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ ان کے اندر مذہبی تعصبات سے بالاتر انسانی ہمدردی اور دوستی نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ خالد حسین کو ''یاراں دایار'' کا لقب شاید اسی وجہ سے دیا گیا ہے۔

اس شمارے میں شامل دیگر افسانوی حصے کی بات کی جائے تو جمیل عثمان، آغا گل، خورشید حیات اور دیپک کنول کے افسانے زندگی کے فلسفے کی بڑی گہرائی سے ترجمان ہیں۔ نئی نسل کے تازہ کار افسانہ نگاروں میں رعنا کوثر، قیوم خالد، ارم رحمٰن اور ارشد مُنیم کے افسانے ان کے عصری حسیت کی گواہی دیتے ہیں۔ اس شمارے کے سبھی قلمکاروں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ سلامت رہیں۔

ڈاکٹر پرویز شہریار (نئی دہلی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا شمارہ مارچ، اپریل ۲۰۲۴ء اپنے فن پر مکمل گرفت اور مہارت رکھنے والے کہنہ مشق تخلیق کار اور اردو اور پنجابی ادب میں تحریر کردہ افسانوی مجموعوں کے خالق خالد حسین صاحب سے منسوب کر کے ان کی ادبی خدمات کو قارئین چہارسو کے سامنے پیش کرنے اور متعارف کرنے پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ حسب معمول اُن سے مکالمہ کی نشست معلوماتی اور دلچسپ ہے۔

شمارہ میں دلچسپ افسانے، مضامین اور شاعری بھی شامل کی گئی ہے۔

''مستونگ میں مشتاقیت'' آغا گل صاحب کا مضمون اور آپ بیتی بہت عمدہ اور دلچسپ انداز میں تحریر کیا گیا ہے گو کہ طویل تھا مگر مکمل مضمون پڑھے بغیر چھوڑنا مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ الفاظ اور جملوں کا برمحل استعمال بھی خوب ہے۔ تقریباً ستر سال پہلے آزادی کے بعد شروع میں صوبہ کی حالت پسماندہ تھی جواب کافی بدل چکی ہے۔ اگر بلوچستان کے عوام صحیح نمائندے منتخب کر کے اسمبلیوں میں بھیجیں تو یہ تیز رفتار ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر حالات میں انقلابی تبدیلی کا باعث بن سکتے ہیں۔

''رقیب'' جمیل عثمان کا تحریر کردہ افسانہ سبق آموز، عمدہ اور دلچسپ کاوش ہے۔ ازدواجی تعلقات اگر شک اور حسد کی نذر ہو جائیں تو زندگی پر تباہ کن اثرات مرتب کرتے ہیں اس لیے ممکن حد تک بے جا شک وشبہ کے اظہار سے پرہیز ضروری ہے۔ ''پاگل'' ارشد مُنیم نے ایک عمدہ تحریر رقم کی ہے۔ ہمارے ملک کی لاکھوں مساجد میں جو امام مقرر ہیں بدقسمتی سے اکثریت کا علم سطحی اور نامکمل ہوتا ہے اور مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ مختلف مسالک کے کٹر پیروکار ہوتے ہیں اور اپنے علاوہ دوسرے مسلک کے پیروکاروں کو صحیح مسلمان نہیں گردانتے۔ حالانکہ مذہب اسلام میں کوئی تقسیم نہیں ہے اور ابتدا میں کوئی مسلک نہیں تھا۔ قومی وحدت اور مذہبی عقائد کے حوالہ سے تمام مسلمانوں کو اس طرف سنجیدگی سے توجہ دینی چاہیے۔

''خاکِ شفا'' پیرزادہ آلِ انوار کے تحریر شدہ ناول کی نئی قسط بھی حسب سابق نہایت دلچسپ، معلوماتی اور خوبصورت اور منفرد انداز تحریر کا عمدہ نمونہ ہے جسے شروع کر کے ختم کیے بغیر چھوڑنا مشکل ہوتا ہے اور ختم کرنے کے بعد نئی قسط شائع ہونے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔

شاعری میں فلسطینی شاعر رفعت العریر، ولی عالم شاہین، ڈاکٹر پرویز شہریار، جبیں نازاں، گلفام صدیقی، سبیلہ انعام صدیقی، رؤف خیر، ابنِ صفی، نسیم سحر اور نبیل احمد نبیل کا کلام عمدہ اور متاثر کن ہے۔

آخر میں آپ کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اس قدر اعلیٰ ادبی مواد کو ترتیب دے کر قارئین چہارسو کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کرتے رہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

''چہارسُو''

بہت ہی پیارے بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

ایک مدت سے چہارسو سے دوری کے باعث طبیعت میں خاص طرح کی بے چینی، بے کلی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی مگر ہوئی تا خیر تو کچھ باعثِ تا خیر بھی تھا۔

دراصل میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا کہ امریکہ میں پچاس سال ایک کامیاب زندگی گزارنے کے بعد زندگی کے باقی ماندہ ایّام پاکستان میں گزار دوں گا۔ کسی وجہ سے میرا امریکہ میں دل نہیں لگتا تھا۔ میں جب وہاں بامقصد زندگی گزارتا تھا تو بھی دل نہیں لگتا تھا اور بار بار پاکستان آیا کرتا تھا۔ اب جبکہ میرا کنبہ مکمل سیٹل ہو چکا تھا یعنی میری بیٹی ڈاکٹر حرا حریم عالم اپنے تین بچوں کے ساتھ خوش ہے۔ میرا بیٹا حماد سان عالم سان فرانسسکو میں وکالت کر رہا تھا۔ میں مطمئن ہو کر پاکستان آ گیا۔ حماد مورخہ ۳۔ اکتوبر ۲۰۲۳ء کو اچانک حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے اللہ کو پیارہ ہو گیا۔ ایک قیامت تھی جو مجھ پر ٹوٹ گئی۔

حماد سینتیس سال کا تھا اس کی بیوی بتیس سال کی اور بیٹی صرف آٹھ ماہ کی ہے۔ پہلی فلائٹ لے کر امریکہ گیا۔ سارے راستے ہچکیوں سے روتے گزری۔ میں تو اس شام ایک بڑی خوشگوار محفل سے لطف انداز ہو کر گھر پہنچا تھا۔ آتے ہی یہ اندوہ ناک خبر سنی کہ میرا اکلوتا بیٹا حماد اچانک سوتے ہوئے حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گیا۔۔۔ اللہ کی مرضی۔۔۔

کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد دوسرے دن سہ پہر سان فرانسسکو پہنچا۔ وہاں حماد کا دوست میرا منتظر تھا۔ حماد وہاں نہیں تھا کیونکہ ہسپتال والے اسے لے گئے تھے۔ دوسرے دن جمعہ تھا۔ چونکہ میرا اپنا حلقہ احباب اور حماد امریکہ کے دونوں شہروں یعنی سان فرانسسکو اور لاس اینجلس کی پاکستانی کمیونٹی میں بہت زیادہ جانے پہچانے تھے۔ اس کے علاوہ وکیل ہونے کی حیثیت سے کمیونٹی کے بہت سارے مسائل حل کرنے کے لیے بڑے خلوص اور جانفشانی سے کام کرتے رہے تھے۔ اس لیے اس کے انتقال کی خبر پورے کیلی فورنیا کے اندر پھیل گئی۔ دوسرے دن اس کی تدفین تھی، اس لیے دور دراز حتی کہ شکاگو، کینیڈا، ناتھ کیرولائنا، ہیوسٹن اور نیویارک سے لوگ جس قدر بھی کوشش کر سکتے تھے، پہلی فلائٹ سے سان فرانسسکو پہنچے۔ دوسرے دن سان فرانسسکو کے اسلامی سینٹر میں اس کی نماز جنازہ ہوئی۔ جس میں تقریباً ایک ہزار لوگ شریک ہوئے۔ اس کے ننھیال کے کچھ لوگ کینیڈا سے لاس اینجلس پہنچے۔ یہ چیز میرے لیے بیان سے باہر ہے کہ میں اپنے آپ کو کس طرح سنبھال رہا تھا مگر مجھ سے زیادہ اس کی والدہ کا برا حال تھا۔ خوش قسمتی سے ان کی ایک بہن کینیڈا سے اور دوسری بہن بھی بارہ گھنٹے کے اندر اندر سان فرانسسکو پہنچ گئیں اور انہوں نے اپنی بہن کو بانہوں میں لے کر انہیں تسلی دی۔ خاندان میں کئی لوگ اور بھی تھے جن میں میرا ڈاکٹر داماد بھی شامل تھا۔ انہوں نے سکون کی ادویات دیں جن سے وہ کئی گھنٹے سوتی رہیں جن سے ان کی حالت بہتر ہوئی۔

ہم چاہتے تو تھے کہ حماد کی تدفین لاس اینجلس ہی میں ہو اور ہم اس کے جسد خاکی کو لاس اینجلس لے جائیں تا کہ ہم اور ہمارے احباب وقتاً فوقتاً فاتحہ خوانی کر سکیں مگر اس کی بیوہ جو خود صدمے کا شکار تھیں اس نے ہم سے درخواست کی حماد کی تدفین سان فرانسسکو ہی میں ہو۔ پھر امریکی قانون کے تحت اس کی بیوہ کو اس کا حق تھا۔ اس لیے ان کی خواہش کے مطابق ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اُس کی تدفین سان فرانسسکو ہی میں ہوئی۔

بعد ازاں ہم لوگ لاس اینجلس آ گئے۔ اس کے بعد پہلی ہی اتوار کو لاس اینجلس کے اسلامک سینٹر میں حماد کے سلسلے میں یادگاری تقریب منعقد ہوئی جس میں ہمارے احباب لاس اینجلس کی پاکستان کمیونٹی اور اس کے دوست شامل تھے۔ اس کے لیے قرآن خوانی کی گئی۔ اجتماعی فاتحہ کا اہتمام ہوا اور بہت سے لوگوں نے اس کی مختصر سی زندگی پر روشنی ڈالی۔ میرے قریبی دوست تابش خانزادہ اپنی بیگم کے ساتھ چھ سو کلومیٹر کا سفر اپنی کار میں طے کر کے حماد کی تعزیتی تقریبات میں شریک ہوئے۔ نہ صرف یہ بلکہ میرے سابقہ طالب علم جواب امریکہ میں سیٹل ہیں انہوں نے میرے غم میں شریک ہونے کے لیے میرے ساتھ ایک شام منائی۔ اس کے علاوہ میرے وہ تمام سابقہ طالب علم جو آغا خان یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں مجھے تعزیتی پیغام بھیجے۔ اس کے علاوہ چہارسو اور الحمرا کے شماروں کے ذریعے بہت سے قارئین نے فرداً فرداً تعزیتی پیغامات بھیجے۔ میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میں درخواست گزار ہوں کہ میرے بیٹے حماد کی مغفرت کے لیے دعائیں کریں۔

فیروز عالم (کیلی فورنیا)

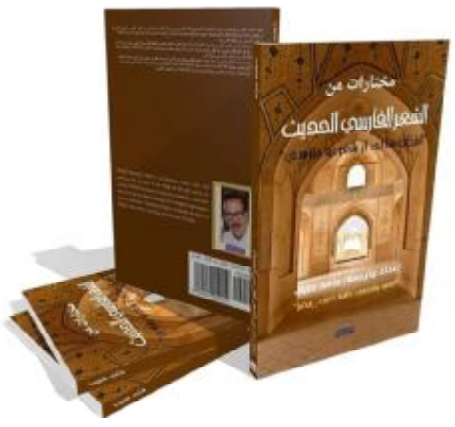

مصر کے معروف ادیب، نقاد، محقق اور مترجم حامد حبیب کی عربی زبان میں تازہ ترین کتاب حال ہی میں مصر سے شائع ہوئی ہے جس میں حامد حبیب صاحب نے دنیا بھر کے تقریباً تیس فارسی گو شعراء کا کلام عربی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

--- ابتدائی پنجابی فلمی گیت ---

پہلی پنجابی فلم1932 میں لاہور کے سنیما مالک حکیم رام پرشاد نے پلے آرٹ فوٹوٹون کے بینر تلے، "حور پنجاب" کے نام سے بنانا شروع کی۔بعد میں اس کا نام "ہیر رانجھا" کردیا گیا . ہیرانوری بیگم بنی اور رانجھا رفیق غزنوی،(دونوں نے بعد میں شادی کرلی تھی) کیدوایم اسماعیل بنے جن سے یہ کردار چپک گیا، وہ بعد میں بھی کیدو بنتے رہے۔فلم کے ہدایت کار اے آر کاردار تھے۔فلم لاہور کے امپیریل تھیٹر میں لگی(جس کا نام بعد میں ریجنٹ سنیما رکھ دیا گیا تھا) تیکنیکی ناتجربہ کاری کی وجہ سے فلم کی فوٹوگرافی اور ساؤنڈ دونوں ناقص رہیں جس کی وجہ سے فلم فلاپ ہوئی۔ویسے بھی یہ پنجابی اردو ملی جلی تھی۔بہر حال پنجابی فلموں کا آغاز ہوگیا۔1932 سے 1947 تک 37 پنجابی فلمیں بنیں۔پنجابی فلم سازی کے مراکز کلکتہ، لاہور اور بمبئی رہے۔پاکستان میں فلموں کا کوئی آرکائیو یا لائبریری نہیں ہے جہاں یہ فلمیں، ان کے گانے، بک لیٹ، پوسٹر محفوظ ہوں۔ دلچسپی رکھنے والے لوگوں نے ایسی کچھ چیزیں محفوظ کی ہیں لیکن مکمل ریکارڈ دستیاب نہیں۔ ایسی صورت حال میں مشہور فلمی ریسرچر فیاض احمد اشعر نے اس مشکل ٹاسک پر کام شروع کیا۔ ان کی دُھن اور دوسروں سے تعاون کو سب مانتے ہیں اس لیے اکثر کلیکٹرز نے ان سے بھی تعاون کیا۔اس طرح وہ ان فلموں کے بیشتر گانے جمع کرنے میں کامیاب رہے اور وہ سب اس کتاب "ابتدائی پنجابی فلمی گیت" میں پیش کردیئے۔ایک ایک گیت کی تلاش کیلئے انہیں کہاں کہاں بھٹکنا اور خجل خوار ہونا پڑا، اس کا اندازہ کوئی ریسرچر ہی لگا سکتا ہے۔گیت ہی نہیں، انہوں نے ہر فلم بنانے والی کمپنی، ہدایت کار، موسیقار، اداکاروں اور گلوکاروں کے نام بھی دے دیئے ہیں۔اس طرح یہ فلمی تاریخ بھی ہے اور اس کی ادبی اہمیت بھی ہے۔یہ جس قدر محنت طلب کام تھا اور ریسرچ کا نتیجہ جتنا وقیع ہے، اس سے آدھے کام پر بھی ایم فل بلکہ پی ایچ ڈی کی ڈگریاں مل جاتی ہیں۔(یہ الگ بات ہے کہ اب بھاری فیسیں بھی دینا پڑتی ہیں)

1932 سے 1947 کی پنجابی فلمیں:

1932 ہیر رانجھا (لاہور)،1932 شیلا عرف پنڈ دی کڑی (کلکتہ)،1935 مرزا صاحباں عرف عشق پنجاب (کلکتہ)،1938 ہیر سیال (کلکتہ)، 1939 مرزا صاحباں (بمبئی)، سوہنی کمہارن (کلکتہ)، سسی پنوں (کلکتہ)، سوہنی مہینوال (لاہور)، بھگت سورداس (کلکتہ)، پورن بھگت (کلکتہ)، گل بکاؤلی (لاہور)،1940 یملا جٹ (لاہور)، متوالی میراں (کلکتہ)، لیلےٰ مجنوں (کلکتہ)، دلا بھٹی (لاہور)، جگا ڈاکو (کلکتہ)، علی بابا (بمبئی)، 1941 چترا بکاؤلی (لاہور)، چنبے دی کلی (کلکتہ)، کڑمائی (بمبئی)، مبارک (کلکتہ)، میرا پنجاب (کلکتہ)، میرا ماہی (لاہور)، چودھری (لاہور)، سہتی مراد (لاہور)، پٹواری (لاہور)، پردیسی ڈھولا (کلکتہ)،1942 منگتی (لاہور)، راوی پار (لاہور)، گوانڈھی (لاہور)، پٹولا (کلکتہ)،1943 اک مسافر (لاہور)،1944 گل بلوچ (لاہور)، کوئل (لاہور)،1945 نکھٹو (لاہور)،1946 کملی (لاہور)،1947 وساکھی۔۔۔لاہور میں بننا شروع ہوئی لیکن فسادات کے باعث بمبئی منتقل کردی گئی اور1950 میں ریلیز ہوسکی۔دو اور فلمیں کالیاں راتاں اور ماہیا بننے کا بھی اعلان ہوا۔کچھ کام ہوا، گیت بھی ریکارڈ ہوئے لیکن فلمیں بن نہ سکیں۔ماہیا کی خاص بات یہ تھی کی اس کی موسیقی نثار بزمی نے دی تھی۔لیکن یہ سامنے نہ آسکی۔اس کے بعد انہوں نے کسی پنجابی فلم کا میوزک نہیں دیا۔آپ کو حیرت ہوگی کہ اس دور کے فلمی (اور بعض غیر فلمی) گیتوں کے مقبول مکھڑوں پر بعد کے شاعروں بالخصوص خواجہ پرویز نے خوب ہاتھ صاف کیا۔مثلاً "یہ مکھڑے:

ماہی میرا غصے غصے/ پلا مار کے بجھا گئی دیوا/ چناں کتھے گزاری اے رات وے/ کچی ٹٹ گئی جنہاں دی یاری/ بتی بال کے بنیرے آتے رکھنی آں/ ڈھول جانی ساڈی گلی آویں/ بھاویں جانے تے بھاویں نہ جانے/ چھڈ میری وینی نی مروڑ/ لما لما باجرے دا سٹا

کتاب میں ان فلموں کے پوسٹرز، اداکاروں، گلوکاروں کی کئی نادر اور یادگار تصاویر بھی شامل ہیں۔

قیمت800 روپے پاکستانی

مصنف کا فون نمبر03004117688

--- اسلم ملک

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
رومی کون —؟
عبداللہ جاوید
من خود رانمی دانم
عبداللہ جاوید
ڈاکٹر ناہید اختر
نئی فیکٹری
ہندی سینما کے معمار
احوال و آثار